

ایک لیڈی انسپکٹر کی رُوداد جس کا واسطہ ایک عیار قاتل سے پڑ گیا تھا!

خط عشق

حنا کامران



خطِ عشق

سیاہ رات، موسلا دھار بارش، گرجتے ہوئے بادل اور چمکتی ہوئی بجلیاں۔
اس نے بیدلی سے جمائی کوروکا، منہ پر رگڑ کر ہاتھ پھیرا اور گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی جو
رات کے آٹھ بجنے کا پیغام دے رہی تھیں۔ سردیوں کی راتیں تھیں۔ سورج ڈھلتے ہی سیاہی پر
مار کر پھیل جاتی تھی اور آج کی سیاہی تو کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ آج کی سیاہی میں جو راز دفن تھا
اس نے اس کی زندگی کو یکسر طور پر بدل کر رکھ دینا تھا۔ مکمل طور پر۔۔

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں یکدم اس کا دل چاہا وہ سو جائے، کتنے ہی وقت
سے وہ بھرپور نیند لینا چاہتی تھی کتنے ہی ماہ و سالوں سے اس کی یہ خواہش دم توڑے جا رہی
تھی۔ اب تو جیسے بدن کو عادت ہو گئی تھی۔ اب تو جیسے خود سے ہی بغاوت ہو گئی تھی۔ اس نے
آہستہ سے اپنی پلکوں کو بند کر کے کھولا، بھار عروج پر تھا۔ اس کی آنکھوں کا گہرا پن رات سے
بہت گہرا اور پراسرار تھا لیکن کوئی اور بھی تھا جو اس سے زیادہ گہرا اور پراسرار تھا۔ کوئی تھا جو

برستی بارش میں کھڑا تھا، کوئی تھا جس کا سیاہ چوغہ رات کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ کوئی تھا جس کے وجود میں سکوت تھا بہت تاریک سکوت۔

سونے کی تیاری کرنے کی غرض سے، ناکام عمل کو کامیاب بنانے کیلئے وہ دانتوں میں برش کر رہی تھی جب اس کا فون بادلوں کی گرج کے درمیان ہی چنگھاڑا اٹھا۔ چنگھاڑا اس قدر تیز تھی کہ معلوم ہوتا تھا دو ایک بادل تو ٹوٹ کر گرے ہیں۔ ضرور کوئی کمزور دل کا اس وقت کمرل میں دبکا کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوگا۔ یا پھر کسی کے آنسو تو نکل گئے ہوں گے۔ آواز پر اس نے گردن کو متحرک کیا۔ نظر کمرے میں موجود بیڈ کا طواف کرنے کو بیقرار تھی جس پر اس کا فون پڑا مسلسل اسے آوازیں دے رہا تھا۔ مگر ایسا ممکن نہ ہوا کیونکہ بند دروازہ اپنے آہنی وجود کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کلی کی، ہاتھ ٹاول سے پونچھے اور پھر دروازہ داکر کے باہر آ گئی۔ اسی دوران ایک بار پھر سے بادل ٹوٹے تھے۔ بارش کی تیز آواز اور ہوا کی سرسراہٹ بند کھڑکیوں کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ وہ ان آوازوں کو یکسر نظر انداز کرتی بیڈ پر پڑے فون کے پاس آئی، نمبر دیکھا اور گہری سرد سانس لبوں سے خارج کر دی۔

”شیزل، ابھی اور اسی وقت ہل اسٹیشن پہنچو۔“ کال رسیو کرتے ہی آئی جی کی آواز قدرتی شور کے درمیان ابھری تھی۔ اسے فوری طور پر بلایا گیا تھا یعنی ضرور کوئی سنجیدہ مسئلہ تھا۔ اس نے آنکھیں میچ کر گردن کو دائیں بائیں جنبش دی جیسے تھکن کو دور کرنے کی سعی کر رہی ہو۔ ایک تو موسم بگڑا ہوا اوپر سے آرڈر عجلت بھرا۔ گہرا سانس۔۔۔ تھکان بھرا۔۔۔ بے بس سا۔

”راجر باس۔“ تھکی ہوئی آواز، ترسی ہوئی نیند، بیچاری آنکھیں۔

فون کو بیڈ پر دوبارہ پھینک کر وہ تیاری میں مصروف ہو گئی۔ اگلے دس منٹ میں اس کی کار گیٹ کو پار کر کے دور جا رہی تھی۔ موسلا دھار بارش میں سیاہ چوغے میں کوئی کھڑا اس کی کار کو

جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں خنجر تھا جس کی نوک سے ٹپکتا تازہ سرخ خون آسمان سے گرتے پانی میں مدغم ہو رہا تھا بالکل ایسے جیسے ضمیر گناہ کے لطف میں مٹ کر رہ جاتا ہے، ہاں بالکل ایسے ہی۔

تاریک رات میں تاریک ترین گناہ ہو چکا تھا اتنا تاریک کہ اب شاید ہی وہ اس سے نکل پائے، وہ جس میں جینے کی خواہش تھی پر جینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جو اپنی کھلی آنکھوں سے کچھ کے مردہ چہرے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو۔۔۔۔۔



”سنو آج سات بجے مل رہے ہیں نا؟“ اشتیاق سے بھرپور سوال۔

”بالکل، میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔“ سرگوشی نما جواب۔

”آج ہم خوب مزے کریں گے، میں نے تمہارے لیے روم بھی بک کروایا ہے۔“ زندگی سی چمکتی آنکھوں کی جوت اس وقت پھکی پڑی جس وقت سوال آیا تھا مگرفون میں سے نہیں اس کے عقب میں سے۔

”میرے لیے نہیں کروایا۔۔۔ روم بک؟“ سیاہ چونغے والے نے اس وقت ”روم بک“ کہا تھا جب وہ نو عمر لڑکا مڑا تھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں فون تھا جس پر کال چل رہی تھی جبکہ سیاہ چونغے والے کے ہاتھ میں شیونگ مشین تھی جسے اس نے آن کیا ہوا تھا۔ اس مشین کی مخصوص آواز نے شور سا برپا کیا ہوا تھا۔ موت کا شور۔ بھیا نک اور ناقابل برداشت۔ نو عمر لڑکا گھبرا گیا۔

”کک، کون ہو تم؟“ سیاہ سوٹ والا صوفے کے ہتھے پر ٹکا تھا۔ ہڈ سے لے کر شانے تک، ہاتھ سے لے کر پاؤں تک سب بھیگے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ بارش میں پیدل چل کر آیا ہے تبھی سرتا پانم ہے۔

”سوال پر سوال چچ پسند نہیں آیا۔“ وہ کھڑا ہوا۔

نوعمر لڑکا ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگ گیا تھا۔ کچھ غلط ہے، دماغ نے الارم دے دیا۔ کچھ عجیب ہے یقین ہو گیا۔ وہ اس وقت گھر میں اکیلا تھا۔ سب گھر والے برتھ ڈے پارٹی میں گئے ہوئے تھے بس وہ نہیں گیا تھا کیونکہ اسے اپنی گرل فرینڈ سے جو ملنا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ چلا جاتا کتنا ہی اچھا ہوتا نا۔

”میں نے پوچھا کون ہو تم اور اندر کیسے آئے۔ گارڈ گارڈ۔“ وہ حلق کے بل چلایا مگر اس کی چلاہٹ حلق میں ہی رہ گئی کیونکہ سیاہ چونغے والا جس انداز میں اس کی درود یوار کو گھور رہا تھا ان کے مفہوم کو سمجھ کر اس کا چپ ہو جانا بنتا تھا۔ پتلیوں کی حرکت پر اس لڑکے کی آواز تھمی۔ وائس پروف والٹر۔ آنکھوں کا پیغام۔

”کیا کوئی سن سکتا ہے؟“ سیاہ چونغے والے نے ایک کان کے اوپر ہاتھ رکھا پھر لبوں کو گول کر کے چچ چچ کہا۔“ افسوس کوئی نہیں۔“ مذاق اڑاتا انداز، تمسخر اڑاتا لہجہ۔

”دیکھو تم جانتے نہیں ہو میرا باپ کتنا بڑا بزنس مین ہے۔“

سیاہ بوٹ میں قید پاؤں کا ایک قدم اور آگے بڑھا، جیب میں سے اب کی بار ایک تیز دھار چھری نکلی تھی۔ چمکتی ہوئی چاندی رنگ کی نئی نکور چھری۔ جس کی نوک ایل ای ڈی لائٹس کے سبب دمک رہی تھی۔ سیاہ دستانے میں قید انگلی نے جو نہی نوک کو چھوا اس میں شگاف پڑ گیا۔ سیاہ شگاف شدہ لیدر چھری کی دھار بتانے کیلئے کافی تھی۔ ڈیمو دیا جا چکا تھا۔ اشارہ سمجھا دیا جا چکا تھا۔ لڑکے کے ہاتھ پاؤں کا غنے لگے لیکن وہ بولنے سے باز نہیں آیا ہونہ لفظ، لفظوں کی ہی تو بات ہوتی ہے لفظوں سے ہی تو مات ہوتی ہے۔ لفظوں سے ہی دل آزاری ہوتی ہے اور لفظوں سے ہی دل داری۔ لفظ ہی مارتے ہیں اور لفظ ہی سنبھالتے ہیں۔ لفظ ہی جان دینے کا

موجب بنتے ہیں اور لفظ ہی جان لے لیتے ہیں۔

لفظ، زہر کی طرح کڑوے شہد کی طرح میٹھے۔۔۔ کچھ نمکین کچھ پھیکے۔۔۔ کچھ الجھے کچھ سلجھے۔۔۔ لفظ، راحت بھی چاہت بھی، آس بھی یاس بھی۔۔۔ نفرت بھی عداوت بھی۔۔۔ لفظ فقط لفظ۔

”تم نے اگر کچھ بھی کرنے کی کوشش کی تو تمہارا پورا خاندان تباہ کر دیں گے وہ۔“ دو قدموں کی دوری پر وہ لڑکا تھا۔ دو قدم پاٹے ساتھ میں پوری قوت کے ساتھ گردن پر ضرب لگائی تھی۔ جارحیت، اشتعال، غصہ، تنفر کیا کچھ نہیں تھا اس وار میں، کیا کچھ نہیں تھا اس انتقام میں۔ ایک اور بادل ٹوٹا مگر اس بار اس میں سے خون رسا تھا۔ تازہ، سرخ، چمکیلا خون۔ خون کی سرخی آنکھوں میں اتر آئی تھی برستی بارش کسی کی موت لائی تھی، بھیا نک موت۔



یونیفارم پہننے کا وقت نہیں تھا اس لیے وہ کپڑوں میں ہی ہل اسٹیشن پہنچ گئی تھی جہاں ایک درخت تلے نو عمر لڑکے کی لاش پڑی تھی۔ گردن کو بری طرح کاٹا گیا تھا تبھی خون کے ساتھ ہڈی اور کٹی ہوئی رگیں بھی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ لاش کے گرد کوئی خون نہیں تھا۔ وہ بس کیچڑ میں موٹے ٹہنے سے ٹیک لگائے بٹھائی گئی تھی۔ ہاتھ اکڑے ہوئے پہلو میں گرے تھے۔ بدن ابھی تھوڑا گرم تھا یعنی موت کو زیادہ لمبا عرصہ نہیں گزرا۔ ایک سرسری نظر اس لڑکے پر ڈال کر وہ مڑی۔ اس کی ٹخنوں کو چھوتی سادی آسمانی رنگ کی قمیض کے دامن اور کھلے ہم رنگ پلازوپر کیچڑ کے پختہ داغ لگ گئے تھے جو دھلنے سے بھی نہیں اترنے تھے۔ ان داغوں کی تو خیر تھی مگر اب جو داغ اس کی زندگی میں لگنے والا تھا وہ پوری زندگی نہیں اترے گا شاید کبھی بھی نہیں۔ اس چیز کا اسے ادراک نہیں تھا۔ اس چیز کا اسے ادراک ہو جاتا تو اچھا تھا۔

”تمہارے علاقے میں قتل ہوا ہے اور قتل بھی اثر رسوخ والوں کے ہاں ہوا ہے۔“ وہ جونہی وہاں پہنچی چند سپاہیوں نے اسے سلوٹ مار کر آگے بڑھنے کی جگہ دی تھی۔ چھوٹی عمر کے لڑکے کو حیرت بھری لا پرواہی سے دیکھ کر وہ آئی جی کو سننے لگی جو مزید کہہ رہے تھے۔

”بال تمہاری کورٹ میں آرہی ہے۔“ ایک سفید کاغذ تھا جو انہوں نے چپکے سے اس کی جانب بڑھایا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے لگاتار بارشیں ہو رہی تھیں۔ اب بھی بارش کا راج چہار سو تھا۔ وہ سب سیاہ چھتریوں تلے کھڑے تھے۔ لڑکے کی لاش درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ درخت بہت گھنا تھا پھر بھی اس کے پتوں کے درمیان میں سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔ جس کے سبب کچی زمین کیچڑ میں بدل گئی تھی۔ اسی وجہ سے پھسلن بھی ہو گئی تھی۔ شیزل نے آئی جی کے ہاتھ سے کاغذ پکڑتے ہوئے کہا۔

”میں شہر میں نہیں تھی سر، قتل یقیناً میرے پیچھے ہوا ہے۔“ کہنے کے دوران ہی وہ کاغذ کھول رہی تھی۔ وہ جادوئی کاغذ جس کے کھلتے ہی اس کی زندگی نے بدل جانا تھا۔ آندھیوں نے آنا تھا۔ طوفانوں نے سمانا تھا۔ وقت نے بس یہیں تھم جانا تھا۔ سفید بے داغ کاغذ جس کے اوپر سیاہ حروف رات کی طرح جگمگا رہے تھے۔ جیسے سانپ وہاں لہرا رہے تھے۔

”اس حسینہ کے نام جو دل پر راج کرتی ہے۔“ اس سطر پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ بھنویں آپس میں مل گئیں۔ آنکھیں چندھیائے اس نے ایک بار پھر اس لائن کو پڑھا۔ ایک بار دوبار بار بار۔

”یہ میرے لیے نہیں لکھا جاسکتا، ناٹ پاسیبل۔“ شانے اچکاتے ہوئے اس کے انداز میں یقین کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آئی جی مسکرائے۔ انہیں جانے کی جلدی تھی۔ وی آئی پیز کا کیس تھا تبھی وہ یہاں تھے کوئی عام طبقے کا ہوتا تو یہ تو کیا کانشیبل بھی پھٹکنے سے کتراتا۔ جو کچھ

ہوتا صبح ہی ہوتا۔

”اس کیس کو میں تمہیں سونپ رہا ہوں کیونکہ یہ واردات تمہارے علاقے میں ہوئی ہے دوسرا کرائم ونگ سے میں نے قیس الہی کورپورٹ کرنے کو کہا ہے۔ کل سے وہ تمہاری ٹیم کو جوائن کرے گا۔“ اس نام پر وہ ڈنگ لگنے والے انداز میں دہکتی تھی۔ دل نے غوطہ لگایا اور فشار خون آپ ہی آپ بڑھ گیا۔ درخت کے سبز پتوں میں سے تانہوز پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ عقب میں ہوتی بارش اور سامنے رکھی لاش، بھرپور نیند کی خواہش اور تھکن سے چور بدن سب کچھ بھلا کر یہاں تک کہ سامنے کون ہے وہ یہ بھی بھلا کر احتجاج کو میدان میں کود پڑی۔ اس کے سر پر چھتری تانے کھڑا کانٹنیشنل اس کی جرات پر عیش عیش کراٹھاتا تھا۔

”لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی ایک کیس سولو کر کے آرہی ہوں نا، میری ٹیم کافی چست ہے اور وہ سب ہینڈل کر سکتی ہے۔ آپ کسی باہروالے کو کیوں بلا رہے ہیں۔“ آئی جی حیدر علی نے اپنی ابرو کو اچکایا پھر ایک قدم نزدیک آ کر دھیمی آنچ جیسے لہجے میں گویا ہوئے۔ ”وہ باہروالہ نہیں ہے۔“ باور کروایا گیا، کیا خوب کروایا گیا۔ ”میں آرڈر دے چکا ہوں اس پر عمل کرو ہم۔“

ٹینزل نے لب بھینچ کر دانت پیسے تھے۔ مڑ کر لاش کو دیکھا دل تو چاہا تین چار چھریاں وہ بھی اسے مار دے مگر دل کی حسرت دل میں ہی رہی، ایک بار پھر اس کی حسرت نے دم توڑا تھا۔ ایک بار پھر خواہشات کی تکمیل نے منہ موڑا تھا۔ ضبط سے سر کو ہلا کر وہ آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔ قتل ابھی کچھ دیر قبل ہوا تھا پورے شہر میں ہائی الرٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ ناکہ بندی، چھان بین، سختی بے انتہا تھی کیوں؟ کیونکہ قتل وی آئی پیز کے گھر ہوا تھا۔ درخت کے نیچے پڑی لاش، پولیس کی نفری اور سیاہ چھتری تلے کھڑی وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ کوئی

اسے نظروں کے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ کھیل اس کیلئے تھا تو نظر بھی تو اسی پر رکھی جانی چاہیے تھی۔ چاہیے تھی؟ ہے نا!

☆.....☆.....☆

”تمہارا نام کیا ہے؟“

نم آلود رات کی صبح بھی بھیگی بھیگی سی تھی۔ ہر شے پر پانی کی پرت چڑھی تھی۔ ہر چیز نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ سردیوں کی بارش تھی تبھی ٹھنڈ کا راج چہار سو نظر آ رہا تھا۔ پتھروں سے لے کر انسان تک کو ٹھنڈ نے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ کمال تو یہ تھا غلامی بخوشی قبول کی گئی تھی تبھی ہر چہرے پر مسکان تھی سوائے اس کے، تبھی ہر شے شاداب تھی سوائے اس کے، تبھی سب مزے میں تھے سوائے اس کے، تبھی سب کی زندگی حسین تھی سوائے اس کے۔ سوال دوبارہ آیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ لگژری اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں موجود کرسٹل کی نازک میز پر رکھے رسیور میں سے مردانہ آواز ابھر رہی تھی مشفق مردانہ آواز، وہ اپنے ہاتھوں کو آپس میں بھینچے بیٹھی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشہ خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ لب کپکپا رہے تھے اور سانس غیر متوازن تھی۔

”ر، رتبہ۔“ گھبراتے ہوئے، ڈرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اب اس کے پورے وجود میں لرزش طاری ہو چکی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں آس پاس دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں؟ کوئی آ تو نہیں گیا؟ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس کا خوف ہیجانی تھا اس کی تکلیف جانی پہچانی۔

”شاباش، سو رتبہ کیا اب ہم بات کر سکتے ہیں؟ کیا اب آپ ایزی ہو؟“ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی جیسے کہ رسیور میں کیمرہ فکس ہو اور وہ اسے دیکھ رہا ہو اور ایسا ہی تو تھا رسیور میں تو نہیں

لیکن اس گھر کے کونے کونے میں کیمرے فکس تھے۔ وہ دونوں اسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ دونوں اسے دیکھ رہے تھے۔

”مجھے آرام کی ضرورت ہے۔“ اس نے روبوٹی انداز میں کہا تھا ساتھ میں دوبارہ مین ڈور کو دیکھا جولا کڈ تھا۔ اس پر بھی کیمرہ تھا۔ وہ اس اینگل سے بھی دیکھی جاسکتی تھی۔

”آپ کو آرام کی نہیں باتوں کی ضرورت ہے۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔ مجھے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے۔ کیا آپ سن رہی ہیں؟“ کنٹرول روم میں بیٹھا وہ انسان اسکرین پر نظر آتی لڑکی پر نگاہ گاڑے کہہ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا انسان خاموش تھا خطرناک حد تک خاموش۔

”مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے آرام کی۔“ اس نے اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کاٹا۔

”ضرورت ہے۔“ کھوئی کھوئی سی آواز، سہا سہا سا انداز۔

”لیکن یہی بات آپ نے کل بھی کی تھی۔ میں آپ سے جب تک بات نہیں کروں گا تب تک کیسے۔“ اس کو قطع کیا گیا زور دے کر کیا گیا۔

”مجھے۔۔۔ مجھے آرام کرنا ہے۔ میں۔۔۔ میں۔“ وہ اینارمل ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے اینارمل ہو رہی تھی قبل اس کے وہ چیختی دھاڑتی خاموش بیٹھے انسان نے کال منقطع کر کے خود کو وہاں سے اٹھایا تھا۔ کیمرے میں نظر آتی لڑکی کال کے کٹ جانے کی وجہ سے سانس ہموار کرتی نارمل ہوئی تھی۔ اس کے سینے سے خوف زائل ہوا تھا۔ بدن کی سنسناہٹ کم ہوئی۔ وہ وہیں صوفے پر کروٹ کے بل خود میں سمٹ کر رہ گئی۔ جبکہ دوسری جانب سفید کوٹ والا دانت پیس کراٹھنے والے کے پیچھے گیا تھا۔ شوز کی آواز پیدا کر کے وہ ٹیرس پر کھڑے شخص کے پیچھے آیا اور آتے ساتھ ہی دھاڑا اٹھا۔

”یہ سب کیا تھا کیوں سیشن پورا ہونے نہیں دیتا، میں ایسے کیسے ٹھیک کروں گا اسے۔“

بھاری تحمل بھری آواز سرد ہوا کے ساتھ لہراتی ہوئی عقب میں کھڑے انسان کی سماعت سے ٹکرائی۔

”اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا ہے۔“ توقف۔ ”زندگی ہے میری۔“
”تو زندگی کو زندگی کی جانب لانے دے نایار، ایسے وہ نہیں سروائیو کر پائے گی۔“ وہ جھٹکے سے مڑا، خون سے پر آنکھوں اور زہر میں بجھے لہجے کے ساتھ دھیمے سے پھنکارا۔
”تو کیا کروں تڑپتا ہوا دیکھتا رہوں۔ اس کی چیخیں میری رگیں کاٹتی ہیں۔ دم گھٹتا ہے میرا۔“ اس نے تیز تیز سر ہلایا چہرے کی تلملاہٹ، آنکھوں میں اترا جنوں کا لہو اس کی شخصیت میں اینارل ساٹچ دے رہا تھا۔ اس کا دوست گھبرایا نہیں کہ وہ اس کے ہر روپ کو جانتا تھا ہر انداز میں اسے پہچانتا تھا۔

”فرار نتیجہ نہیں ہے۔ تم اس سب میں اپنی تکلیف، اپنا مفاد، اپنا کمفرٹ دیکھ رہے ہو۔ اس کا درد تم نہیں دیکھ سکتے، اس کی چیخیں تم نہیں سن سکتے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ وہ کس جرم کی سزا سہہ رہی ہے۔ فارگاڈ سیک یا ر محبت کے پیانے کو تھوڑا کم کرو، دل کو مضبوط کرو اور تھوڑا سختی سے پیش آؤ، تمہاری سختی اس کی آزادی کی وجہ بن سکتی ہے۔“ وہ حتی المقدور اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جانتا تھا سا منے والے کی عقل میں کچھ نہیں گھسنا بالکل ویسے جیسے پچھلے کچھ سالوں سے نہیں گھسنا تھا۔

”تو تمہیں کیا لگتا ہے میں اسے آزاد نہیں دیکھنا چاہتا خوش نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کی خوشی اس کی مسکان میری زندگی کی اولین ترجیح ہے مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ روتی ہے تو۔“

لمحے میں اس کی آواز بھرائی تھی۔ لمحے میں ہی وہ رخ موڑ گیا تھا۔ کیا ہی اس ہوا میں

سردا ہٹ ہوگی جو اس کے لہجے میں تھی کیا ہی سب بھیگا ہوگا جو اس کا لہجہ بھیگا تھا۔

”لیکن نہیں اب وہ نہیں روئے گی۔ وہ نہیں تڑپے گی اب تڑپنے کی باری کسی اور کی ہے اب کوئی اور چلائے گا اتنا زیادہ کہ میرے سینے میں لگی آگ اس کی آواز سے بجھے گی۔ اس کی مسکراہٹ میرے ہر وار پر سمٹے گی۔“

اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کی بند آنکھوں میں جتنا اندھیرا تھا اتنا ہی شینزل کی میچی ہوئی آنکھوں میں بھی تھا۔ وہ ڈی ایس پی کے سامنے بیٹھی تھی اور پچھلے دس منٹ سے ان سے بحث میں مبتلا تھی۔

”قیس کی کیا ضرورت ہے اس کیس میں، آپ جانتی ہیں اس کی طبیعت کو انتہائی قسم کا غیر سنجیدہ اور فلرٹی انسان ہے وہ۔ اس کیس کو بنانے کی بجائے بگاڑ دے گا پلیز کسی طرح اس کے آرڈرز کو کینسل کروادیں۔“ لکڑی کی میز کے پیچھے بھاری جٹے والی نے اپنا ماتھا پکڑا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی گول مٹول سے تھے رنگ قدرے سائوا لاکھا اور نقوش تھوڑے تیکھے۔

”شینزل ہر انسان کی ایک فطرت ہوتی ہے جس کے تحت وہ جنم لیتا ہے۔ تم اس کے لاابالی رویے پر نہیں بلکہ اس کے کارناموں پر فوکس کرو، اس کا ریکارڈ اچھا ہے تبھی اس کیس میں اسے انوالو کیا گیا ہے۔“ وہ جتنا ہو سکتا تھا اسے سمجھا رہی تھیں مگر شینزل تھی کہ سمجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ریکارڈ اگر قیس کا اچھا تھا تو کم وہ بھی نہیں تھی۔ اس کی ایمانداری اور کام سے لگن نے اس کا نام کافی مشہور کر رکھا تھا لیکن اس سب کے باوجود اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی جس پر وہ چپ رہنا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے وہ افلاطون ہے لیکن کم از کم مجھے ایک دن تو دیا ہوتا۔ اس ایک دن میں، میں اپنی کارکردگی نہ دکھا پاتی تو، تو سمجھ آتی تھی لیکن یہ بنا چانس دیے اس فضول سے انسان کو میرے

سر پر تھوپنا کہاں کا انصاف ہے۔“ اس فضول سے انسان کی جس کی بات ہو رہی تھی کی جیپ پولیس اسٹیشن کے باہر آ کر رکی، وہ چھلانگ لگا کر جیپ سے اتر اٹھا۔

”دیکھو تم پھر سے غلط کہہ رہی ہو، قیس ایک بہت ہی قابل افسر ہے۔ اس نے کئی مشکل کیس سولو کیے ہیں۔ کئی انکے ہوئے الجھے ہوئے کیسز کو سلجھایا ہے۔ یہ اس کی خاصیت ہے تم اس سے منحرف نہیں ہو سکتی۔“ شینزل نے لب بھینچ کر ایک بار پھر سے آنکھوں کو میچا تھا۔ کمرے میں پھیلی جا سمین کی خوشبو اسے یکدم ناگوار لگنے لگی۔

”میڈم، میں نے کہا ہے مجھے فقط ایک دن درکار ہے۔ میں اور میری ٹیم اس کیس کو سلجھا لیں گے نا، یہ اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔“

اس کا ہر اٹھتا قدم تھوڑی سی گرد اپنے ساتھ اٹھا رہا تھا۔ بھورے ڈیزرٹ شوز کافی مضبوط اور مہنگے لگ رہے تھے۔ اس کے قدم بڑے اور مستحکم تھے۔

”اتنا مشکل نہیں ہے؟ قتل ایک دن پہلے ہوا اور باڈی ہمیں ایک دن بعد ملی، باڈی پر کسی قسم کے فنکر پرنٹس نہیں ہیں۔ قتل کہاں ہوا کچھ علم نہیں، واردات کس نے کی؟ کوئچن مارک، دور دراز ہل اسٹیشن پر موجود ڈیڈی باڈی کے بارے میں بتانے والا کون ہے؟ کوئچن مارک۔ اس بندے کی کال ریکارڈ کیسے غائب ہوئی یہ بھی کوئچن مارک اور تم کہتی ہو یہ اتنا مشکل نہیں ہے، کمال۔“

شینزل کی نظریں پیپر ویٹ پر تھیں اس کا دل کر رہا تھا وہ یہ پیپر ویٹ اٹھا کر اپنے سر پر مار لے نہیں تو اس جاب سے ہی ریزائن کر دے جان ہی چھوٹے لیکن وہ اس شخص کیلئے کیوں خود کو ہٹائے، وہ بالکل بھی ایسا نہیں کرے گی، ہرگز نہیں۔

”لگتا ہے میڈم، کوئچن مارک کے ساتھ آپ نے زیادہ وقت گزارا ہے تبھی اس شخص کا ڈائلاگ آپ کی زبان پر چڑھ چکا ہے۔ ہنوتی کوئچن مارک۔“ یہ سب اس نے سوچا تھا وہ ان

کالفاظ کرتی تھی اس لیے ان کے سامنے اس طرح سے نہیں بول سکتی تھی بولی تو فقط اتنا ہی۔
 ”آپ کے کوچن مارک ٹھیک ہیں لیکن میری صلاحیت سے بھی تو انحراف نہیں کیا جاسکتا۔
 اس سب میں مجھے کیوں دبایا جا رہا ہے۔“

اس کے شانے چوڑے تھے۔ سبز جیکٹ بالکل سادہ تھی ویسی ہی سادہ سیاہ جینز اور ٹی
 شرٹ تھی۔ بائیں ہاتھ کی اس نے مٹھی بنا رکھی تھی جس میں سیاہ گھڑی تھی۔ اس گھڑی سے
 قدرے اوپر اس نے پرنٹڈ کپڑا باندھا ہوا تھا۔

”شینزل تمہاری ضد کی سمجھ نہیں آرہی مجھے۔“ ڈی ایس پی نے تھک کر کہا۔ شینزل کرسی سے
 تھوڑا آگے ہوئی جیسے رازدارانہ انداز میں انہیں کچھ کہنا چاہتی ہو، گھڑی کی ٹک ٹک، ہیٹر کی گھر
 گھر اور اس کا رازدارانہ انداز میں آگے کی اور جھکنا۔

”ضد نہیں دفاع ہے یہ وہ انسان ایک نمبر کا خراب ہے۔ میں نے سن رکھا ہے اس کے
 بارے میں۔“ وہ جس طرح آگے جھکی تھی اور جس طرح ڈی ایس پی اس کی بات سن رہی تھیں
 معلوم ہوتا تھا کوئی بڑے پتے کی بات ہوگی مگر افسوس صد افسوس بلی تھیلے میں سے باہر آئی بھی
 تو مری ہوئی۔

”بہت بری بات ہے۔ کسی کے کردار پر انگلی اٹھانا بہت ہی بری بات ہے بس فیصلہ ہو گیا
 وہ تمہیں اسسٹ کرے گا۔ اور میں اب مزید کچھ نہیں سنوں گی۔“ اس کے لب کھلنے سے پہلے
 ہی انہوں نے ہاتھ کھڑا کر کے کہا تھا دو ٹوک بد لحاظ والے انداز میں، کہیں سے بھی نہیں لگ رہا
 تھا یہ وہی جاسمین ڈسوزا ہیں جنہوں نے چھوٹی سی عمر سے لے کر اب تک اس کا ساتھ دیا تھا۔
 جن کے سائے تلے وہ بڑی ہوئی تھی۔ جن کے توصل سے ہی اسے اس جاب کو حاصل کرنے
 میں آسانی ہوئی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا یہ وہی جاسمین ڈسوزا ہیں جو ہر روز اس کیلئے

کھانا بھجواتی ہیں کبھی نئے کپڑے تو کبھی نئی کتب، کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا یہ وہی جاسمین ڈسوزا ہیں جو خود کو اس کی ماں کہلوانا پسند کرتی ہیں۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔

”آپ اتنی بے مروت کیسے ہو سکتی ہیں۔“

سیلقے سے ترشے ہوئے بالوں والا اپنی دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو دروازے پر بجا کر اندر داخل ہوا اور مخصوص انداز میں میز کے اس پار بیٹھی عورت کو سیلوٹ مار کر سلام کرنے لگا۔

”آہ، دیکھو کون آیا ہے قیس الہی، کرائم ڈیپارٹمنٹ کا ہونہار آفیسر خوش آمدید جاننا۔“ قدرے سانولا رنگ، گہری بھوری آنکھیں ہلکی سی شیو، کھڑی ہوئی ناک اور شرارت سے بھینچے لب، جیل سے سیٹ بال جس میں سے کچھ اس کے کشادہ ماتھے پر گر رہے تھے اور لمبا چوڑا وجود، یہ لمبائی چوڑائی بھی اسے کثرت ورزش کی وجہ سے ملی تھی ورنہ ست آلو کی طرح نیٹ فلکس پر بیٹھے رہنے سے اور ہاتھ میں موجود چپس، سائیڈ پر رکھی بلیک کافی سے کثرت وجود حاصل نہیں ہوتا تب حاصل ہوتا ہے ایک موٹا آلو وہ بھی پیٹ کے اوپر عرف عام میں تو ند۔

”شکریہ۔“ کہنے کے بعد اس نے اپنی ناک کو اوپر اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگنے کی سعی کی تھی نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔ ”فضا بتا رہی ہے ہمارے ہی گن گائے جا رہے تھے کیا میں درست ہوں میڈم؟“ بھاری، شرارتی، مسکراتی ہوئی آواز۔

”آتے ہی شروع ہو گیا، انف یہ مجھے اسسٹ کرے گا۔“ آنکھوں میں سختی درے وہ دونوں دانتوں سے ہونٹوں سے نیچے والی سکن کو پکڑے بیٹھی تھی۔ کان اپنے عقب میں موجود شخص پر ٹکے تھے جبکہ دماغ اور نظریں کہیں اور۔

”بالکل ٹھیک پہچانا ہم تمہیں ہی ڈسکس کر رہے تھے آؤ بیٹھو۔“ وہ خوشگوار حیرت کے

ساتھ جونہی بیٹھنے کیلئے کرسی کھینچنے لگا شیزل اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چلتی ہوں میری ٹیم کے ساتھ میٹنگ ہے۔“ قیس جہاں تھا وہیں رک چکا تھا۔ اس نے شیزل کو کمرے سے باہر تک جاتے ہوئے دیکھا تھا کچھ سوچ کر اس نے کرسی کو چھوڑا اور جاسمین کی جانب دیکھ کر گویا ہوا۔

”ایکچو کلی، مجھے یاد آیا میری بھی تو ان کے ساتھ میٹنگ ہے اور وہ میٹنگ کرنی ہی میں نے ہے تو مجھے بھی جانا چاہیے ہم۔“

کرسی کو واپس اس کی جگہ پر رکھ کر وہ جاسمین کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بنا ہی وہاں سے باہر آ گیا۔ شیزل اس سے دور مگر اس کے سامنے ہی تھی۔ وہ جس راہ سے چل رہا تھا اس راہ سے اسے سلوٹ مل رہے تھے۔ سب اسے جانتے تھے کیونکہ ہر طرح کے مشکل کیس میں اسے ہی یاد کیا جاتا تھا اور وہ بوتل میں موجود جن کی طرح حاضر ہو جاتا تھا جیسے وہ اس فیلڈ میں ہے ہی اس لیے تاکہ اسے ہر وقت یاد کیا جاسکے لیکن یہ بات سچ نہیں تھی اسے اپنے کام سے بالکل بھی لگاؤ نہیں تھا زیرو پرسنٹ بھی نہیں، یہ تو بس قدرت کا کھیل تھا جو وہ یہاں تھا ورنہ وہ کہیں اور ہوتا کچھ اور ہوتا۔

”اسلام علیکم ایوری ون۔“ اس نے اپنے قدموں سے شیزل کے قدموں کو پکڑ لیا تھا۔ یہی تو اس کا کام تھا یہی تو اس کی منزل تھی۔ وہ کہیں بھی ہوتی تھی وہ اسے پکڑ لیتا تھا۔ اس سے ٹکرا ہی جاتا تھا تبھی آج بھی اس نے اسے خود سے دور جانے نہیں دیا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے ہی میٹنگ روم میں داخل ہوئے تھے قبل اس کے سلام کے بعد وہ انٹروڈکشن پر آتا شیزل نے اسے سخت انداز میں ٹوک دیا۔

”یہاں پر سب تمہیں جانتے ہیں نہیں جانتے تو میں دو لفظوں میں بتا دیتی ہوں یہ قیس

الہی ہیں کرائم برانچ سے، آج سے یہ اس کیس میں ہماری مدد کریں گے، اب ہمیں میٹنگ شروع کرنی چاہیے۔“ قیس نے نچلے لب کو دانتوں میں پکڑ کر پھنوؤں کو اچکا کر اسے دیکھا پھر شانوں کو جھٹک کر عین اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”سر میں فارنسک ڈیپارٹمنٹ سے سعد ہوں جو ڈیڈ باڈی ہمیں ملی تھی یہ اس کی رپورٹس ہیں۔ ان رپورٹس کے مطابق مقتول قتل سے دو گھنٹے پہلے ڈرنک تھا۔ اس کے جسم میں الکوحل کے علاوہ صرف آئس گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر پلاسٹک چڑھایا گیا تھا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جو پلاسٹک چڑھایا گیا تھا وہ ڈسپوز ایبل رین کوٹ رہا ہوگا۔ اس کا فارمولہ وہی سی ٹو ایچ فور این ہے لیکن اس کا رنگ ہلکا زرد ہے۔ رپورٹس میں ایک چھوٹا ساسیلڈ پیک ہے جس کے اندر میکرو پلاسٹک ذرات ہیں جو مجھے مقتول کے چہرے سے ملے ہیں۔ آپ جب فری ہوں گے تو لیب آجائے گا میں آپ کو دکھا دوں گا۔“

”اس بیچارے نے جب رپورٹس قیس کے سامنے رکھی تھیں تب سے لے کر اب تک شینزل اسے چھپتی ہوئی نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔ وہ تب سے لے کر اب تک بولنے کے دوران چور نظریں اپنی میڈم پر ڈال رہا تھا تبھی تو ہر نظر پر اس کی گھوری کا احساس ملتے ہی وہ لڑکھڑاتا تھا۔“

”ویری گڈ، ایک ہی دن میں پوسٹ مارٹم بھی ہو گیا اور رپورٹس بھی آگئیں ویلڈن یار۔“ اس نے بنا آواز کے تالی بجا کر سراہا تھا جس پر سعد نے جھجھکتے ہوئے جمل پنے سے کہا۔

”سر، سکہ بولتا ہے۔“ قیس نے ابرو اچکا کر تصحیح کی۔

”جناب سکے کا ایک رخ بولتا ہے دوسرا تو بیچارہ خاموش ہی ہے۔“ شینزل نے پہلو بدلا۔

قیس کے لبوں پر معنی خیز دبی سی مسکان آئی تھی۔ تیر نشانے پر لگ گیا تھا وہ جان گیا۔

”سر میں نشاء ہوں، میرے پاس مقتول کے کال ریکارڈز ہیں چونکہ اس کا سیل فون قتل کے بعد سے لاپتہ ہے اس لیے ہم نے اس کے لیپ ٹاپ سے آئی کلاؤڈ آئی ڈی کو کنٹرول کر کے اس کی ساری ڈیٹیلز نکال لی ہیں جو کہ اس میں ہیں۔“

”ایک اور خاکی لفافہ دھیمی مسکان والے کے سامنے رکھا گیا تھا۔ ایک اور انسان کو گھوریوں سے نواز ا گیا تھا۔ نشاء کھیا کر اپنی کرسی پر بیٹھی۔“

راحیل چپکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور فائل قیس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے بولنے کی زحمت نہیں کی تھی البتہ ایک شرمندہ سی نظر شینزل پر ڈالی تھی جس کے انڈر اس نے کئی کیس سلجھائے تھے لیکن اب مجبوری تھی۔ آئی جی کا حکم تھا اس لیے وہ سب سامنے بیٹھے انسان کو اہمیت دے رہے تھے۔ قیس نے سفید، خاکی اور نیلے رنگ کی فائل کو دیکھا دونوں ہاتھوں کو باہم پھنسا کر میز پر قد رے آگے جھکا۔ اس کی نظروں کے نشانے پر وہ تھی وجوہ جس بیٹھی لازمی طور پر کچھ خطرناک سوچ رہی تھی۔ چند ہی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھ کر گویا ہوا۔

”آج کی میٹنگ ہماری اس کیس کے حوالے سے تھی جو دو دن قبل ہوئے سانحے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ لوگوں نے ساری اہم معلومات اکٹھی کر کے میرے سامنے لا کر رکھ دی ہیں یعنی آدھا کیس ہم سولو کر چکے ہیں ویل ڈن لیکن ہمارے تین کوچن مارک ابھی باقی ہیں اور وہ ہیں کیوں، کب اور کہاں، ہمیں اس پورے کیس میں ان تین سوالوں پر فوکس کرنا ہے۔ یہ تین سوال اگر حل ہو گئے، ان کے جواب مل گئے تو سمجھیں ہمارا کیس کلوز لیکن اگر ان میں سے ایک بھی سوال رہ گیا تو کیس حل ہونے کے باوجود ادھورا ہی رہے گا۔ اس لیے ہمیں وائیوئیر، وین پر کام کرنا ہے۔ میں امید کرتا ہے ہوں آپ سب میری بات کو اہمیت دیں گے ابھی میں آپ لوگوں کی کونک سروس پر متحیر ہوں۔“ اس نے آپس میں پیوست انگلیوں کو کھول کر دو بار تالی

بجائی پھر واپس انہیں وصال بخش دیا۔ وہ مزید کہہ رہا تھا جو کہ یہ تھا۔“ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ آپ کتنے باصلاحیت دماغ کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ مس شیزل یقیناً آپ قابل تعریف ہیں۔“

اس نے جھٹکے سے نظریں اٹھائیں تھیں۔ سیاہ آنکھوں نے بھوری آنکھوں کے ساتھ ٹکراؤ کیا تھا۔ رات نے ڈھلتی شام کو دیکھا ایک ٹک، ایک سیکنڈ کیلئے فقط ایک سیکنڈ کیلئے پھر سنبھلتے ہی وہ کرسی چھوڑ کر وہاں سے جا رہی تھی۔ بالکل ویسے جیسے وہ ہمیشہ اسے چھوڑ کر جاتی تھی۔ قیس کے دل میں ہلچل مچ چکی تھی۔ اس کے جاتے ہی اس نے ہونٹوں کو گول کر کے سانس چھوڑا تھا۔ بھنویں اچکائے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس بندی کے ساتھ کام کرنا مشکل ہے، بے انتہا مشکل۔

☆.....☆.....☆

”جدائی کیا ہے؟“

”لیس السفر۔“

”جدائی نہ تو سفر سے ہے۔“

”ولا فراق الحب۔“

”اور نہ ہی محبوب کے الگ ہونے سے۔“

”حتی الموت لیس فراقا۔“

”پہاں تک کہ موت بھی جدائی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔“

”سجتمع فی الآخر۔“

”عنقریب ہم سب آخرت میں جمع ہوں گے۔“

”الفراق هو۔“

”جدائی تو یہ ہے۔“

”ان یکون احدنا فی الجنہ۔“

”ہم میں سے ایک جنت میں جائے۔“

”والاخر فی النار۔“

”اور دوسرا آگ میں۔“

”یہی اصل جدائی ہے، یہی اصل موت ہے، یہی اصل تکلیف ہے، یہی اصل تنہائی ہے۔“

شام کے سائے تلے جب سورج اپنی آخری سانسیں بھر رہا ہوتا ہے۔ جب سب چہرے پرند اپنی اپنی پناہ گاہوں کی اور گامزن ہوتے ہیں۔ جب دو وقتوں کا ملاپ ہوتا ہے ہاں تبھی جب دل چھو لینے والے مناظر آنکھوں کو تقویت بخشتے ہیں اس وقت وہ اپنے پیلے چہرے کے ساتھ آنکھوں میں ڈھیر سارا خوف لیے ایک کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی جوت نہیں ہوتی، لبوں پر کوئی مسکان نہیں ہوتی، دل میں کچھ خواہش نہیں ہوتی ہاں بس وہ ہوتی ہے اور اس کی پراسرار خاموشیاں، وہ اور بے تحاشہ تنہائیاں۔ آج بھی وہ خاموش تھی بہت خاموش، آج بھی وہ تنہا تھی، بے حد تنہا۔ لیکن تبھی مین ڈور کے باہر سے کھلنے کی آواز آنے لگی۔ وہ کرنٹ کھا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نحیف ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور آنکھوں میں موت کا سا خوف اتر آیا تھا۔ دروازہ کھلا اس کی سانس پھولی، دروازہ کھل کر بند ہوا وہ بوکھلاتے ہوئے صوفے کے پیچھے جا چھپی، بوٹوں کی آواز راہداری سے ہوتے ہوئے لاؤنچ تک آئی اور پھر رک گئی۔

”رتبہ؟“ شناسا، مردانہ آواز پر وہ صوفے کی آڑ سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کی پشت

سے لگ گئی، شرٹ کو اتنی سختی سے تھاما جیسے وہ اس کی آخری سانس ہو اور وہ اسے خود سے علیحدہ کرنا نہ چاہتی ہو اور ایسا ہی تھا وہ اس کیلئے اس کی سانسوں بھی بڑھ کر تھا بہت بڑھ کر۔ اس کا واحد شجر، اس کی واحد محفوظ پناہ گاہ۔

”لگتا ہے مجھے بہت یاد کیا گیا ہے۔“ وہ مسکرا کر مڑا، اس کی شرٹ سیدھے ہونے تک رتبہ کے ہاتھ میں رہی تھی تبھی اس میں بل آگئے تھے لیکن جونہی وہ سیدھا ہوا سفید شرٹ کو اس نے چھوڑ دیا۔

”بہت۔“ وہ رکی توقف کیا اور پھر بولی۔ ”بہت زیادہ یاد کیا گیا ہے۔“ نظریں اس کی شرٹ پر موجود اپنے ہاتھوں پر تھیں اور آواز ڈری سہمی لرزی ہوئی۔

”تو بلا لیتی نا آنکھیں بند کر کے چلا آتا۔“ اس کی تھوڑی کواد پر اٹھائے وہ اسے خود کو دیکھنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ رتبہ نے پلکیں جھپک جھپک کر اس کے چہرے پر نظریں ڈالیں۔ سیاہ آنکھوں میں خوف ابھی بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ سرخ ڈوروں میں دہشت کے ساتھ ساتھ نمی کی پرت بھی چڑھی تھی۔ کنارے کچھ زیادہ بھیکے سے تھے۔

”مسکرا دو پلیز اتنی دور سے صرف تمہاری مسکان دیکھنے آیا ہوں۔“ رتبہ نے بامشکل لبوں کو کھینچا۔ چہرے پر پھیلا خوف تاہنوز قائم تھا۔ اس کے بال بکھیر کر میز پر ساتھ لائے گئے بیگز رکھنے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔ وہ اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”آج کون سی کہانی سنانی ہے۔“ انداز بچوں سا تھا۔

”جدائی کی۔“ جواب بوڑھوں سا۔

”جدائی کی؟“ ہلتے ہوئے سر کو دیکھ کر وہ دوسرے صوفے پر ٹک گئی۔ میز پر رکھے ایک بیگ میں سے مفنز کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے اپنے معدے میں بھوک کو محسوس کیا پھر اسے

اگنور کر کے وہ کہہ رہی تھی۔

”تو پھر سنائیں۔“ پس مردہ سی آنکھوں نے خوف زدہ سی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ ”آخر کب تک یہ چلتا رہے گا، کب تم مجھ تک لوٹو گی، کب جب میں آیا کروں گا تو ڈر کر نہیں مسکرا کر مجھ سے ملو گی، میرا حال احوال پوچھو گی، مجھ سے بے تکی سی باتیں کرو گی، آخر کب وہ وقت آئے گا، کب؟“

وہ سوچ رہا تھا اور اس کی نظروں کو اپنے چہرے پر جمے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے لب ہلائے بالکل پرانے کتھا ساز کی طرح جو کتھا سناتے ہیں تو کھو جاتے ہیں اور سننے والے کو بھی اپنے ساتھ ہی کھینچ لیتے ہیں۔ لیکن وہ کوئی کتھا ساز نہیں تھا وہ تو ایک عام سا انسان تھا بہت ہی عام جو اپنے دل کو بہلانے کیلئے پتہ نہیں کہاں کہاں سے کہانیاں اکٹھی کر کے لاتا تھا۔ ہاں سامنے بیٹھی لڑکی اس کا دل ہی تو تھی جس کی دلجوئی کرنے کی خاطر وہ ایک بار پھر سے کتھا ساز بن گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا جو کہ یہ تھا۔

”ہزاروں سال پہلے روم کے شہر میں ایک بادشاہ رہتا تھا جابر حاکم، نرم دل، سنگ دل، اس کے سر پر موجود تاج سونے کی تاروں سے گندھا ہوتا تھا۔ ہیرے جواہرات جس پر چمچماتے تھے۔ اس کا لباس خاص قسم کی ریشم سے بنتا تھا۔ اس کے جوتوں پر سونے کا پانی ہوتا تھا۔ چوڑے شانے، ہاتھوں میں موجود یا قوت کی انگوٹھیاں اور گلے میں نیلم کا ہار، وہ جب چلتا تھا تو سب تھمتے تھے۔ وہ جب رکتا تھا تو سب جھکتے تھے۔ وہ حاکم وقت تھا۔ اس کا ہی بول بالا تھا۔ سب اسے سنتے تھے۔ سب اسے مانتے تھے۔ اس کے تسلط میں ہی سب کچھ تھا۔“

لمحے بھر کو وہ سانس لینے کو رکا۔ اس کی نظروں نے پیلی جلد والی کے چہرے کو پکڑا جس کی آنکھوں میں اس بادشاہ کی تصویر صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ بولنے والے کا رکنا اسے پسند نہیں

آیا تھا تبھی بے چینی صاف عیاں تھی۔ اس نے رتبہ کی بے چینی کو ختم کیا اور واقعہ وہیں سے جوڑا جہاں چھوڑا تھا۔

”پورے روم میں بس ایک انسان تھا جس کے آگے بادشاہ جھکتا تھا۔ جس کی سنتا تھا۔ جس کی مانتا تھا۔ جس کے بنا اس کا ہر فیصلہ ادھورا تھا کچھ نہیں پورا تھا۔“ پیلی جلد والی کی آنکھیں پھیلیں بھلا ایسا کون ہو سکتا تھا جس کے آگے سنگ دل بادشاہ قہم جاتا ہو، اس کا اشتیاق بڑھا بڑھ کر ختم ہوا کیونکہ کتھا ساز نے بلی کو تھیلے سے نکال دیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا جو یہ تھا۔

”وہ تھی اس کی بیٹی، اس کی اکلوتی اولاد، دراز قد، نڈر، خوبصورت اور ذہین وہ لڑکی پورے ایمپائر میں بس ایک ہی تھی جس کی بہادری کے قصے جگہ جگہ مشہور تھے۔ جس کی ذہانت کا ہر کوئی دلدہ تھا۔ وہ لڑکی وہاں کی پرنسز بھی لیکن سب اسے کوئین کہتے تھے کیونکہ اس کا انداز ہی کوئین والا تھا۔ اس کی چال، اٹھا سب کچھ ہی تو دلکش تھا۔“ کچھ سوچ کر اس کے لبوں پر مسکان آئی سر جھٹک کر وہ پھر سے کہہ رہا تھا۔

”ایک دن وہ کوئین شکار پر گئی ہوئی تھی۔ شام ڈھلے جب وہ محل میں آئی تو اس نے دیکھا اس کے باپ کے ساتھ سرخ بالوں والی عورت کھڑی ہے جس کا سفید لباس موتیوں سے بھرا ہے اور بالوں میں بھی موتی جڑے ہیں۔ آخری بچے تیر کو سائیڈ پر رکھ کر وہ دبے قدم آگے آئی تو اسے اپنے باپ اور اس عورت کی باتیں سنائی دیں۔“

”سلطنت کو سنبھالنے کیلئے بیٹا درکار ہوتا ہے جب آپ کا بیٹا ہے کنگ، تو آپ اسے دنیا کے سامنے کیوں نہیں لے آتے، شہزادی کب تک یہاں رہے گی۔ کیا یہ گوارا ہوگا آپ کو شادی کے بعد کوئی غیر آپ کا تخت سنبھالے۔“ یہ باتیں سن کر اس کے قدم ڈمگائے تھے۔ قدموں کی آہٹ پر بادشاہ اور اس عورت نے رخ موڑ کر دیکھا۔ اس عورت کو وہ جانتی تھی وہ عورت اس

کی ماں کی بچپن کی دوست تھی۔ کیا وہ، کیا وہ اس کی دوسری ماں ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

”دھوکا۔“ اٹے قدموں چلتی وہ سر کو دائیں بائیں جنبش دے رہی تھی۔ سرخ بالوں والی نے سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ اس کی گھیردار فراک کے پیچھے سے جو بچہ نکلا تھا اسے دیکھ کر کونین کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ یہ تو وہی تھا جسے اس کے باپ نے لا کر اس محل میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ اس کے وزیر کا بیٹا ہے جس سے کونین کی بہت دوستی تھی۔ جسے اس نے اپنے بھائیوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ وہ اس پانچ سالہ لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور نفی میں گردن ہلائے جا رہی تھی۔

”ایسا نہیں ہے جان جگر، یہ تمہارا بھائی ہے۔ تمہیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ تمہیں اس سے اور اسے تم سے لگاؤ ہونا چاہیے۔ رک جاؤ کونین کہاں جا رہی ہو، رک جاؤ میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔“ مگر وہ نہیں رکی تھی۔ بھاگتے ہوئے اس سے جوشع گری تھی اس نے ریشم کے پردے کو پکڑ لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے محل میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس کے دوڑنے کے دوران اس کے عقب میں آگ لگ رہی تھی۔ شعلے بھڑک رہے تھے۔ آوازیں دب رہی تھیں مگر وہ بے پرواہ تھی۔ آنسو بہاتے وہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ پھر بہت سال گزر گئے۔ محل جل کر خاک ہو گیا، سلطنت برباد ہو گئی وراثت ختم، سولہویں صدی کے سورج کے غروب ہونے سے پہلے ایک درخت کے نیچے ایک جوان لڑکے نے ایک بوڑھی عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کے بال گنجلک تھے اور لباس مٹی زدہ، وہ لڑکا اپنے گھوڑے سے اترا اور پنجنوں کے بل جھریوں کی گردشوں میں چھپے اس دلکش چہرے کو تلاش کرنے لگا جسے وہ برسوں سے تلاشتا آ رہا تھا۔ لمحے بھر میں ہی اسے پہچانتے ہوئے وہ پکارا اٹھا تھا۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی جدائی آ

چکی تھی۔“

”لیس الفراق۔“ پیلی جلد والی نے نظریں جھکائیں بولی تو آواز مدہم تھی۔

”اسے اپنے باپ کو سن لینا چاہیے تھا۔“ کتھا ساز نے کمر کو صوفے کی پشت سے ہٹایا۔
”سن لیتی تو سب تباہ نہ ہوتا، اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے۔“ پیلی جلد والی کی ناک گلابی ہو چکی تھی۔ مفنر کی خوشبو ماند پڑ گئی، شور کرتی چڑیا خاموش ہوئی اور گھڑی کی آواز چہار سو پھیل گئی۔
”یہی کہ مرد دھوکا دیتے ہیں۔“ کہنے والے نے تصحیح کی۔

”تمہارا جواب ہونا چاہیے تھا غلط فہمی اور جلد بازی دھوکا دیتی ہے۔ منہ موڑنا ہلاک کر دیتا ہے۔ انا مار دیتی ہے۔ بادشاہ طاقت ور تھا پھر بھی کوئین سے محبت کرتا تھا اور اسی محبت کے تحت اس نے اپنا جانشین اسے ہی نامزد کیا ہوا تھا۔ اسی محبت کے تحت ہی اس نے اپنے بیٹے کی حیثیت چھپائی ہوئی تھی۔ یہ بادشاہ کی محبت ہی تھی جو وہ تڑپ کر اپنی بیٹی کے آنسوؤں پر اس کے پیچھے لپکا تھا مگر یہ اس کوئین کی کم ظرفی تھی کہ وہ وقتی احساس سے مغلوب ہو کر سب چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سب جل کر خاک ہو گیا، تباہ ہو گیا۔ وہ رکتی، ٹھنڈے دماغ سے سوچتی، سنتی پلٹ آتی تو زندگی اس پر ختم ہوتی اور نہ اس کے خاندان پر، رتبہ ہماری وقتی لغزشیں، رنجشیں، غلط فہمیاں، مفروضے، انائیں ہم سے یونہی ہمارے رشتے ہمارے پیارے چھین لیتی ہیں۔ غور کرو صرف ایک لمحے کیلئے کہ ہم نے ہماری اوور تھنگنگ ہماری اناؤں کے سبب اپنے کتنے پیاروں کو کھو دیا ہے۔ کتنوں کو زندہ ہونے کے باوجود اپنے دلوں میں مار دیا ہے۔ کل جن کے ساتھ بیٹھ کر ہنستے تھے آج انہیں ہی دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کیوں؟ کیونکہ ہماری انائیں، ہمارے غلط مفروضے اور ہماری ”میں“ رشتوں سے بڑھ کر ہو چکی ہے۔ بلکہ رشتوں سے ہی کیوں ہماری ذات سے بھی بڑھ کر ہو چکی ہیں یہ سب چیزیں تبھی تو ہم اپنی ذات سے

جڑے ہر رشتے کو اپنی انا اور ”میں“ کے آگے صفر کر دیتے ہیں۔“ وہ رک گیا تھا سر جھکا تھا نظریں ساکت۔

”تم نے کہا مرد دھوکا دیتے ہیں۔ تم نے مرد کے دھوکے کو تو دیکھا تم نے اس کی محبت کو کیوں نہیں دیکھا رتبہ۔“ وہ سراٹھائے دست سوال تھا۔

رتبہ انگلیاں چٹخا نے لگی۔ اس کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر کے ہر کونے میں کیمرے لگے تھے۔ وائس ریکارڈر فکس تھے۔ وہ باہر نہیں جاتی تھی کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ پاسورڈ لاک تھے۔ تحفظ بھرپور تھا۔ صرف ایک وہی تھا جو یہاں آ سکتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ بناؤرے بیٹھ سکتی تھی بات کر سکتی تھی رائے دے سکتی تھی نصیحت لے سکتی تھی۔ پھر بھی وہ سوال کر رہا تھا کہ اس نے مرد کی محبت نہیں دیکھی اگر اس نے مرد کی محبت نہ دیکھی ہوتی تو آج وہ یہاں نہ ہوتا۔ اس کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا مگر وہ نہیں سمجھ سکتا تھا شاید کبھی بھی نہیں۔

”میں جوابدہ نہیں ہوں۔“ دھول اڑی بہت زیادہ اڑی۔

”جبکہ میں سننا چاہتا ہوں۔“

رتبہ نے انگلیاں چٹخائیں۔ اس کی آنکھوں کی پرچھائیاں اس جہاں کی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کا کرب یہاں کا نہیں تھا۔ اس کی ذات ادھر سے منسلک نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ زمین میں اور نہ ہی آسمان میں۔ وہ تو بس خلاء میں ہی معلق تھی۔ اور ہمیشہ وہیں رہنا چاہتی تھی۔ سننے والا سن رہا تھا جو کہنے والا کہنا چاہتا تھا۔

”کوئین نے ٹھیک کیا۔ اس نے۔۔۔“ توقف۔“ اس نے دھوکے باز کی نہیں سنی۔ اس نے بے حس کو نہیں دیکھا۔ وہ چلی گئی۔ اسے جانا چاہیے تھا۔ اس نے ٹھیک کیا، بالکل ٹھیک۔“ سامع کی آنکھوں میں ریت بھر چکی تھی۔ زخم پھر سے تازہ ہوا۔ کھرٹ بڑی زور سے کھینچ کر ہٹائی

گئی تھی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ درد کو سہولت سے نظر انداز کر کے وہ مسکرا دیا پھسکی، تھکی، پر مُردہ سی مسکان۔“ چلو مفنز کھاتے ہیں۔ تمہیں پسند ہیں نا اس لیے لے کر آیا تھا۔ میں انہیں پلیٹس میں نکالتا ہوں تب تک تم اسٹرونگ سی کافی بنالاء اور سنو، آج رات میں یہی رکوں گا تم سے اپنے سر کی مساج کروانی ہے اور ہاں بیگ میں دو چار کپڑے ہیں انہیں بھی پریس کر دینا پلیز۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ کچن میں جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ رتبہ کے لبوں پر اس سارے عرصے میں پہلی بار مسکان آئی۔ کچھ دیر قبل کا بوجھل پن اب ختم ہو چکا تھا۔ ہلکی پھلکی گفتگو اور مفنز کی خوشبو ایک بار پھر سے اس اپارٹمنٹ میں پھیل چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

بارش تھم گئی۔ آسمان نیلا اور پرندوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ درخت جس کے نیچے لاش پائی گئی تھی اپنے آس پاس پھیلے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ درخت کے پہلو میں چاک سے لڑکے کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ راحیل اس خاکے کی تصاویر اتار رہا تھا۔ شیزل دور کھڑی سینئر انسپکٹر کمال کے ساتھ کچھ ڈسکس کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ شیڈز لگے ہوئے تھے۔ رخ قیس کی جانب ہی تھا جو انسپکٹر ماریہ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ پھر ماریہ کی کسی بات پر چونکتے ہوئے اس نے سر کو دوبار ہلایا اور اس کا ہاتھ تھام کر گردن نیچی کیے اس کی ہتھیلی کو کھوجنے لگا۔ شیزل کے ماتھے پر دو بل پڑے۔

”وومنا زر۔“ اس کے لب گول ہو کر بے تھے جس پر کمال نے دریافت کیا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ وہ چونکی پھر سر کو دائیں بائیں جنبش دیتے ہوئے گویا ہوئی۔

”نہیں تو۔“ نظر پھر سے کھلے عام فلرٹ کرتے انسان پر جا ٹھہری۔“ دراصل میرا دماغ

کہیں اور تھا۔ قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل رہا کوئی کلیو ہاتھ نہیں آ رہا، فون بک میں جتنے بھی کانیکٹس ملے وہ سب مقتول کے رشتے دار اور دوست تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹس سے بھی کچھ خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ قتل کہاں ہوا کب ہوا کیوں ہوا ان تین سوالوں نے دماغ گھمایا ہوا ہے اوپر سے آئی جی سر کی کالز پر کالز سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔“ کمال نے تحمل سے اس کی بات سنی اور پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”ٹینشن نہیں لو اب تو یہ کیس قیس کے ہاتھ میں ہے وہ دیکھ لے گا سب۔“ شینزل نے کاٹ دار نگاہوں سے قیس کو دیکھا جو اپنے سابقہ کام میں مصروف تھا۔

”یہی تو سب سے بڑی ٹینشن ہے۔“ اس کے منہ میں بڑبڑانے کے دوران ایک چیل ان کے سروں کے اوپر سے گزری تھی۔ اس چیل کے پنجوں میں جو گوشت کا لوتھڑا تھا وہ چھوٹ چکا تھا۔ وہ خون سے بھرا لوتھڑا شینزل کے شانے پر آ کر گر رہا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ ایک نظر اپنے خون آلود شانے کو دیکھا اور دوسری نظر آسمان کو جہاں چیلوں کا پورا خاندان موجود تھا۔ نظریں نیچی کر کے وہ اب گوشت کے لوتھڑے کو دیکھ رہی تھی جس کی پہچان مشکل تھی۔

”اوہو یہ کیا ہو گیا ٹھہرو میں ٹشو لے کر آتا ہوں۔“ وہ جانے لگا تھا جب شینزل نے اسے روک دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں، داغ نہیں جائے گا۔“

پنجوں کے بل بیٹھ کر شیڈز کوناک کی چونچ پر ٹکائے وہ اس گوشت کے لوتھڑے کو ٹٹولنے لگی تھی جس کی ساخت اسے اچنبھے میں مبتلا کر گئی تھی۔ کمال بھی اس کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ دور کھڑے قیس نے اپنی گردن ان دونوں کی جانب موڑی۔

”یہ تو، یہ تو۔“ ان دونوں نے جھٹکے سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر چیلوں کے خاندان کو۔

”اوہ گاڈ۔“ کمال کے لب ہلے تھے۔ شیزل نے اس گوشت کے ٹوٹھڑے کو جو کہ انسانی انگوٹھا تھا اٹھا کر جنگل کی اور دوڑ لگائی۔ کمال بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ قیس نے ماریہ کا ہاتھ چھوڑا اور تیز قدموں کے ساتھ ان کے پیچھے ہولیا۔ وہ چیلوں کی ڈائریکشن میں بھاگے جا رہی تھی۔ قیس نے کمال کو پیچھے چھوڑا پھر اس نے شیزل کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ دو چار درخت چھوڑ کر، پانچ چھ جھاڑیاں پھلانگ کر وہ ایک جگہ پہنچا تھا جہاں سے بہت بری بدبو آ رہی تھی۔ بدبو کے بھکے اتنے تیز تھے کہ اسے اپنے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا، جھاڑی کو ہٹا کر اس نے جو منظر دیکھا وہ اس کیلئے تو نارمل تھا مگر شاید شیزل اور کمال کیلئے نہیں تھا۔ تبھی ان کا ”وٹ دا ہیل“ بلند تھا اور پریشان ہونا بھی۔

”چلو جی ایک اور دھرتی کا بوجھ کم ہو گیا کوئی نہیں، جناب کسی کام تو آئے۔“ بلیاں، کتے، چونٹیاں، مکوڑے کیا کچھ نہیں تھا جو اس مسخ شدہ چہرے کی لاش پر موجود تھا۔ اوپر سے وقفے وقفے سے چیلوں کا حملہ، اس کے جملے پر شیزل نے کراہیت آمیز انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”کچھ لحاظ کرو قیس، اس وقت میں اس طرح کے جملے۔“ کمال کی بات کو اس نے کان کھجا کر سنا جب بولا تو انداز بالکل پہلے والا ہی تھا۔

”یار کیا غلط کہا ہے میں نے، اتنی مہنگائی ہو گئی ہے بیچارے کتے بلیوں کو کھانے کو بھی کچھ نہیں ملتا جو کبھی گوشت کے علاوہ کچھ نہیں چکھتے تھے اب ہر کچھ کھاتے نظر آتے ہیں۔“

شیزل نے تنفر سے دبے لہجے میں غراتے ہوئے اس کی بات قطع کی تھی۔

”بکو اس بند کرو اپنی، مرنے والا کوئی جانور نہیں انسان ہے اور اگر تمہیں انسانوں کی طرح کیس کو دیکھنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تم یہاں سے جاسکتے ہو۔“ کئی سالوں بعد وہ اس سے بولی تھی۔ کئی سالوں بعد ڈائریکٹ وہ اس سے مخاطب تھی۔ کئی سالوں بعد اس نے اسے اس طرح

سے ٹریٹ کیا تھا۔۔ کئی سالوں بعد۔

”اس وقت اگر میں چاہوں تو ڈیسا ایڈ کر سکتا ہوں کون رہے گا کون نہیں اس لیے سنبھل کر ذرا۔“ سینے پر ہاتھ باندھے ابرو کو چڑھائے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ نشاء اور راحیل بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔

”ٹوہیل ودھ یو اینڈ یو اسسٹنسی اینڈ یو ریڈیسیٹن۔“ وہ جانے لگی تھی جب قیس کے لفظوں نے اس کے قدموں کو روک دیا۔

”جانے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ نتائج کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔“

وہ مڑی، مڑنے کے انداز سے ہی پتا چل رہا تھا غصہ اس کے سر پر چڑھ چکا ہے۔ آسمان پر موجود چیلوں کا شور اس کیلئے سروردی کا باعث نہیں بنا تھا بلکہ اس شخص کی آواز بن رہی تھی جس سے وہ خار کھاتی تھی۔

”دھمکا رہے ہو مجھے۔“ کمال کچھ کہنا چاہتا تھا قیس کے ہاتھ کھڑا کرنے پر رک گیا۔

”میں دھمکا نہیں رہا ہوں ہاں البتہ آپ ضرور فرسٹریٹ ہو رہی ہیں۔ اپنے ذاتی عناد کو اگر ہم اپنے تک ہی محدود رکھ کر کیس پر توجہ دیں تو یہ میچورٹی ہوگی۔“ بات کرنے کے دوران اس کی نظر شینزل کے شولڈر پر پڑی تھی جو خون آلود تھا۔

”میچورٹی کا درس تم مجھے نہ ہی دو تو اچھا ہے کیونکہ یہ الفاظ ان لوگوں کے منہ سے اچھے لگتے ہیں جو خود اس پر عمل پیرا ہوں۔“

قیس نے جیکٹ اتار کر کال ملائی، کال چلنے کے دوران وہ خراماں خراماں تپی ہوئی کھڑی شینزل کے قریب پہنچنے لگا تھا۔ جب تک کال اٹھائی گئی تھی وہ اپنی جیکٹ کو اس کے خون آلود شولڈر پر ڈال کر اسے پیچھے چھوڑ آگے بڑھ گیا تھا۔ غصے میں کھڑی شینزل اس کی اس حرکت پر

ٹیٹا گئی ٹیٹا یا تو وہاں موجود ہر شخص ہی تھا۔

”ہاں سعد لوکیشن بھیج رہا ہوں جلدی سے ٹیم کو لے کر پہنچو۔“ ہدایت دے کر وہ جب مڑا تو اس کی جیکٹ زمین بوس تھی۔ راحیل لاش کی تصاویر اتار رہا تھا۔ ماریہ اور کمال ہاتھوں پر گلوں چڑھائے لاش کے وجود کو ٹٹول رہے تھے۔ گردن کے قریب کالر کے پاس سینے سے چپکا ہوا ایک سفید کاغذ ماریہ کے ہاتھ لگا تھا۔ اس کاغذ پر خون کے دھبے تھے لیکن اس پر لکھی تحریر پڑھی جاسکتی تھی۔ ماریہ مڑی، مڑ کر شیزل کو آواز دی۔

”میم، کچھ ملا ہے۔“ ہونٹوں میں پکڑی سگریٹ کو لائٹر دکھاتے قیس کی آئی بالز نے ماریہ کی جانب حرکت کی جس کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان ایک کاغذ قید تھا۔ سگریٹ سلگا کر وہ اس کی طرف آنے لگا تھا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شیزل ماریہ کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے چکی تھی۔

”میری امید سے زیادہ سست نکلی تم اس لیے ایک اور تحفہ بھیجا ہے اگلا خط عشق نئے کلائم کے ساتھ ہوگا پیاری ایس ایل۔“ اس نے آنکھیں بند کی تھیں اسی دوران ہونٹوں میں بھینچی سگریٹ کے دھوئیں کو چھوڑتے ہوئے قیس نے وہ کاغذ شیزل کے ہاتھ سے جھپٹا تھا۔ تحریر پڑھتے ہی اس نے اچنبھے سے شیزل کو دیکھا پھر وہ کاغذ ہوا میں لہرا کر سراپا سوال ہوا۔

”یہ کیا ہے۔ ہاں۔۔۔ کچھ پوچھ رہا ہوں میں یہ سب کیا ہے۔“

شیزل نے ماتھا کھجاتے ہوئے اس پر تیوری چڑھائی بولی تو آواز چڑی ہوئی سی تھی۔

”میرے نام خط عشق ہے نظر نہیں آرہا۔“

ان کے آس پاس کون ہے۔ کون انہیں دیکھ رہا ہے کون نہیں کی پرواہ کیے بنا ہی قیس اس کی کلائی تھام کر اسے کھینچتا ہوا سائیڈ پر لے آیا جسے جھٹکے سے چھڑوا کر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ قیس کی اٹھی انگلی دیکھ کر ضبط کر گئی۔ وہ کہہ رہا تھا جو یہ تھا۔

”اس وقت میں بالکل بھی ایک آفیسر کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس وقت میں۔“ اس نے اپنے رشتے کا حوالہ دینا چاہا مگر پھر لب بھینچ کر ضبط کر کے رک گیا۔ ”شیزل قیس الہی سے بات کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں خدا کیلئے آپ میری سنیں اور مجھے جواب دیں کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔“ وہ جو غصے میں تھی۔ وہ جو اس کے ہاتھ تھام کر یہاں پر لانے پر واویلا کرنا چاہتی تھی۔ وہ جو اسے اپنے ہنڈرڈ پرسنٹ ریکارڈ اور کامیابیوں کا طعنہ دینا چاہتی تھی۔ وہ جو اسے دو منازر کہنا چاہتی تھی۔ اس کے اتنے وقت بعد اتنے استحقاق سے کہنے پر تھم گئی، رک گئی۔ اس کے چہرے سے غصہ ہٹ گیا وہ، وہ بن گئی جو اس وقت قیس نے کہا تھا۔

”کیا ہے یہ؟“ سوال پھر سے آیا، اس بار جواب دیا گیا۔

”میں اس سب سے لاعلم ہوں یہ کون کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے مجھے نہیں پتہ۔“ قیس کے چہرے کی پریشانی پتہ نہیں کیوں اسے تقویت دے رہی تھی۔ اس نے دور کھڑی ٹیم کے ہر فرد کو دیکھا جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کسی نے ان دونوں پر غور نہیں کیا تھا۔ معاملہ ہی اتنا سنگین تھا کہ وہ ادھر ادھر دھیان نہیں بھٹکا پائے۔

”ٹھیک ہے مگر آپ کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی، ذاتی عناد کسی قسم کی چپقلش کوئی، کوئی حادثہ، مقابلہ بازی؟“ اس کے ہر سوال کا اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”نہیں۔“ قیس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یہاں وہاں دیکھا پھر نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے گویا ہوا۔

”ناممکن، ہو ہی نہیں سکتا کوئی تو ہے جو آپ کو اس سب میں الجھانا چاہتا ہے یا جو قتل کر رہا ہے وہی آپ کے ساتھ بیرباندہ رہا ہے تاکہ آپ پھنسیں اور انکوائری آپ پر ہو۔“ وہ جو تھوڑا سافسوں تھا جو ابھی شیزل کے ارد گرد پھیلا تھا۔ اس کے اندیشے پر جھٹ سے اڑ گیا۔ وہ اس کی

بات پر ٹھٹھکتے ہوئے بولی۔

”ایکسیکوزمی ایم آ کا پ ناٹ آ کلر۔“ وہ طنزیہ مسکرا دیا۔

”بی بی کس نے آپ کو کا پ بنا دیا، شک کی بنا پر تو وزیراعظم کو تختہ دار پر چڑھا دیا جائے آپ ابھی تک کا پ کے نشے میں ہی گھوم رہی ہیں۔“

سر جھٹک کر وہ واپس اس جگہ آیا تھا جہاں لاش موجود تھی پہلا کیس سلجھا نہیں تھا دوسرا گیند کی طرح ان کی گود میں آگرا۔ قیس کی بات پر اس کا دماغ بٹ گیا تھا۔ طرح طرح کی سوچیں تھیں جو اس وقت اس کے ارد گرد گردش کر رہی تھیں۔ اگر واقعی شک کی بنا پر اس کیلئے انکوائری بٹھا دی گئی تو، اگر اس کی وردی اس سے چھین لی گئی تو، اگر اسے نظروں میں رکھ لیا گیا تو؟ اتنے سارے ”اگر“ تھے اور اتنے ہی سارے ”تو“ تھے جنہیں سوچتے ہوئے وہ پریشان تھی۔ اپارٹمنٹ میں پہنچنے تک وہ پریشان ہی تھی۔ اپنی سوچوں میں غلطاں وہ ڈور کو ان لاک کر رہی تھی جب آنٹی رحمت نے اسے پکارا تھا۔

”ارے شیزل بیٹا کیسی ہو، بڑے دن بعد نظر آئی۔“ اس نے چابی کو گھمایا، گردن آنٹی رحمت کی طرف کی۔ کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل چکا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں آنٹی، آپ کیسی ہیں؟“ رسی سا سوال تھا جس کا جواب اس نے عجلت میں دیا تھا۔ آنٹی رحمت اس کی منزل پر ہی رہتی تھیں۔ دونوں کا گھر آمنے سامنے تھا۔ سیاہ گیٹ آمنے سامنے تھے۔

”میں بھی ٹھیک، احد آیا ہوا ہے۔ اس کی ٹریننگ مکمل ہو گئی ہے نا اس لیے اب وہ یہیں رہے گا، آجاؤ ایک ساتھ ڈنر کرتے ہیں۔ اسے اچھا لگے گا۔“ شیزل نے مسکرا کر ان کی بات رد کی۔ رد کرنے کے دوران ہی وہ تھوڑا دروازہ کھول چکی تھی۔

”ممکن نہیں ہے ابھی، کچھ اہم ڈاکومنٹس گھر رہ گئے تھے جنہیں اٹھانے آئی ہوں اب واپس جاؤ گی پھر کبھی سہی۔“

رحمت اس کے انکار پر اپنا سامنہ لے کر رہ گئیں۔ صوفیانہ سوٹ، سلیقے سے بندھے گرے بال، سر پر جمادو پٹہ اور قدرے بھرا بھرا وجود، ان کی جلد سفید تھی اتنی کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہونے کا گمان ہو۔ آنکھیں گرے تھیں اور ہونٹ گلابی، وہ یوسف زئی تھیں۔ سوات سے تعلق تھا ان کا، یہاں اپنے بیٹے کے ساتھ رہ رہیں تھی کیونکہ ان کا بیٹا یہاں کی انٹرنیشنل فرم میں جاب کرتا تھا۔ احد یوسف زئی خوب رو، دراز قد، ہینڈسم اور خوش گفتار، آنکھوں اور جلد کا رنگ اس نے اپنی ماں سے لیا تھا۔ وہ بولتا بھی تو ان کی طرح ہی تھا نرم نرم سا، میٹھا میٹھا سا۔

”ٹھیک ہے پر ایک دو دن میں تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ گی، احد کل سے آیا ہوا ہے تمہارے بارے میں سو بار پوچھ چکا ہے۔ وقت نکال کر اس سے بھی مل لینا ابھی تو وہ بیکری سامان لینے گیا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا آج تمہیں اپنے ساتھ ڈنر پر پکڑوں گی اسی وجہ سے وہ تمہارے لیے ڈمپلنگز لینے گیا ہے۔“ اس نے شرمندگی سے رحمت آنٹی کو دیکھا، اسے جلدی تھی بہت جلدی، اس کی عجلت کو بھانپ کر رحمت آنٹی نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول لیا۔

”چلو اب میں چلتی ہوں کھانا پیک کر دوں گی جب گھر آؤ تو بیل کر کے لے لینا۔“ وہ سیاہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی تھیں۔ شینزل گہرا سانس بھر کر اندر آئی۔ سیدھا اپنے کمرے میں گئی، کبڈ میں سے ایک فائل نکال کر اس کے اوراق آگے پیچھے کر کے وہ واپس مین ڈور کی طرف آگئی تھی۔ ابھی وہ گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ اس کے فون پر کال آنے لگی نمبر دیکھا تو دماغ میں انگارے بھرنے لگے۔ اسی شخص کی وجہ سے تو وہ صبح سے لے کر اب تک صرف یہی سوچے جا رہی ہے کہ اگر اسے پھنسا دیا گیا تو کیا ہوگا؟ یہ ”تو“ کی کہانی نا جانے کب ختم ہوگی۔ اس

نے الجھتے ہوئے کال پک کی تھی۔

”شینزل کہاں رہ گئی ہو آپ مجھے ارجنٹلی وہ فائل چاہیے۔“ وہ شاید بہت سے لوگوں کے درمیان تھا اس لیے پیچھے سے بہت شور آ رہا تھا۔

”میں نے گاڑی سڑک پر ڈال دی ہے دس منٹ میں پہنچ جاؤں گی اور پلیز میرا نام لینے سے گریز کرو۔“ دوسری طرف وہ چند لمحوں کیلئے کچھ نہیں بولا تھا۔ صرف شور تھا جو آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کال کٹ کرتی اس کی بھاری گھمبیر آواز خاموش کار میں گونج اٹھی۔

”سب حق تو چھین چکی ہو آپ بس ایک یہی حق بچا ہے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا میں۔“ شینزل کے دل کو کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔ اس نے درستی سے اسے ٹوکا۔

”دیکھو قیس تم کون ہو میں نہیں جانتی اور چاہتی ہوں یہی تاثر تمہاری طرف سے بھی ملے اس لیے اس طرح کی باتیں کرنے سے گریز کرو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

وہ جواتنے ہجوم میں تنہا کھڑا تھا اسے کچھ نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ ایک نمبر کی ضدی اور ہٹ دھرم قسم کی انسان ہے جسے فقط اپنی بات منوانا آتا ہے۔ انا کوٹ کوٹ کر اس میں بھری ہے۔ وہ ایک بار جس سے متنفر ہو گئی سو ہو گئی۔ اور اس وقت شینزل، قیس الہیٰ سے بری طرح متنفر تھی۔

”میں جانتا ہوں کچھ حاصل نہیں ہوگا بھلا گرجتے بادل بھی کبھی برسے ہیں۔“ اس نے یوٹرن لیا ساتھ میں اسے جواب بھی دیا۔ اس کی کار کے ساتھ ایک اور کار بھی شامل تھی۔ سڑک کشادہ تھی۔ ہجوم حد سے زیادہ۔

”اگزیکٹلی ایسا ہی ہے اس لیے میری ٹیم کے سامنے اپنا حق اپنے تک محدود رکھنا میں نہیں چاہتی مجھ پر کسی قسم کی بات ہو کیونکہ ہمارے ماضی اور ٹوٹے ہوئے تعلق سے کوئی واقف نہیں ہے۔“

وہ اس کی بات پر آنکھیں پھاڑ گیا۔ حیرت کی پرچھائیاں پورے چہرے پر غالب تھیں۔
 ”حقیقت سے تو آپ اب بھی دستبردار نہیں ہو سکتی۔ اور آپ کو لگتا ہے ہمارا رشتہ ٹوٹنے
 کے قابل ہے؟ آپ ایسا کر سکتی ہیں۔ آپ میں ایسی ہمت ہوگی مجھ میں نہیں ہے۔“ وہ دو ٹوک
 کہہ گیا تھا۔ صدیوں کو مٹا گیا تھا۔ شیزل کیلئے یہ تغیر ناقابل برداشت ہوا۔ اس نے خود پر ضبط
 باندھے رکھا۔

”میں چاہوں گی ہر ممکن کوشش کر کے تم مجھے اگنور کرو۔ مجھ سے بات نہیں کرو۔ مجھے نہیں
 پسند تمہارا میرے آس پاس ہونا۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے کال کاٹ کر فون کو پیئجر سیٹ پر پھینک دیا۔ اسی دوران اس کی
 نظربیک دیو مرر پر پڑی تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ پر موجود چیز کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ اچانک
 اس کی کار غیر متوازن ہوئی۔ اس نے جلدی سے اسٹیرنگ وہیل پر گرفت مضبوط کر لی۔ اگر وہ
 زیادہ گڑبڑا جاتی تو ایکسیڈنٹ متوقع تھا۔ اس نے ایک بار پھر سے پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی۔
 وہاں وہ گڑیا ابھی بھی موجود تھی۔ پھٹی ہوئی لمبوتری آنکھیں، نوک دار نکلے ہوئے دانت،
 شیطان کے پنجوں سے ہاتھ پاؤں، سیاہ و گرے رنگ، لوگوں کی ہر دلعزیز لا بو بو، وہ لا بو بو جو
 شیطان کی شبیہ پر بنائی گئی ہے۔ کاسنگ لنگ کی سیریز دی مونسٹرز کی حقیقی صورت، کاسنگ
 لنگ کی کتابیں زیادہ تر نورڈک یعنی شمالی یورپ دیو مالا سے کافی حد تک متاثر ہیں۔ ان کے
 کردار جادو سے کافی شغف رکھتے ہیں۔ ان کرداروں میں کچھ اچھے بھی شامل ہیں اور کچھ
 برے بھی۔ لا بو بو برے کرداروں کی سردار ہے لیکن رائٹر نے اسے پریوں جیسی مخلوق بنانے پر
 بہت کوشش کی ہے۔ جو اچھے کام کرنے جاتی ہے لیکن اس کے نتائج برے ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ
 شیطان ہے جو معصوم ہے۔ جس کو معصوم دکھا کر بنایا گیا ہے۔ دو ہزار پندرہ کے بعد پاپ

مارٹ کو اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ اس خوبصورت شیطان کو مارکیٹ میں لا کر اسے اندھی تقلید کرنے والوں کے درمیان پھیلا دیا جائے۔ شیطان ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور ایک مشہور پاپ اسٹار کے ذریعے اس کو پوری دنیا میں مقبول کروا دیا۔ رول تھا۔ شیطان ہر گھر میں، رول پورا ہوا۔ بلاسٹڈ باکسز آرڈرز کیے جانے لگے۔ اور ایک شیطان ہر بشر کا پسندیدہ ہو گیا۔ بچے، بڑے، بوڑھے ہر کوئی اس کا اسیر ہونے لگا۔ پلان تھا۔ بہت کامیاب رہا۔ مشرکین کیلئے ہمیشہ ٹارگٹ مومن ہی ہوتا ہے۔ مومنوں نے کھلی بانہوں سے ان کے ٹارگٹ کو ویلکم کر کے مکمل کر دیا۔ سیلمر ٹیز سے لے کر عام عوام تک میں شیطان مقبول ہو گیا اور گھر گھر پایا جانے لگا۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے۔

”فرشتے اس گھر میں نہیں آتے جہاں کتابیا تصویریں ہوں۔“

اس گھر میں فرشتوں کا داخلہ روک دیا جاتا ہے جہاں یہ دو چیزیں ہوں تو پھر اس گھر میں فرشتے کس طرح آ سکتے ہیں جہاں شیطانی گڑیا موجود ہے۔ ایک نہیں دو دو ہیں۔ صرف گڑیا نہیں بلکہ اس کی شکل کا پینٹ شدہ بیگ ہے۔ ٹی شرٹ ہے اوٹنگ بھی۔

شینزل نے دماغ پر اچھے سے زور ڈالا۔ اسے دور نزدیک کہیں یاد نہیں آیا کہ اس نے کبھی یہ گڑیالی یا اسے اپنی گاڑی میں رکھا۔ یہ کام یا تو بلڈنگ کے بچوں کا ہے یا پھر کوئی غلطی سے اس کی کار میں اس گڑیا کو پھینک گیا ہے۔ اس کا دل اچانک سے بوجھل ہوا۔ ابھی اگر ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو؟ وہ اس تو کے ساتھ اسٹیشن پہنچی تھی۔

اسٹیشن پہنچنے تک اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچی تو قیس ٹیم کو گول دائرے کی صورت بٹھائے خود درمیان میں کھڑا ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چند پیپرز تھے اور ماتھے پر چشمہ ٹکا تھا۔ دوپہر میں اس نے جو جیکٹ شینزل کو دی تھی وہ شینزل نے وہیں

زمین پر گرا دی تھی۔ اس میں سے ضروری چیزیں نکال کر قیس نے بھی اس جیکٹ کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ تب سے اب تک وہ سردی میں ایک اسکن ٹائٹ ٹی شرٹ میں تھا۔ جس کے بازو پورے تھے جنہیں اس نے کلائیوں سے قدرے اوپر چڑھایا ہوا تھا۔ اس کا گلا وی شپ کا تھا جس کی نوک پر اب وہ ماتھے پر سے گلاسز اتار کر اٹکا رہا تھا۔

”پہلے والے قتل کا اور اس قتل کا تعلق ایک ہی انسان سے ہے کیونکہ ابھی جو دوسرے قتل کی رپورٹ ہمارے ہاتھ آئی ہے اس میں بھی لاش کے کانوں کے قریب سے پلاسٹک کے ذرات ملے ہیں اور گردن کی رگ بالکل اسی انداز میں کاٹی گئی ہے جس انداز میں ڈیڈون کی گردن کو کاٹا گیا تھا۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ڈیڈون بھی بیس اکیس کے لگ بھگ تھا اور ڈیڈون کی عمر بھی اسی طرح کی ہے لیکن سوال ابھی تک وہی ہیں وائے؟ ویئر؟ اور وین؟“

بات کرنے کے دوران اس کی نگاہ دروازے کے قریب کھڑی شینزل پر گئی جو اس کے دیکھنے پر اندر آ گئی تھی۔ ٹیبل کے ایک سرے پر ٹک کر اس نے فائل میز کی کھر دری سطح پر رکھی پھر گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بولی۔

”سوال کے جواب یقیناً پیچیدہ ہیں لیکن مجھے لگتا ہے ان دونوں لڑکوں کا آپس میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا ہوگا ماضی میں یا حال میں لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ٹچ میں ضرور رہیں ہونگے۔ اور مجھے لگتا ہے ڈیفینٹلی ان دونوں سے ایسا کچھ ضرور ہوا ہے جس کے سبب یہ قتل ہوئے ہیں، کوئی روایتی وجہ نہیں ہے ان واردات کے پیچھے۔“ کمال نے بھنویں چڑھا کر ماتھے کو سلوٹ زدہ کیا قبل اس کے قیس کچھ رائے پیش کرتا وہ بول اٹھا۔

”یعنی تم کہنا چاہ رہی ہو کہ قصور ان دونوں لڑکوں کا ہے۔“

قیس دفعتاً درمیان میں بولا۔ ”یہ کہنا چاہ رہی ہیں ہمیں قاتل کو نہیں قتل کی وجہ کو ڈھونڈنا

چاہیے قاتل خود بخود سامنے آجائے گا ایم آئی رائیٹ لیڈی؟“ مسکراتی نظروں سے تصحیح کر کے سوال کیا تو جواب میں فل ٹائم اگنورنس ملی مگر قیس کی نظروں کی مسکراہٹ اس پر سے ہٹی نہیں تھی جو ٹیم کے ہر فرد سے مخاطب تھی۔

”نشاء دو دن تک تم مجھے ان دونوں لڑکوں کے پچھلے پانچ سالوں کی کال ریکارڈز، ای میلز، فیس بک، واٹس ایپ، سٹیپ چیٹ اور انسٹا کی ایکٹوٹیز کے بارے میں پوری فائل بنا کر دو گی، راحیل مجھے ان دونوں کا سابقہ تمام میڈیکل ریکارڈ چاہیے، ماریہ مجھے ان کے دس سال کی عمر سے لے کر اب تک جتنے بھی دوست ہیں ان سب کی لسٹ چاہیے اور کمال آپ، آپ نے مجھے ان کی گرل فرینڈز کی لسٹ، بارز کی اینٹریز اور ڈرگ کے بارے میں فائل بنا کر دینی ہے۔ میں چاہتی ہوں اسی ہفتے کے اندر اندر ہم اس کیس کو سلجھالیں۔ اپنی کوچن؟“ وہ جوں جوں ڈیوٹیز لگا رہی تھی توں توں ”لیس میم“ کی صدا بلند ہو رہی تھی مگر ایک ہاتھ تب بلند ہوا تھا جب اس نے ”کوئی سوال“ کہا تھا اور وہ ہاتھ قیس کا تھا۔

”فرمائیں۔“

”میں نے کیا کرنا ہے؟“ سب کے لبوں پر دبی دبی سی مسکان تھی سوائے شیزل کے جو سپاٹ چہرے کے ساتھ سابقہ انداز میں ہی بیٹھی تھی۔

”واپسی کی تیاری۔“ اس نے زیر لب کہا تھا۔ سننے والے نے سن لیا۔

”میرے خیال سے مجھے آپ کو فالو کرنا ہے۔ اگر آپ نے کوئی ڈیوٹی نہیں دینی تو کوئی بات نہیں مجھے مہینچ کرنا آتا ہے۔ یوں بھی آپ کے آرڈرز تو ویسے بھی نہیں ماننے مجھے۔“ وہ ٹھٹھہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شیزل سیخ پاسی ہو گئی لیکن ضبط کر گئی۔

”یہ علاقہ اور کیس میرے انڈر میں ہے اور آرڈر دینا میری عادت ہے۔ میں نے جوا نہیں

کہنا تھا کہہ دیا اب آپ کنٹی نیو کریں۔“ وہ جانے کیلئے کھڑی ہوئی تھی پھر رک گئی۔

”بائے داوے فائل وہاں پڑی ہے۔“ میز کی جانب اشارہ کر کے وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ مبہم سی مسکان سب کے لبوں پر تھی۔ قیس نے اوپر والے لب کو دانتوں میں پکڑ کر چھوڑا پھر ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔

”او کے میٹنگ برخاست ہوتی ہے۔“ کڑوے کیلے انداز میں کہہ کر وہ بھی باہر چلا گیا۔ اندر سب ان دونوں کے جاتے ہی ہنسا شروع ہو چکے تھے۔

شینزل کے آگے کوئی ٹک جائے ناممکن۔

☆.....☆.....☆

اندھیری رات میں
سیاہی کے جال میں
کوئی گناہ پکتا ہے
کوئی دل دہکتا ہے
اندھیری رات میں
سیاہی کے جال میں
کوئی روح بکھرتی ہے
کوئی جاں تڑپتی ہے
اندھیری رات میں
سیاہی کے جال میں

خاموش دبے قدم لہجہ بہ لہجہ زینہ چڑھ رہے تھے۔ سانس حلق میں اٹکی تھی اور ماتھے پر پسینہ

چمکتا تھا۔ چھوٹے ہاتھوں کی چھوٹی انگلیاں رینگ پر سرکتی ہوئی ہرزینے کے ساتھ اوپر اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں لکڑی کی رینگ کو خاموش رہنے کی تنبیہ کر رہی تھیں۔
 ”شش کوئی آواز نہ آئے، شش کوئی سن نہ لے۔“

اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا رکھنے کے بعد محتاط نگاہ نیچے کی اور دوڑائی، تاریکی، خاموشی لاؤنج کی مکین تھی۔ ذی روح تھی اور نہ ہی کوئی پرندہ۔۔۔ دھڑکتے دل کے ساتھ پنچوں کے بل چلتی ہوئی وہ ایک دروازے کے قریب آ کر رکی۔

اندھیری رات میں

سیاہی کے جال میں

شب خوں روتا ہے

کوئی آہ سسکتی ہے

اس نے فراق کے بیلٹ پر لگی بو میں چھپی ہوئی ایک چابی نکالی، وہ چابی عام چابی نہیں تھی۔ اندھیرے میں اس کی ہلکی سی شبیہ دکھائی دے رہی تھی۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ چابی لکڑی کی بنی ہوئی ہے جسے اس دس سالہ بچی نے دروازے کے لاک میں لگا دیا ہے۔ لاک میں چابی گھسانے کے دوران وہ لبوں میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے لب جو الفاظ ادا کر رہے تھے وہ یہ تھے۔

”رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر۔“

آنکھیں بند کیں چابی کو گھمایا اور وہ ہو گیا جس کا اس نے خواب کیا تھا۔ ایک معجزہ، ہاں وہ دس سالہ بچی کیلئے ایک معجزہ ہی تو تھا جو اس کے نازک ہاتھوں سے بنی لکڑی کی چابی سے وہ دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کی ماما نے بتایا تھا ہر دروازے کھل جاتے ہیں اگر تو کل پختہ ہو تو، ہر

راستہ بن جاتا ہے اگر یقین کامل ہو تو۔ یہ دروازہ بھی کھل گیا تھا۔ تو کل بھی پختہ تھا مگر ارادہ، ننھا دل لرزا۔

”ربنا ولا تھملنا مالا طاقتہ لنا بہ۔“

چرکی آواز کے ساتھ دروازہ وا ہوا۔ اس نے اپنے سرخ بوسیدہ بے بی شوز والا پاؤں اندر رکھا۔ اندھیرا وہاں کا بھی راجا تھا۔ اپنے پیچھے دروازے کو بند کر کے اس نے گلے میں اٹکا پن نکالا اور اس کی ٹارچ لائٹ جلا دی۔

اندھیری رات میں

سیاہی کے جال میں

اک حسرت پختی ہے

اک آگ سلگتی ہے

کوئی نظر بھٹکتی ہے

کوئی راہ نکلتی ہے

اس نے دیکھا وہاں بیش قیمت مورتیاں، برتن اور پینٹنگز موجود تھیں۔ مہنگی کلاشکوفیں اور بھاری گلدان بھی، اس نے خود کو آگے بڑھایا۔ پتلی باریک ٹارچ لائٹ میں وہ چھوٹی پنچی سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی ایک قد آدم تصویر کے آگے آن رکی۔ اس تصویر میں اس کے دادا تھے جو شیر کی پشت پر سیدھا پاؤں ٹکائے ایک ہاتھ میں رائفل لیے کھڑے تھے۔ رائفل کے نشانے پر ہر وہ شخص ہوتا تھا جو انہیں دیکھنے کیلئے تصویر کے سامنے آ کر کھڑا ہوتا تھا۔ ان کی بھوری مچی ہوئی آنکھوں پر سے لائٹ ہٹا کر اس پنچی نے ان کے قدموں میں پچھی درازوں میں سے ایک دراز کھولی، لکڑی کی دراز جس کے چاروں اور اسٹیل چمک رہا تھا کھل گئی۔ اس

میں موجود پیسوں پر نظر پڑتے ہی بچی کا دل بھر آیا۔

اندھیری رات میں

سیاہی کے جال میں

جب آنسو ٹپکتا ہے

تب مرنا پڑتا ہے

اندھیری رات میں

سیاہی کے جال میں

صبح کی نوخیز کرنیں جہانگیر مینشن میں طوفان برپا کرنے آئی تھیں۔ پھیکی کرنوں نے دن کی شروعات بڑی بد مزہ سی کی تھی۔ نوکروں کی قطار لان کے سبزے پر سر جھکائے کھڑی تھی۔ پھیکے سورج کی مردہ سی کرنوں سے بچنے کی خاطر وہ چھتری تلے ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے تھے۔ کروفر سے تنی گردن، گہری مونچھیں اور کشادہ ماتھے پر موجود سلوٹیں، ان کی انگوٹھیوں سے بھری انگلیاں کرسی کے ہتھے پر وقفے وقفے سے اوپر نیچے اٹھ رہی تھیں۔ نظروں کے سامنے نوکروں کی قطار تھی اور دائیں بائیں دونوں بیگمات معہ سپوت۔

”مجھے صرف سچ سننا ہے کوئی سوال جواب نہیں بس ہاں اور نا، بتائیں آپ میں سے کس نے رات کی تاریکی میں گناہ کبیرہ کیا ہے۔“ دبیز خاموشی اور جھکی ہوئی گردنیں۔ جہانگیر کے ماتھے کے بل مزید گہرے ہوئے۔

”چار لاکھ روپے میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن ان کی وقعت آپ لوگوں کی نظروں میں کیا ہے یہ میں اچھے سے جانتا ہوں۔ دھوکا چار لاکھ روپوں کا ہو یا چار آنوں کا دھوکا دھوکا ہوتا ہے جو آپ لوگ مجھے دے چکے ہیں۔ اور اس کیلئے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس لیے آخری بار پوچھ رہا ہوں کون ہے وہ باغی؟“ تاہنوز خاموشی، تاہنوز جھکی ہوئی گردنیں، جہانگیر کے عقب میں کھڑی بچی کی ہتھیلیاں عرق آلود ہو رہی تھیں۔ اس کی ماں کے ہاتھ اس کے شانوں پر تھے۔ وہ سانس تیز اور گہرا نہیں لے سکتی تھی اس صورت میں وہ پکڑی جاتی۔ ایک بار اس نے بابا کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ مجرم جب منظر عام پر نہیں ہوتا تو اسے پہچاننے کیلئے اس کی چور نظروں اور اس کے سانس کی رفتار کو دیکھو چہرے کے رنگ نہیں کہ اس پر کنٹرول کافی لوگوں کو آچکا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے اپنی سانس متوازن رکھی ہوئی تھی کہ اس کی ماں کے ہاتھ اس کے جرم کو پکڑ نہ لیں۔

”صاب خدا کا واسطہ لے لیں ہم قصور وار نہیں ہیں۔ آپ سے بغاوت ہمارے لیے موت ہے۔“ مالی بابا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ اس کی ماں اس دوران کھانسی تھی۔

”ہاتھ نہیں جوڑیں۔ شرمندہ نہیں کریں۔ گردنیں اٹھائیں اور آنکھوں میں دیکھ کر جرم قبول کریں۔ زبان دیتا ہوں نوکری سے فارغ کروں گا نظروں سے گراؤں گا لیکن کوئی کیس نہیں چلاؤں گا اور نہ ہی چوری کیے پیسوں کا مطالبہ کروں گا بس قبول کرو، جس نے یہ جرم کیا ہے وہ قبول کرے۔“ ان کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ نین نے سختی سے آنکھیں میچیں۔ دل کی دھڑکن بغاوت پر اتر آئی تھی۔ اسے لگا وہ یہاں کھڑی نہیں ہو پائے گی، مزید نہیں ہو پائے گی۔

”ہم لوگ سچ کہہ رہے ہیں صاب، آپ کا نمک کھایا ہے غداری کیسے کریں گے۔“ وہ دھاڑ کر کھڑا ہوا، شیریں دھاڑ تھی اور جب کھڑا ہوا تھا تو کرسی پیچھے کو جا گری تھی۔ نین کا جود کپکپا اٹھا۔

”تو پھر کس نے کیا، کس نے لاک کو کھولا اس لاک کو جس کی چابی صرف میرے۔“ وہ یکدم ر کے تھے۔ دل میں جیسے اوس بھر گئی ہو۔ آنکھوں کی پتلیوں نے ملازموں سے گھاس تک

کا سفر کیا اور پھر وہ دائیں جانب مڑ گئیں وہاں جہاں ان کا بیٹا کھڑا تھا ان کا سیٹھ صاحب، دل آمادہ نہیں تھا لیکن دماغ گھنٹی بج رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو جانے کو کہا جب ملازم جا چکے تو وہ اپنی جگہ پر ٹل کھڑے اپنے بیٹے کو بلارہے تھے۔

”سیٹھ صاحب، سامنے تشریف لائیں۔“ پر اعتماد سادس سالہ لڑکا جس نے سفید شلوار قمیض پر باپ کی طرح کی ہی سیاہ واسکٹ پہنی ہوئی تھی ان کے سامنے آ کر کھڑا ہوا اور انہی کے انداز میں ہاتھوں کو کمر پر باندھ گیا۔ اس کے پاؤں میں بھی سیاہ کھیڑی تھی اپنے باپ کی طرح، بال بھی انہی کی طرح جیل سے پیچھے کوچھے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا عکس تھے بس قد اور عمر کا فرق تھا۔

”کیا یہ کارنامہ آپ نے سرانجام دیا ہے؟“ بغیر فریم کے سفید نظر کے چشمے کے پیچھے کی آنکھیں قدرے سخت تھیں مگر بیٹے کیلئے ان کی سختی میں تھوڑی کمی آئی۔

”یقیناً نہیں، آپ کی چابی میرے پاس ضرور تھی لیکن پیسے میں نے نہیں چرائے۔ اپنی چیز کون چراتا ہے بھلا؟“ لہجے کی حاکمیت پر جہاں جہانگیر کے لبوں پر مسکان آئی تھی وہیں نین کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اتری۔

”بجائے فرمایا، کام آپ کا بھی نہیں نوکروں کا بھی نہیں تو پھر کس نے کیا ہے یہ؟“ بھوری آنکھوں نے سرخ فرائی والی پر نظر ڈالی پھر باپ کی جانب دیکھ کر گویا ہوا۔

”شک کر کے افسردہ کر دیا ہے بابا جان آپ نے مجھے، ایک ہفتہ خفا رہوں گا آپ سے میں۔“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اس کی ماں جہانگیر کے قریب آئی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئی۔

”پریشان نہیں ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس دوران نین کی ماں کھانسی تھی۔ کھانسنے

کے دوران ہی وہ اپنی بیٹی کو لے کر مر گئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا جانتا ہوں، کیسے ٹھیک ہوگا یہ سوال ہے۔“ مصباح نے جہانگیر کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔ سنہری افشاں کی تھال ان کے سروں پر آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھی۔ آسمان سے گویا لاتعداد سنہری تارے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

”ایک بار آپ حلیمہ اور اس کی بچی سے بھی پوچھیں۔“ جہانگیر نے ٹھٹھکتے ہوئے اپنی بیوی کی سمت دیکھا۔ آنکھوں میں مبہم سا شاک ابھرا، ماتھے کی سلوٹوں میں کچھ مزید اضافہ ہوا تھا۔ چہرے پر سرد مہری پھیل گئی۔

”لفظوں پر غور کرو اپنے۔“ دبی سی غراہٹ اور لہجے کی سختی بتا رہی تھی کہ انہیں یہ تجویز ناگوار گزری ہے۔

”غور کر کے ہی بول رہی ہوں جس طرح آپ حلیمہ اور اس کی بیٹی۔“ انہوں نے درشتی سے بیوی کو ٹوکا۔

”نین، جہانگیر کی نین۔“ مصباح نے سرد سانس خارج کی اور کہا۔

”جی وہی کہنا چاہ رہی ہوں میں کہ جس طرح آپ حلیمہ اور جہانگیر کی نین کو نظر انداز کرتے ہیں کیا پتا اسی وجہ سے دونوں میں سے ایک نے یہ کام کر دیا ہو۔“ مصباح نے جہانگیر کی نین چبا کر کہا تھا۔ یہ تجویز انہیں پھر بھی نامعقول لگی۔ ان کے لہجے میں برودت شامل ہو گئی۔ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر کر بولے۔

”ناممکن، میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی اس بات کو یہیں پر ختم کرتے ہیں بس۔“ ان کا لفظ حرف آخر ہوتا تھا ان کا حکم لازم۔

مصباح اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

اندھیری رات میں
 سیاہی کے جال میں
 کوئی دھوکا دیتا ہے
 کوئی رشتہ مٹتا ہے
 اندھیری رات میں۔۔۔



وہ جب گھر پہنچا تھا رات کے اڑھائی کا وقت ہو رہا تھا۔ ہر ذی روح خواب و خرگوش کے مزے لوٹنے میں مگن تھی اور سناٹا چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ صوفے پر پھینکی پھر ایک تھکن بھری نگاہ اوپن ایئر کچن پر ڈالی جس میں لاؤنج کی مریل سی روشنی بکھری پڑی تھی۔ یہاں یعنی کونٹہ میں اس کا دوسرا دن تھا اور ان دو دنوں میں اس نے دونوں وقت باہر سے ہی کھانا کھایا تھا۔ گروسری کا خیال قطعی نہیں آیا۔ اس لیے اس کی زحمت بھی نہیں کی مگر اب اپنی کاہلی پر شدید تاؤ آ رہا تھا کیونکہ اب پیٹ بڑی شدت کے ساتھ دہائیاں دے رہا تھا۔ وہ رات کا باسی تھا۔ اسے رات میں جاگنا رات میں کھانا بہت پسند تھا۔ حالانکہ وہ اس کے صحت پر مضر اثرات کو بھی اچھے سے جانتا تھا مگر کیا کرے عادت سے مجبور تھا۔ کمال کی بات تو یہ تھی اسے پورے دن کو چھوڑ رات کو ہی بھوک لگتی تھی وہ بھی اشتہا انگیز بھوک جو اس سے بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے اس کا کچن اکثر و بیشتر رات کو ہی مہک رہا ہوتا تھا۔ حق ہا اس کے اپنے گھر کا کچن، نت نئی اشیا سے بھرا ہوا فریج اور بکھرا ہوا کاؤنٹر۔

”انف کیا کروں اب، چپس سے میرا کیا بننا ہے بھلا۔“ گردن کی پشت کو کھجلا کر اس نے بیک میں ٹھونسنے چپس کے پیکٹس کو دیکھا پھر اس کے دماغ میں جھماکا ہوا تھا خوشگوار جھماکا۔

اس نے اپنا فون اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور فون اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جو کچھ دیر قبل ہی سونے کیلئے لیٹی تھی اپنے فون کی جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھ نیم کروٹ کے بل لیٹی، فون میں جھانکا، نام پر نظر پڑتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا پھر بھی ناچار اس نے کال پک کر لی۔
 ”سنو کیا بنایا ہے تم نے؟“ قبل اس کے وہ کچھ بولتی سلام دعا کچھ بھی قیس کا سوال برجستہ تھا۔
 ”کیا؟“ حیرت سے دریافت کیا۔ گھڑیاں کی ٹک ٹک پورے کمرے میں زور و شور سے جاری تھی۔

”افوہ! کیا پکایا تھا تم نے آج، یہ پوچھ رہا ہوں۔ مجھے بہت تیز بھوک لگ رہی ہے جلدی سے بتاؤ۔“ شیزل کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے تنک کر کہا۔
 ”رات کے اڑھائی بجے اس بے تکی کال کا جواز نہیں بنتا۔ حد ہو گئی یعنی۔“ اس کے تنفر سے کہنے پر قیس نے گردن کو پیچھے کی جانب گرایا تھا۔ وہ بھوک کا چور ہے یہ بات وہ اچھے سے جانتی تھی لیکن اس سے شناسائی کو بھی تو عرصہ گزر چکا تھا۔ اب تو جیسے ایک زمانہ محسوس ہوتا تھا۔
 ”کھانا گھر میں پڑا ہے یا نہیں بس یہ جواب دے دو، باقی مجھے کچھ نہیں سننا سنیمنہ نہیں بچا مجھ میں۔“ شیزل کا دل کیا تھا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ جانتی تھی وہ کچھ بھی کہہ لے اس کی بات کھانے سے شروع ہو کر اس وقت کھانے پر ہی ختم ہونی تھی۔ اس لیے خود کو سمجھا بجھا کر بولی۔
 ”کل کا ہے۔“ اسپیکر سے خوشگوار سی آواز گونجی۔

”چار دن کا بچا ہوا بھی چلے گا بس تم گرم کر کے رکھو میں ابھی آیا۔“
 کال منقطع ہو چکی تھی۔ شیزل نے فون بیڈ پر پرے پھینکا پھر کمبل کندھے تک تان کر لیٹ گئی۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے اسے آنکھیں بند کیے جب ایک عجیب سے احساس نے اسے خود کے حصار میں لے لیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی، وقت دیکھا، کلانی میں موجود سپرنگ بیڈ کو

بالوں میں ہاف بن کی صورت جوڑا، پاؤں بیڈ سے اتار کر سلپرز پہنے اور کمرے سے باہر آگئی۔ خالی کچن رات کے اس سے بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس نے فریج کھولا۔ زرد روشنی اس کے چہرے پر افشاں کی طرح بکھر گئی۔ اس نے چند ایک باؤل نکال کر کاؤنٹر پر رکھے۔ اوون آن کیا ساتھ ہی برز بھی جلا دیا۔ پین میں پانی بھر کر اس میں اس نے سلور کی پلیٹ کو رکھا۔ اس کے اندر تین دن قبل خریدے گئے ایک رول رکھے اور پھر اس پر ٹرانسپیرنٹ ڈھکن ڈھک دیا۔ وہ کھڑی کاؤنٹر پر انگلیوں کو بجا رہی تھی جب کچھ دیر میں ہی اوون کی سیٹی بج اٹھی۔ اس نے اس میں سے کھانا نکال کر کچن میں موجود سفید چھوٹی سی گول میز پر رکھ دیا جس کے گرد تین کرسیاں بچھی تھیں۔ یہ اس کی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے درمیان میں بوسیدہ چنبیلی کا پھول چھوٹے سے شیشے کے داز میں پڑا ہوا تھا۔ سفید کروشے سے بنی فوڈ میٹ تھی جس کے درمیان میں پلیٹ رکھنے کے بعد وہ دائیں بائیں فورک اور چمچ رکھ رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا چہرہ سپاٹ تھا جبکہ دل پرانی یادوں سے بھرا ہوا۔ اس نے کھانا میز پر چن دیا تھا۔ ابھی وہ جگ میں پانی بھر رہی تھی جب کال بیل بج اٹھی۔ کال بیل بجنے کے ساتھ ہی اس کے دل میں ٹھنڈا سا احساس پیدا ہوا تھا۔ زبان خشک ہونٹوں پر پھیر کر اس نے بجی ہوئی میز کو دیکھا۔ کتنی ہی پرانی یادیں تھیں جو ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ کتنے ہی لمحات تھے جو اس وقت یاد آ رہے تھے۔ اس نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ کال بیل دوبارہ بجی تھی۔ اس نے قدم دروازے کی سمت موڑ دیے۔

”مجھے لگا ارادہ بدل گیا ہے تمہارا واللہ اگر ایک منٹ لیٹ آتیں تو میں چلا جاتا۔“ دروازہ کھولنے پر خوشگوار چہرے کے ساتھ اسے یہ الفاظ سننے کو ملے تھے۔ وہ اسے کہنا چاہتی تھی ”تو چلے جاتے نہ رکھتے تاکہ میری اذیت بھی کم ہوتی۔“ مگر اس نے نہیں کہا بلکہ سائیڈ پر ہو کر اسے

اندر آنے کی اجازت دی۔

”بائی داوے یہ تمہارے لیے۔“ سرخ قدرے مرجھایا ہوا پھول اندر آنے کے بعد اس نے شیزل کے چہرے کے آگے کیا تھا۔ رائیل بلیوٹی شرٹ کے گلے میں اٹکے اس کے گلاسز میں شیزل کا سپاٹ چہرہ نظر آ رہا تھا۔ قیس نے ابرو اوپر چڑھا کر گرائے۔

”اکیچو کلی تازہ نہیں ملا جہاں میں رہتا ہوں وہاں کی بیک سائیڈ پر ان پھولوں کا باغیچہ ہے۔ تم کسی دن آنا میں دکھاؤں گا تمہیں۔“ تاہنوز سپاٹ چہرہ، ٹھنڈا سا احساس قیس کے دل میں بھی بھرنا شروع ہوا تھا مگر پیٹ کی دہائی تھی کیسے اگور کرتا، جھٹ سے خوشبو کے تعاقب میں روشن کچن میں آیا جو مین ڈور کے انتہائی دائیں جانب تھا۔ اوپن ایئر کچن میں پہنچ کر اس نے سنک میں ہاتھوں کو دھویا پھر فریج کے ساتھ دیوار پر لگی مشین کے آگے ہاتھ کیے۔ گرم ہوانکلی تھی جس نے اس کے ہاتھوں کو سکھا دیا تھا۔ وہ انہیں رگڑتا ہوا سفید رنگ کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھا اور ایک نظر تمام چیزوں پر ڈالی ڈمپلنگز، بروکلی بیف، اورنج چکن وودھ چپاتی اور ایک رولز ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد اس نے پرمسرت انداز میں شیزل کو دیکھا جو سینے پر ہاتھ باندھ کر کچن میں آرہی تھی۔

”اورنج چکن میرا فیورٹ ہے آج کچھ اور مانگ لیتا تو وہ بھی مل جاتا، پورے راستے میں یہ سوچتا آ رہا تھا کہ کاش مجھے اورنج چکن اور ایک رول کھانے کو مل جائیں اور ہیروی گو، خوش کر دیا آپ نے مجھے۔“ پلیٹ کو سیدھا کرتے ہوئے وہ بولے جا رہا تھا۔ اس نے گلاس میں پانی بھر کر اسے لبوں سے لگایا جب شیزل کی کھر دری سپاٹ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”کھانا کھانے کے بعد لائیٹ آف کر کے جانا۔“ وہ مڑ رہی تھی جب قیس نے پلیٹ میں اورنج چکن نکالنے کے دوران اسے روک دیا۔

”جوائن نہیں کرو گی، کھاؤ مت بیٹھ جاؤ صرف۔“ شیزل کا اوپر نیچے ہلتا جبر اس کے ضبط کی نشانی تھا۔ اندھیرے اپارٹمنٹ میں اس وقت صرف کچن کی لائٹ ہی آن تھی جس نے تھوڑا سا لاؤنج کو بھی منور کر دیا تھا۔

”اتنا کر دیا ہے تو احسان مانو زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور یاد رکھنا یہ آخری بار ہے۔“ لفظ نہیں تھے لہجہ تھا جس نے قیس کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس نے بھنچے ہوئے لبوں سے سرسری سی نگاہ کھانے پر ڈالی۔

”آخری بار کی بھی زحمت نہ کرو، معذرت آپ کو اس وقت تکلیف دی۔“ کرسی کو پیچھے کھسکا کر وہ کھڑا ہوا تھا۔ شیزل نے معمولی سا بوکھلاتے ہوئے میز پر موجود گرم کھانے کو اور پھر اسے دیکھا۔

”خبردار اگر بنا کھائے گئے تو، رات کے اس وقت مجھے بستر سے اٹھا کر مجھ سے کھانا گرم کروانے کے بعد اب یوں جا رہے ہو، تمہاری میڈ نہیں ہوں جو تمہارے نخرے برداشت کروں گی۔ میرا آدھا گھنٹہ قیمتی تھا جو تم نے ضائع کر دیا ہے اس لیے فنانس ان سب کو کھا کر اپنا پیٹ بھرو اور پھر جاؤ۔“

جیکٹ کے بازو جو وہ کھانا کھانے کیلئے چڑھا چکا تھا نیچے کرتا ہوا کچن سے باہر آیا۔ شیزل کے دل میں پھر سے برف بھرنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ اس کو کراس کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”پیٹ تو میرا بھر چکا ہے اور معذرت میں نے اسی لیے کی ہے کہ آپ کو زحمت ہوئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ شیزل اسے خود کے پاس سے گزرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ سر جھکائے وہ بازو ٹھیک کرتا ہوا وہاں سے جا رہا تھا۔

”رک جاؤ قیس، کھا کر نہیں جا رہے ہو تو ساتھ لے کر جاؤ، میرے گھر میں رزق کی بے

حرمی نہیں ہوتی۔“ تلخ سی مسکان کی آواز تھی جو شیزل کی سماعت سے ٹکرائی۔

”رزق کی بے حرمتی نہیں ہوتی ہاں مگر دل کی اور جذبات کی بے حرمتی ضرور ہو جاتی ہے، ہے نا۔“ وہ ویسے ہی سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ رخ اس کا کچن کی میز کی جانب ہی تھا۔ اپنے عقب میں سے اسے مدھم، شکوہ کرتی آواز سنائی دی اور پھر کچھ سیکنڈز کے بعد دروازے کی بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ جونہی دروازہ بند ہوا شیزل کی آنکھوں سے انجانے سے دو آنسو ٹپکے تھے۔ سپاٹ ستا ہوا چہرہ، سمندر میں ڈوبی آنکھیں اور میز پر چنا ٹھنڈا ہوتا کھانا، اس کے دل میں ہوک اٹھی، ایسا درد ہوا جیسے کوئی کند چھری سے اس کے وجود کو کاٹ رہا ہو۔ تکلیف تھی شدید تکلیف۔



”حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔“ (القران 46:22)

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”رتبہ۔“

”تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”وہ کہتا ہے بیس سال۔“

”کون کہتا ہے؟“

”وہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔“ کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے انسان کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی آسودگی بھری نمی۔

”تمہیں کیسے پتا وہ تم سے محبت کرتا ہے۔“ پیلی جلد والی لڑکی نے انگلیوں کو مروڑا۔

”پتہ نہیں، بس مجھے ایسا لگتا ہے۔“

اسکرین پر ابھرے رتبہ کے چہرے کو اس انسان نے زوم کیا۔ سیاہ آنکھوں میں خوف تھا۔ خوف کے ساتھ زندگی کی رمت بھی، سوال کرنے والے نے سوال جاری رکھے اور اپنے دوست کو وہ کرنے دیا جو وہ کر رہا تھا یعنی محویت سے اسے دیکھنا۔

”کیا تم بھی اس سے محبت کرتی ہو؟“ سوال پر اس کی محویت ٹوٹی تھی۔ تعجب اتنا تھا کہ وہ تحیر کے زیر اثر اپنے دوست کو دیکھتا رہا جو اس کے برابر بیٹھا پھر سے اپنا سوال دوہرا رہا تھا۔

”مجھے بتاؤ رتبہ کیا تم بھی اس سے محبت کرتی ہو؟“ آنکھوں کی پتلیاں پھر سے اسکرین پر موجود چہرے پر جمیں، سماعت جواب کیلئے بے چین ہوئی۔

”مجھے لگتا ہے ہاں۔“ وہ جو اسکرین کے پار بیٹھا تھا اس اعتراف پر آبدیدہ ہو گیا لیکن اس نے خود کو کنٹرول کر لیا۔ نچلے لب سختی سے دانتوں میں لیے۔ گردن کی اوپر نیچے ہوتی ہڈی کے ساتھ وہ اسے تکتا رہا جس کی دراز پلکوں والی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

”تو کیا تم اس کے ہمراہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو۔“ اس سوال کے جواب نے ان دونوں کو ٹھٹکایا تھا۔

”محبت کا مطلب آزادی نہیں ہوتی، محبت قید کا نام ہے۔ جس کے قید خانے کی سلاخیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ آپ چاہ کر بھی انہیں توڑ نہیں پاتے۔ جو ایک بار اس کا قیدی بنتا ہے پھر وہ تاحیات تک قیدی ہی رہتا ہے۔ چاہ ہو یا نا ہو رہائی نہیں ملتی پھر۔“ سوال کرنے والے نے پھر سے سوال کیا۔

”تو کیا تمہیں اس قید کی چاہ ہے یا تم بھی سمجھوتا کر رہی ہو۔“ وہ مسکرائی تھی جیسے بچوں کی باتوں پر مسکرایا جاتا ہے۔

”سمجھوتا ناپسندیدہ انسان اور ناپسندیدہ رشتے پر کیا جاتا ہے۔ ہر وہ رشتہ جسے صرف دل پر بوجھ رکھ کر برتا جائے یا ہر وہ انسان جو طبیعت پر گراں گزرے سمجھوتے کے بیٹھے لفافے میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ جسے چکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو اگل جانے کے قابل ہے۔ جبکہ اس سب کے برعکس وہ انسان تو میرے لیے انمول ہے اللہ کا بہترین تحفہ۔“ لفظوں کی چاشنی، لہجے کی وارفتگی، دھڑکتا ہوا دل اور جھپکتی ہوئی پلکیں، سفید کوٹ والے نے اپنے ساتھ بیٹھے دوست کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما جو اس نے اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔

”زادِ راہ کیا ہے؟“ اس بار سوال دوست کی جانب دیکھ کر کیا گیا۔ جواب پر دونوں کو جھٹکا لگا تھا۔

”زندہ ان۔“ کا نپتی تھوڑی، لرزتا لہجہ مایوسی کی انتہا۔

”ایسا نہیں ہے رتبہ، کوشش تو کرو۔ خوشیاں منتظر ہیں تمہاری بس ایک قدم صرف ایک قدم۔“ اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ہتھیلی سے پونچھا پھر متانت سے گویا ہوئی۔

”شناسائی آواز تک ہی رہے تو بہتر ہے میری بصارت وجود کی قائل نہیں۔“ جذبات سے بوجھل چہرے والا اس کی بات سن کر، احساسات جان کر سر کو جنبش دے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے سیل فون میں کچھ ٹائپ کر کے اسکرین سفید کوٹ والے کے آگے کی۔ اس پر لکھی تحریر پڑھ کر وہ مسکرایا، لب اسپیکر کے قریب لے جا کر ہلائے۔

”ٹھیک ہے مجھے ابھی تمہارے محسن کا میسج آیا ہے۔ اس نے کہا ہے رتبہ سے کہو کچن بہت گندا ہو گیا ہے۔ اس کی صفائی کرنے کے بعد وہ سارا کچرا پارٹمنٹ سے باہر کارڈور میں رکھی یوزمی میں ڈال دے کیونکہ اگلے دس منٹ بعد خا کرو ب اس کو خالی کر جائے گا۔ تب تک کیلئے اپنا خیال رکھنا۔“ یہ آرڈر سن کر رتبہ کے اوسان خطا ہو گئے قبل اس کے وہ کچھ کہتی کال منقطع

ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے صوفے کے ہتھوں کو تھاما اور ڈر سے پاؤں سینے سے لگا لیے۔
 ”کیا لگتا ہے وہ کرے گی؟“ سفید کوٹ والے نے سوال کیا۔

”اسے کرنا ہی ہوگا۔“ روشن آنکھیں پیلے چہرے والی کو دیکھ رہی تھیں جو اپنا نچلہ لب چباتی خوف کے ساتھ آنکھوں کی پتلیوں کو ہلا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا مری پاؤں دھاگوں والے سبز رگ پر رکھا۔ سفید پولکا ڈوٹس والا سیاہ ٹراؤزر رگ کو چھونے لگا تھا۔ وہ گھبراتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی۔ کچن کی طرف جاتی ہوئی وہ ان دونوں کو دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ جیسے وہ صدیوں سے چلتی آرہی تھی۔ جیسے اسے مزید کئی صدیوں تک چلنا تھا۔ وہ کچن میں پہنچ گئی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ کچن میں دوڑائی جو بالکل صاف تھا۔ ہاں البتہ ڈسٹ بین کچرے سے بھر چکی تھی۔ ایک دو چاکلیٹس کے ریپرز زمین پر بھی گرے ہوئے تھے۔ اس نے انگلیوں تک آتی سیاہ جرسی کو کلائی تک چڑھایا پھر ان ریپرز کو چن کر ڈسٹ بین میں ڈال دیا۔ پھر اس کے کناروں سے سیاہ شاپر کو الگ کیا۔ اس کے دونوں سروں کو تھام کر وہ شاپر باہر کھینچ رہی تھی۔ ڈسٹ بین اندر سے بالکل صاف تھی ایسی جیسے ابھی ابھی خرید کر لائے ہوں۔ کچرہ سارا شاپر میں ہی تھا۔ وہ اس شاپر کو پکڑتی بے بی اسٹپس کے ساتھ مین ڈور کی طرف بڑھنے لگی۔

”یا مقلب القلوب، یا مقلب القلوب، یا مقلب القلوب۔“ اس کے لب برق رفتاری سے تھر تھرا رہے تھے۔ اس کا پاؤں ایک بار صوفے کے کنارے سے ٹکرایا تھا جس کا درد کیمرے کے اس پار بیٹھے شخص نے اپنے دل میں محسوس کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کھلے بالوں والی لڑکی ڈھیلا ڈھالا شرگ پہنے دروازے کی سمت بڑھ رہی ہے۔ اس کے شرگ کا ایک شانہ کندھے سے اتر کر لٹکا ہوا تھا تبھی اس شانے پر سے پولکا ڈوٹ والی شرٹ کا کالر جھانک رہا

تھا۔ بھینچے لب، بے چین نظریں اور چنگھاڑتی سوچ، وہ ر کے ہوئے سانس کے ساتھ اسے مین ڈور کی، کی ہول سے باہر جھانکتا دیکھ رہا تھا۔

”اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوتا۔“ سفید کوٹ والے نے کہا جبکہ اس کے ساتھ بیٹھا اس کا دوست بالکل خاموش رہا تھا۔ وہ تو بس دل تھا مے اسے وہاں شش و پنج میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے پندرہ منٹ وہاں کھڑے ہو کر گزارے تھے۔ اور پندرہ منٹ تک وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا تھا۔ پھر آخر کار اس نے اپنی لرزتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ دروازے کی سائیڈ پر لگے بٹنوں کو دبایا، پاسور ڈائینٹر کرنے کے بعد وہ دروازے کا لاک کھول رہی تھی۔

”کم آن، کم آن، کم آن۔“ کیمرے کے اس پار بیٹھے انسان نے اپنی کمر کو کرسی کی پشت سے آزاد کروایا۔ اس کا دل تو اتر کے ساتھ دھک دھک کر رہا تھا۔ آنکھیں اس منظر میں قید ہو کر بالکل ساکت ہو چکی تھیں۔ اس کے ریٹینا پر جو منظر ابھر رہا تھا وہ دکھا رہا تھا کہ ڈھلکے ہوئے شانے والی لڑکی نے دروازہ تھوڑا سا داکر کے اپنا سر باہر نکالا ہے۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ کاریڈور سنسان پڑا تھا بالکل خاموش، اس نے اپنا ایک قدم باہر نکالا۔ خوشی کی انتہا پر وہ دونوں تھے جو اسے دیکھ رہے تھے مگر ان کی خوشی وقتی تھی صرف کچھ سیکنڈز کی کیونکہ ابھی اس لڑکی نے دوسرا پاؤں ہی باہر نکالا تھا کہ لفٹ کی مخصوص آواز وہاں ابھری اور ایک آدمی اس کے کھلتے دروازے سے باہر آیا۔

”اسلام علیکم۔“ گرم جوشی بھرا سلام تھا جس پر وہ الٹے قدموں اندر کی طرف دوڑی تھی۔ دوڑنا کم بلکہ گرنا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ آدمی لڑکی کی حالت دیکھ کر گھبرا کر واپس لفٹ کی سمت لپکا تھا۔

”شٹ۔“ سفید کوٹ والا اپنے ساتھ بیٹھے انسان کو اس لفظ کے بعد بھاگتے ہوئے دیکھ

رہا تھا۔ بس چند سیڑھیوں بعد ہی تو اس کا اپارٹمنٹ تھا جنہیں دھپ دھپ کر کے پھلانگتا ہوا وہ سفید دروازے کے سامنے آ کر رکا۔ اس نے جلدی سے پاسورڈ لگا کر دروازہ ان لاک کیا اور والہانہ انداز میں چیختی ہوئی رتبہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کچرے کے درمیان زمین پر گری وہ بلند انداز میں پاگلوں کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے تھے جو اس انسان کے سینے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ کچرے پر بیٹھا اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے سہلا رہا تھا۔ اسے چپ کر وارہا تھا۔ ”شش، شش، رتبہ، شش، شش۔“ وہ اسے سنبھال رہا تھا مگر وہ تھی کہ سنبھل کر ہی نہ دے رہی تھی۔

”کوئی نہیں ہے صرف میں ہوں، صرف میں۔“ وہ تاہنوز چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن ایسی تھی جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے مزید چیختی ہوئی لڑکی کو اپنے اندر سمولیا۔ اس پر خود بھی رعشہ طاری ہونے لگا تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔“ وہ اسے حتی المقدور سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور بری طرح سے اس کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ اس نے لب بھینچ لیے۔ آنکھوں میں قدرتی نمی کے علاوہ بھی مزید نمی ابھر آئی تھی۔ بری طرح دھاڑتے ہوئے، ہاتھ پاؤں مار کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا آج کے بعد وہ اپنے ٹریٹمنٹ میں پھر سے چھ ماہ پیچھے چلی گئی ہے۔ وہ جانتا تھا وہ اچھے سے جانتا تھا۔

”موت ہے سب کی، موت ہے۔“ اس کے ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے کے بعد وہ گلے میں خراشیں ڈال کر چلایا تھا۔ سفید کوٹ والے نے شانے ڈھلکا کر بے بسی سے دونوں کو دیکھا پھر ایک آہ لبوں سے خارج کر دی۔



صبح چڑھ چکی تھی۔ سفیدی پھیل چکی تھی۔ سب نکھر نکھرا تھا۔ سب اجلا اجلا تھا۔ اس اجلے سے دن میں جہانگیر یوں میں سگار کو تھا مے عمیق سوچ میں مبتلا تھے جب خانساں نے آکر اپنے لفظوں سے انہیں جھنجھوڑ دیا۔

”صاب، آج کی دعوت کیلئے کیا بناؤں؟“ وہ اپنی سوچوں سے چونکے پھر انگوٹھیوں بھرے ہاتھ کو ہلا کر گویا ہوئے۔

”مصباح سے پوچھیں؟“ دھوئیں کے پیچھے چھپے چہرے سے جو جواب ابھرا تھا بڑا ہی مدہم سا تھا۔

”صاب وہ کہتی ہیں آپ کے یہ مہمان نئے ہیں اس لیے ان کے ذائقے کا انہیں نہیں پتا۔“ جہانگیر کی گردن ہولے سے ہلی۔ خاموشی میں آواز ابھری۔

”ہم، پاکستانی ڈشز ہی بناؤ مگر یاد رہے کھانا ذائقے دار ہونا چاہیے آج کی دعوت پر ایم این اے مدعو ہیں۔ معیار انہیں کے حساب سے ہونا چاہیے۔“ ضعیف خانساں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر، بے فکر رہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ ہدایت سن کر، تسلی دلا کر وہ جھجھکتے ہوئے وہاں سے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جہانگیر نے ایک اور کش بھرا بھی اس نے دھواں چھوڑا ہی تھا کہ دھوئیں کی اوٹ سے ایک وجود نظر میں آیا جو کھڑکی کے اس پار پودوں کے قریب موجود تھا۔ سبز فراک، سرخ پونیاں اور سرخ ہی ناک جوتلی کے پھول کو سونگھ رہی تھی۔ کھڑکی کے دائیں بائیں بھاری پردے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سفید پردے جہانگیر کی آنکھوں میں نہیں تھے نہ ہی کھڑکی پر نصب شیشہ، ان کی نظروں میں ان کی بیٹی تھی جوتلی کو سونگھنے کے بعد مسکرا رہی تھی۔

”سر، آپ کے لاک کو لکڑی کی چابی سے کھولا گیا ہے۔ لکڑی کے چند چھلکے لاک کے اندر موجود تھے۔ چابی بنانے والا ذہین ہونے کے ساتھ تھوڑا ناڑی بھی تھا تبھی اس کے چھلکے لاک کھولتے ہوئے اس میں اٹک گئے ورنہ پختہ انسان سے ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں۔“ ان کی بیٹی نے وہ پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگایا تھا۔ مگر پھول توڑنے سے پہلے وہ آس پاس نظر دوڑا رہی تھی تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ جہانگیر اپنی جگہ سے اٹھے، چند قدم پاٹ کر وہ کھڑکی کی طرف آئے۔ اس کا شیشہ سر کا یا اور بھاری آواز فضا میں منتشر کی۔

”نیں اندر آؤ۔“ عرصے بعد انہوں نے اپنی بیٹی کو پکارا تھا عرصے بعد ہی وہ جی جان سے ڈری تھی۔

”گھبراؤ نہیں کچھ بات کرنی ہے۔“ لہجے میں محبت کا ٹھانھیں مارتا سمندر تھا۔ وہ بچی انگلیاں چٹخاتی کھڑکی کے قریب آئی کہ شاید اس کے بابا یہیں سے بات کر لیں مگر اس کے بابا نے وہ کیا جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ لمبا چوڑا شخص تھوڑا سا جھکا۔ اسے کمر سے تھام کر اٹھایا پھر اپنے قریب اندر کھڑا کر دیا۔ خود وہ کھڑکی کے قریب رکھی دراز پشت والی کرسی پر براجمان ہو گئے تھے۔ نیلے رنگ کی ایک ہتھالی عالیشان کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے جو پتہ نہیں کتنے سالوں بعد اپنے باپ کے لمس سے آشنا ہوئی تھی۔ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

”بابا نے لکڑی کا کام آپ کو بھی سکھایا تھا نا؟“ سوال تھا یا صور، اس کا سانس پھول گیا۔ چھوٹا سا دل پسلیوں میں دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ جہانگیر نے اس کی خطا پکڑ لی اور دکھ نے جہانگیر کا سینہ۔

”جواب دو۔“ مجرمانہ انداز میں ہلتے ہوئے سر نے شک کو یقین کی چادر اوڑھادی اور

جہانگیر کو تاسف کی چادر۔

”ایسا کیوں کیا بیٹا، پیسے چاہیے تھے تو مجھ سے کہہ دیتی، چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ بیٹا لفظ پر نین کے نین سے اشک چھلک اٹھے۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے سرخ ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیے۔

”ایک بار مجھ سے کہتی تو سہی، گناہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس بچی نے اپنی باغی آنکھوں کو اوپر اٹھایا۔ سرخ لبوں کو دانتوں کی قید سے آزاد کرتی وہ کہہ رہی تھی جو کہ یہ تھا۔

”آئندہ ایسا نہیں ہوگا صاب۔“ جہانگیر کے کلیجے پر برچھی چلی تھی۔ وہ یکدم کرسی پر سے آگے ہوا، جھٹکا شدید تھا دکھ طویل۔

”کیا کہا؟ صاب؟“ اسے لگا شاید اسے سننے میں مسئلہ ہوا ہے۔ اسے لگا سامنے کھڑی اس کی بیٹی نے شاید غلط بول دیا ہے۔ مگر اس کے سب اندازے دھڑکے دھڑکے رہ گئے۔ اس نے وہی سنا جو اس کی بیٹی نے کہا تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔

”صاب جی، ماما کے آپریشن کیلئے پیسے مانگے تھے ڈاکٹر نے ماما نے منع کر دیا تھا اس لیے میں نے۔“ جہانگیر نے تڑپ کر اس کی بات درمیان میں قطع کی۔

”صاب جی نہیں نین بابا کہو مجھے باپ ہوں تمہارا۔“ اس بچی نے اپنی ماں کو پھر سے نظر انداز ہوتے دیکھا۔ اس بچی کے دل میں سامنے موجود انسان کی عزت اور کم ہوئی۔

”باپ غافل نہیں ہوتے۔“ توقف۔“ صاب جی۔“

جہانگیر کو لگا کسی نے کیچڑ سے بھرا جوتا اس کے منہ پر دے مارا ہے۔ اس کی دولت، شان و شوکت، رتبہ جاہ و جلال اس کا اس معاشرے میں مقام سب، سب کے سب اس پر تھو تھو کر رہے ہیں۔ اس کا دل کھڑے قد سے نیچے گرا تھا۔ مگر وہ بیٹھا رہا ایسے جیسے اب کبھی نہیں ہل

پائے گا کبھی بھی نہیں۔

”نہیں، آپ مجھ سے نفرت کرتی ہو۔“ بچی نے جس انداز میں اسے دیکھا وہ وہیں ڈھسے کر رہ گیا۔ وجود پر کئی گھاؤ لگ چکے تھے۔ روح بے طرح سے زخمی ہوئی تھی۔ نہیں کے جانے کے بعد دروازے کی اوٹ میں کھڑا ان کا بیٹا اندر آیا۔ کمر کی پشت پر ہاتھ باندھے پھر باپ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھا۔

”اسے کیوں رلایا؟“ جواب کرخت سا تھا۔ درشتی میں لپٹا ہوا۔

”وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے یار۔“ تھکن سے چور کر لاتا ہوا لہجہ، جارحیت بھرا سوال۔

”اسے کیوں رلایا؟“ وہ چیخ رہا تھا جہانگیر نے نئے جھٹکے کیلئے خود کو تیار کر لیا۔ اس کا کم گو بیٹا جو ایک نظر نہیں کو دیکھ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ جو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا نوٹس ہی نہیں لیتا تھا آج اس کیلئے باپ کے سامنے چیخ رہا تھا۔ اس باپ کے سامنے جس کے آگے کسی کی چوں کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

”وہ میری بہن ہے اس کے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے، جو بھی اسے رلائے گا میں اسے چھوڑوں گا نہیں یہ بات یاد رکھنا آپ۔“ انگلی اٹھا کر انہیں وارن کرتا ان کا پر توں وہاں سے بھاگنے والے انداز میں جا رہا تھا۔ جہانگیر ہکا بکا اپنے بیٹے کو وہاں سے جاتا ہوا دیکھتے رہے جو دروازے کے قریب پہنچ کر رکا، مڑا اور ایک اور حقیقت ان پر اگل کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ حقیقت جس نے جہانگیر کو ششدر کیا تھا یہ تھی۔

”اور چابی میں نے بنا کر دی تھی اسے کیونکہ اصل والی آپ کے پاس تھی۔ غلطی اس کی کہ اس نے رات کے اندھیرے میں پیسے لیے، وہ دن میں سب کے سامنے جا کر لے سکتی تھی کیونکہ یہ سب میرا ہے اور میں نے اسے اجازت دی تھی۔“

جہانگیر کیا رد عمل پیش کریں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کا چھوٹا سا بیٹا جو اپنی عمر سے بڑا دکھتا تھا ان پر رعب جما کر جا چکا تھا۔ اور وہ لبوں پر قفل لگائے اسے وہاں سے جاتا ہوا دیکھتے رہے تھے۔

وہ چھوٹا سا لڑکا جس نے سفید کرٹڈی کے سوٹ پر سیاہ واسکٹ پہنی ہوئی تھی اپنے باپ کے کمرے سے نکل کر لان کی بیک سائیڈ پر آیا جہاں وہ فاؤنٹین سے ٹیک لگائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہاتھ جوں کے توں پشت پر بندھے تھے۔

”رو نے کیلئے مناسب جگہ ہے یہ۔“ بچی نے کرنٹ کھا کر سر اٹھایا پھر مٹھی میں گھاس بھر کر انہیں جڑ سے کھینچنے کے بعد اس پر اچھال دی۔ کرٹڈی کے سوٹ پر چھوٹے چھوٹے داغ لگ چکے تھے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا جوں کا توں کھڑا رہا۔

”جاؤ یہاں سے تم، سیٹھ صاحب۔“ سیٹھ صاحب اس نے نہایت ہی کڑوے کیلے لہجے میں کہا۔ وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا۔ اس کا گندا، کچڑا اور گیلی گھاس سے بھرا ہاتھ اٹھا کر اپنے اجلے کپڑوں پر مسل دیا۔ ہاتھ قدرے صاف ہو چکا تھا اور کپڑے داغ دار۔

”نہیں جاؤں گا۔ مارنا ہے مار لو مگر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“ جیل سے جے بالوں والا اپنی روتی ہوئی بہن کو دیکھ کر خود بھی رو ہانسا ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کا بھائی اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ بھی تو اسے بے حد چاہتی تھی۔ لیکن کیا فائدہ تھا ایسی چاہتوں کا جن میں فرق بہت زیادہ تھا بہت بہت زیادہ۔

”تم میرے اچھے بھائی ہونا تو پلیز یہاں سے چلے جاؤ۔“ ملتی لہجہ، ڈھیر ساری ہچکیاں۔

”میں نہیں جاؤں گا مینی، یہ بات تم جانتی ہو۔“ وہ وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے اجلے کپڑوں کی پرواہ کیے بغیر، اسے یہ ڈر نہیں تھا می کیا کہیں گی یا بابا اسے یوں والہانہ انداز

میں اس کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیں گے۔ اسے یہ فکر لاحق تھی کہ اس کی بہن اس وقت رو رہی ہے اور یہ فکر سب فکروں پر بھاری تھی۔

”پر کیوں؟“

وہ پھیکا سا مسکرایا۔ بچپن کی روشنی اس کی آنکھوں سے چاندنی کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ مگر جو لفظ تھے وہ گہرے تھے بہت گہرے، ایک بوڑھے انسان کی پوری زندگی کے تجربے سے بھی گہرے۔

”کیونکہ میرا دل اندھا نہیں ہے۔“

☆.....☆.....☆

هل رایت اللہ؟

”کیا تم نے اللہ کو دیکھا؟“

نعم، کثیراً

”ہاں، بار بار“

متی؟

”کب؟“

حین سترنی۔

”جب بھی وہ میری پردہ پوشی کرتا ہے۔“

ورزقنی۔

”اور مجھے رزق دیتا ہے۔“

وعافانی۔

”اور مجھے عافیت سے رکھتا ہے۔“

غافل سے دن میں گلے میں فیروزی رنگ کی ٹائی باندھتے ہوئے احد کا ہاتھ لمحہ بھر کورکا۔ اس نے مڑ کر اپنی ماں کو دیکھا جو ٹیبل پر بیٹھی مونگروں کو توڑ رہی تھیں۔ سفید رنگ کی جالی دار ٹوکری اور سفید چٹیل پلیٹ ان کے سامنے دھری تھی۔ پلیٹ میں وہ ٹوٹے ہوئے مونگرے رکھ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ کچھ پڑھے بھی جا رہی تھیں۔ احد نے اپنی ماں کو پکارا۔

”ماں، شیزل پھر سے نظر آئی۔ میری تو کال بھی نہیں اٹھاتی اب۔“ رحمت نے چونک کر سراٹھایا پھر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولیں۔

”نہیں بیٹا آج کل وہ کسی اہم کیس میں پھنسی ہوئی ہے۔ کب آتی ہے کب جاتی ہے کوئی علم نہیں۔“ احد نے پھر سے ٹائی کی گرہیں لگانی شروع کی تھیں۔

”میں اس کا اتنا پرانا دوست ہوں کتنی بری بات ہے۔ ملنا تو دور کی بات میرا فون بھی نہیں اٹھاتی۔“ وہ شکوہ کر رہا تھا جبکہ دوست لفظ پر رحمت کا منہ شدید ترین کڑوا ہوا۔ انہوں نے تھوڑا زور سے مونگرے کو توڑا تھا۔

”لڑکا اور لڑکی کے ساتھ یہ دوست لفظ مجھے شدید ناگوار گزرتا ہے احد، تمہاری اگر اس کے ساتھ کوئی فیملنگز ہیں تو بتاؤ میں تمہارا رشتہ اس کے پاس لے جاؤں گی مگر یہ چونچلے برداشت نہیں کروں گی۔“ ٹائی بندھ چکی تھی۔ ماں کے لہجے کی ناگواریت بھانپتے ہوئے اس نے خود کو ڈریسنگ کی سطح کے ساتھ ٹکایا، پاؤں قینچی کے سے انداز میں بندھ گئے تھے۔ کھلے دروازے سے تھوڑی دور بیٹھی اس کی ماں اسے واضح دکھائی اور سنائی دے رہی تھیں۔

”اگر؟ آپ کو اب بھی ”اگر“ کا گمان ہے تو حیرت ہے۔“ لبوں کی مسکان، آنکھوں کی تپش اس کے ارادوں کی پختگی کا بتا رہی تھی۔ رحمت پر جوش سی ہوئیں۔

”احد، بہت پیاری ہے نا وہ بچی اگر یہاں آجائے تو رونق لگ جائے۔“ پھر وہ یکدم افسردہ ہوئیں۔ احد نے ان کی افسردگی کو پکڑ کر سوال کیا۔

”کیا ہوا چپ کیوں ہو گئیں آپ؟“ شش و پنج میں مبتلا رحمت مدھم سے لہجے میں گویا ہوئیں۔
 ”تمہارے لیے تو مان جائے گی وہ، اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اس کی جاب۔“ ان کی ہچکچاہٹ کو بھانپتے ہوئے احد نے ٹیک کو چھوڑا اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

”ماں، میں جانتا ہوں اس کی جاب اس سوسائٹی میں موزوں نہیں سمجھی جاتی، پولیس واقعی ایک بدنام ادارہ بن چکا ہے اس ملک میں، لیکن ماں جہاں برے لوگ ہوتے ہیں وہاں بہت اچھے بھی ہوتے ہیں۔ ہم ان چند بروں کی بدولت بہت سے اچھوں کو تو اگنور نہیں کر سکتے نا اور رہی بات شینزل کی تو مجھے فخر ہے اس پر، وہ بہت اچھے کام کر رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ آگے بھی ایسا ہی کرتی رہے۔“ ان کے شانوں پر ہاتھ جمائے وہ پرسکون سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

رحمت ہولے سے مسکرائیں۔ سفید بڑی سپاٹ پلیٹ سبز مونگروں سے بھر چکی تھی۔
 ”ٹھیک کہا میرے بچے لیکن اس کے ٹائم کا بھی تو مسئلہ ہے نا آنا جانا کب ہو کچھ پتہ نہیں، شادی کے بعد تو بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ شوہر بچے کیسے منیج کرے گی وہ یہ سب۔“ احد ماں کی معصومیت پر کھلے دل سے مسکرا دیا مسکرانے کے بعد بولا۔

”میری پیاری بھولی ماں، پہلے آپ شادی ہونے دیں بعد میں ان باتوں کیلئے پریشان ہو لینا ابھی میں چلتا ہوں آفس اگر آج کی تاریخ میں آپ کو شینزل مل جائے تو اسے کہہ دینا احد اس سے خفا ہے۔“ ان کے بالوں پر بوسہ دے کر وہ بیگ اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ جہاں وہ

وہاں سے گیا تھا وہیں دور کوئی آیا تھا وہ اور کوئی نہیں قیس تھا جس کے ہاتھ میں سینڈوچ کا سلاکس تھا۔ آخری بائٹ لے کر جب وہ آئی جی کے کمرے میں آیا تو وہاں دو انجان چہروں اور شیزل کو بیٹھے پایا۔ اس نے اپنے لیے کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔

”تو یہ ہیں وہ برخودار جن کے کارناموں کو شاہکار بنا کر آپ نے ہمیں دکھایا تھا۔ کیا فائدہ ان ہنڈرڈ پرسنٹ اچیومنٹس کا جواب تک میرے بیٹے کے قاتل کو ڈھونڈ نہیں پائے۔“ قیس ان کی بات کے اختتام پر تھوڑا سا ہنسا تھا۔ آئی جی نے اسے متنبیہ نظروں سے گھورا۔

”میں جانتا تھا جب میں اندر آیا تھا تبھی جان گیا تھا اس طرح کا کچھ سننے کو ملے گا۔“ مجسٹریٹ عبدالرزاق اس بار بزنس مین خالد نسیم کی جگہ بولے تھے۔ ان کے الفاظ بھی تپش زدہ سے تھے۔

”اگر سو گنھنے کی حس اتنی ہی تیز ہے تو اب تک جھک کیوں مار رہے ہو اوپر سے اپنے ساتھ نالائق لوگوں کو اکٹھا کیا ہوا ہے جنہیں صفائیاں دینے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔“ ان کی نظروں کا رخ اور لفظوں کا وار کس طرف ہوا تھا یہ جان کر قیس نے ہاتھوں کی مٹھی سختی سے پینچی۔ اس سے زیادہ سخت انداز میں بولا۔

”اتنی ہی بے صبری ہے تو خود ڈھونڈ لو قاتل کو ہائیر کرو پرائیوٹ جاسوس اور نکال لو نتیجہ ہم تم لوگوں کی چاکری کیلئے نہیں اپنی ڈیوٹی کیلئے تعینات ہوتے ہیں۔“ پھرتا ہوا لہجہ، تنفر بھرا انداز شیزل نے سرسری سی نگاہ تپے ہوئے قیس پر ڈالی اور پھر مجسٹریٹ کو سننے لگی جو آگ بگولہ ہوتے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ کیا ہے حیدر علی، تم نے کن لوگوں کو رکھا ہوا ہے ڈپارٹمنٹ میں، پھینکوا نہیں باہر ان کی جرات یہ میرے ساتھ ایسے بات کریں۔“ وہ غصے میں پاگل ہو رہے تھے۔ سچوئشن کو آوٹ

آف کنٹرول ہوتے دیکھ شیزل اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”سوری سر، میں ان کی جانب سے آپ سے معذرت کرتی ہوں، دراصل ہم خود بھی۔“
انہوں نے درشتی سے اس کی بات درمیان میں قطع کی انداز بہت ہی ناقابل ہضم تھا۔

”او بس کرو بی بی، تمہاری بکواس سننے کیلئے یہاں نہیں آیا ہوں میں، معذرت کر رہی
ہیں۔“ قیس کے ماتھے پر جالوں کا انبار اکھٹا ہوا تھا۔ وہ کرسی چھوڑ کھڑا ہوا، آنکھوں میں حیرت
اور ضبط کا ٹھانٹھیں مارتا سمندر تھا۔ چہرہ غصے کی آگ میں جھلسا ہوا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی
آئی جی بھی کھڑے ہوئے تھے کیونکہ قیس فقط کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ جارحیت کے سبب کرسی اپنے
پیچھے گرا دی تھی۔

”یہ کس طرح سے بات کر رہے ہو ان سے، کیا لہجہ ہے یہ۔“ غصے سے ابلی ہوئی آنکھیں
کف اڑاتے الفاظ اور غیر متوازن سانس۔

”قیس کول ڈاؤن۔“ حیدر علی کی تنبیہ پر اس نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں روکا۔

”میں ان سے بات کر رہا ہوں انکل، یہ شیزل کے ساتھ اس طرح سے کیسے بات کر سکتے
ہیں۔ ان کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ یہ میرے سامنے اس سے اس طرح سے بات کریں۔ ان
کی ہمت کیسے ہوئی۔“ آخری الفاظ اس نے دھاڑ کی صورت نکالے تھے۔ شیزل کے حلق میں
گولا اٹکا۔ اس نے کرسی کی بیک کو سختی سے تھاما تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس کے خلاف تھی۔ اسی وجہ
سے وہ چاہتی تھی کہ قیس اور اس کا سامنا نہ ہو، وہ جانتی تھی آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں وہ
سب کے سامنے اس کے اور اپنے رشتے کو افشاں کر دے گا۔ وہ رشتہ جو بہت پہلے ختم ہو گیا تھا
وہ رشتہ جس میں ذہنی اذیت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اپنے لیے قیس کا پاگل پن آج بھی برقرار
دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی۔ وہ سہم گئی تھی یہ جان کر کہ آج بھی وہ اس کی چاہت میں بری طرح مبتلا

ہے۔ وہ ششدر رہ گئی تھی یہ جان کر کہ کہیں نہ کہیں دل کے کسی نہ کسی گوشے میں وہ اب بھی اسے چاہتی ہے۔ بری طرح اس کی محبت میں مبتلا ہے۔ ہوتی بھی کیوں نہ وہ اس کا۔۔۔ اس نے دل کو تھپکا اور شکوہ کناں انداز میں حیدر علی کو دیکھا جو اسے ڈپٹ رہے تھے۔

”انسان بنو قیس، اپنے مقام اور ان کے رتبے کو مت بھولو، اسے لے کر جاؤ شینزل۔“ کوئی اور وقت ہوتا وہ ان کی بات نہ مانتی کوئی اور وقت ہوتا تو وہ انہیں جھٹلا دیتی مگر کوئی اور وقت ہوتا تو نا۔

”ایسے کیسے جاؤں میں، انہیں نہیں پتا خواتین سے کس طرح بات کی جاتی ہے اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود یہ اتنی چھوٹی حرکت کر رہے ہیں۔ ان کی جرات کیسے ہوئی شینزل کی انسلٹ کرنے کی۔“ وہ کرسی کے پیچھے سے نکلی کہنی سے اس کا بازو تھاما اور دبی آواز میں بولی۔

”چلو، میں نے کہا چلو یہاں سے۔“ وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے کر جا رہی تھی۔ خالد نسیم نے مجسٹریٹ عبدالرزاق کے طوطے ہوا میں اڑتے دیکھے تھے پھر اس سارے عرصے میں خاموش رہنے والا وہ انسان اپنی آواز گرم کمرے میں بکھیر رہا تھا جو کہ یہ تھی۔

”میرے بیٹے کا کیس یہی لڑکا ہینڈل کرے گا گرم خون ہے، نڈر ہے کھوج لے گا۔“ آئی جی شرمندگی سے کرسی سنبھال گئے۔

”اسے تمیز سکھاؤ حیدر، آج دوستی کے ناطے میں اسے چھوڑ رہا ہوں اگلی بار ایسا ہوا تو اس طرح سے سپینڈ کرواؤں گا کہ پوری زندگی بیٹھ کر روئے گا۔“ آئی جی نے اپنے ٹھٹکے ہوئے ماتھے کو سہلایا پھر انہیں بھی بیٹھتے ہوئے دیکھ گویا ہوئے۔

”تخل رکھو عبدالرزاق، تخل رکھو۔“ خالد نسیم نے چھوٹے ہی کہا تھا۔

”اس لڑکی کا اور تمہارے دوست کے بیٹے، کیا بھلا سا نام ہے اس کا ہاں قیس ان دونوں کا کوئی رشتہ رہ چکا ہے؟“ بہت ہی اٹے سوال پر دونوں ٹھٹھکے تھے۔ ”واویلا اسی بات پر ہوا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ بدکلامی کیوں کی گئی۔ کون رہ چکے ہیں یہ ایک دوسرے کے۔“

آئی جی چند ٹائیے تک خاموش رہے پھر انہوں نے کافی وقت تک کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کے قابل ہوتا تو دیتے نا اس لیے خاموشی میں ہی مصلحت تھی جن کے لیے انہوں نے مصلحت کا دامن تھاما ہوا تھا وہ دونوں آگے پیچھے ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے تھے۔ راہداری چھوڑ کر وہاں جہاں کوئی بھی نہیں تھا شینزل نے اس کے بازو کو جھٹکے سے چھوڑا تھا۔ پھر وہ اس کے سامنے سینے پر بازو باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ قیس نے ہاتھ کھڑا کیا اور کرخت وضبط سے لہجے میں کہنے لگا۔

”اس وقت مجھ میں بالکل بھی سکت نہیں ہے کہ کچھ سنوں تمہیں جو بھی کہنا ہے کل کیلئے اٹھا کر رکھ لو کیونکہ اس وقت میرا دماغ بری طرح سے شارٹ ہے۔“ آنکھیں نیچی تھیں۔ شہادت کی انگلی کھڑی ہوئی، ماتھے پر جال تھا اور پورے بدن سے غصے کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

”تمہیں بد تمیزی نہیں۔۔۔“ قیس نے ٹھاہ کی آواز کے ساتھ ہاتھ جوڑے۔ شینزل ٹپٹا گئی۔ وہ دونوں برآمدے میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سورج کی سنہری کرنیں دونوں کے ہی دائیں شانے سے ہو کر آدھے وجود پر گر رہی تھی۔ پیچھے صحن تھا کشادہ صحن جس کے انتہائی بائیں جانب پولیس موبائلز کھڑی تھیں۔

”خدا کا واسطہ ہیں بخش دیں آج۔“ اس نے آنکھیں اٹھائیں جن میں سرخ دھاگوں کی تعداد بے شمار تھی۔

”انہوں نے درشتی سے بات کی تو تمہیں آگ لگ گئی اور اب جو تم کر رہے ہو اس کا کیا؟“
 قیس نے جڑے ہوئے ہاتھ کھولے شہادت کی انگلی سینے پر سختی سے جما کر بولا۔
 ”شینزل، وہ وہ نہیں ہیں جو میں ہوں آپ کیلئے اور۔“ شینزل کی کاٹ دار بات نے قیس کی
 روح کو کاٹا، کاٹ کر چھیتھڑے چھیتھڑے کر دیا۔

”تم“ ”تھے“ ”قیس“ ”ہو“ ”نہیں اس لیے اپنا طیش، اپنی انسکیورٹی اور اپنا جذباتی پن اپنے تک
 ہی محدود رکھو یہ نا ہو اس بار بھی میں ہی کوئی انتہائی قدم اٹھا لوں۔“ بے مروتی سے کہہ کر وہ وہاں
 سے جا رہی تھی۔ قیس جوں کا توں کھڑا اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ برف ہوتا وجود
 اور سن دماغ بالکل بھی اسے ہدایت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ بت بن گیا تھا
 وہاں پر، اس لیے وہ جم گیا تھا وہاں پر۔

هل رایت اللہ؟

”کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے؟“

نعم، کثیراً۔

”ہاں، بار بار۔“

متی؟

”کب؟“

حین سترنی۔

”جب بھی وہ میری پردہ پوشی کرتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

سورج طلوع ہونے سے پہلے ان کا سکوآڈ خالد نسیم کے گھر پر موجود تھا۔ وہاں اور مجسٹریٹ

عبدالرزاق کے گھر وہ سب پہلے بھی تفتیش کر چکے تھے لیکن اس بار ان کے ہاتھ کچھ لگا تھا جس نے انہیں وہاں آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چیز سی سی ٹی وی کی کرپٹ کی ہوئی ریکارڈنگ تھی جسے انتہائی حساس پوائنٹ پر دوبارہ سے ری سنور کیا گیا تھا۔ اس سی سی ٹی وی فوٹیج میں جس وقت نو عمر لڑکے کو قتل کیا گیا تھا کوئی بیک یارڈ سے ان کے گھر داخل ہوا تھا۔ چوکیدار اور گھر والوں کے بیان کے مطابق اس شام وہ لوگ اپنے رشتے داروں کے ہاں برتھ ڈے پارٹی پر گئے تھے۔ لیکن ان کے بیٹے نے وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اس پارٹی میں نہیں گیا۔ وہ پارٹی میں نہیں گیا تھا لیکن اس کی لاش ہل اسٹیشن سے ملی تھی۔ اس کی کار بھی گھر ہی کھڑی تھی۔ پہلی بار پوچھتاچھ پر چوکیدار نے بیان دیا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر بیک یارڈ میں کھلتے دروازے سے اپنے دوستوں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ وہ دروازہ پچھلے روڈ کی طرف کھلتا تھا اور گھرتک آنے کیلئے شارٹ کٹ پڑتا تھا اس لیے اس کے دوست اسے وہیں سے پک کرتے تھے۔ لیکن اس رات گاڑی کی کوئی بھی آواز نہیں آئی تھی۔ البتہ گھر کے اندر سے بہت تیز میوزک کی آواز آرہی تھی اور یہ بات کوئی غیر معمولی نہیں تھی۔ گھر کے سب افراد رات دیر تک اسی طرح میوزک سننے کے عادی تھے۔ لیکن جب اس کی لاش ہل اسٹیشن سے ملی تو وہ سب بری طرح سے صدمے کا شکار ہوئے تھے۔ پولیس نے سی سی ٹی وی کی ریکارڈنگ ضبط کی تھی لیکن اس میں کچھ خاطر خواہ نہیں ملا تھا۔ ہاں دو گھنٹے کی ریکارڈنگ کرپٹ تھی جسے ری سنور کر لیا گیا تھا۔ ری سنور کرنے کے بعد معلوم ہوا وہ لڑکا اس رات کہیں نہیں گیا تھا۔ البتہ ایک شخص جو سرتا پیررین کوٹ میں ملبوس تھا بیک یارڈ سے اندر داخل ہوا تھا۔ اور جب وہ باہر گیا تھا تو اس کے شانے پر گٹھڑی نما کوئی چیز تھی۔ اس شخص کا عکس بہت دھندلا سا تھا۔ بارش کے چھینٹوں کے سبب کیمرہ واضح منظر دکھانے میں ناکام ہوا تھا اس لیے شناخت کرنا ناممکن تھا۔

”اگر فوٹو شوٹ کر لیا جائے تب بھی کوئی خاطر خواہ فرق نہیں پڑے گا۔“ نشاء نے رائے دی تھی جسے مان کر وہ ایک بار پھر سے اس کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ سب چیزیں جوں کی توں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ڈسٹ لیس کمرے میں گرد کا ایک ذرہ تک نہ تھا۔

”ڈور کی ناب سے لے کر فٹ میٹ تک سب کلیں ہے۔ کہیں کوئی فنگر پرنٹس نہیں، کہیں کوئی نشان نہیں یعنی اندر آنے والا فقط اندر آنے والا نہیں تھا۔ وہ بہت تیز تھا۔ جانتا تھا کون کون سے نشان کہاں کہاں سے مٹانے ہیں تبھی اتنی صفائی دکھائی ہے۔“ دیوار پر لٹکی سائیکل کو جانچتے ہوئے اس کی سماعت سے راحیل کی آواز نکرائی۔ وہ بچوں کے بل بیٹھی پھر بیڈ کی چادر اٹھا کر نیچے جھانکا وہاں بھی سفید ماربل کی زمین کے کچھ نہ تھا۔

”مجھے لگتا ہے اگر ہم کمرنل کی نظر سے دیکھیں تو ہمیں بہت سے کلیوں مل سکتے ہیں یوں شاید مشکل ہو۔“ کمال کی بات پر وہ واپس کھڑی ہوئی۔ ایل ای ڈی کے قدموں میں پڑی سیڈیز میں سے ایک اٹھائی۔

Themagnificentseven

مووی کا نام پڑھنے کے بعد وہ اس کی سٹڈی ٹیبل کے پاس آئی تھی جہاں چند ایک بکس پڑی تھیں۔ لٹریچر کے نام پر سب کی سب فحاشی تھی خیر انگلش یا کورئین ناولز کو تو چھوڑا اب تو اردو ادب میں بھی اتنی فحاشی گھس آئی ہے کہ اللہ ہی حافظ ہے۔ اچھی بھلی کہانی کا بیڑہ غرق کر دیتی ہیں رائیٹرز، پڑھنے سے پہلے سو بار سوچو اور جب ناول شروع کر لو تو مفت میں آنکھوں اور نخیل کا زنا ہو جاتا ہے لاحول ولاقوة۔

”کمرنل کی سوچ اگر عام سوچ ہو تو کیا ہی بات ہے۔“ ماریہ نے بھی درمیان میں مداخلت کی، شیزل سلیقے سے رکھی کتابوں پر سے انگلی گزار کر ایک پررکی، میرون رنگ کی وہ

کتاب تھی جس پر تین بڑے بڑے سرکل ایک ساتھ بنے ہوئے تھے۔ اس نے وہ موٹی جلد والی کتاب کھینچی۔ جب اسے کھولا تو وہ اچنبھے میں مبتلا ہو گئی کیونکہ وہ کتاب بالکل خالی تھی۔ اس کے صفحات آف وائیٹ رنگ کے موٹے اور کھر درے تھے۔ ان پر کچھ تحریر نہیں تھا کچھ بھی نہیں۔

”اسی لیے تو میں نے کرمئل سائیکا لو جی کنسلٹنٹ کو ہائیر کیا ہے۔ وہ آج سے ہی ہمیں جوائن کرے گی۔“ کتاب کے صفحات کو انگوٹھے کی مدد سے ایک دوسرے کے اوپر گراتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ کمال نے اس کے الفاظ دھرائے۔

”کرمئل سائیکا لو جی کنسلٹنٹ؟“ وہ مڑی، آسمانی رنگ کے اس نکھرے نکھرے کمرے میں کھڑی اپنی ٹیم سے مخاطب ہوئی۔

”ہم وہی، ظل ہما۔۔۔ آج سے وہ ہمیں جوائن کریں گی ان فیکٹ قیس کو بھی وہی اسسٹ کریں گی رہی میری بات تو میں اکیلی ہی ٹھیک ہوں۔ آپ لوگ میری ٹیم ہیں۔ ہم مل کر ایک دوسرے کی بات مان لیا کریں گے۔ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور اس کیس کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔“ سب نے ایک دوسرے کے ساتھ نظروں کا تبادلہ کیا پھر اسکی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

”ویسے مجھے لگتا ہے جتنا قیس سر کا نام ہے اتنا کام نہیں ہے۔ ابھی تک محنت ہم ہی کر رہے ہیں وہ تو بس یہاں وہاں آرڈرز ہی دیتے رہتے ہیں اور میم۔“ راحیل متانت سے بول رہا تھا اسے نہیں پتا تھا پیچھے ظل ہما آن کھڑی ہوئی ہے۔

”جو فائلز آپ نے ہمیں بنانے کو کہیں تھیں وہ بھی سر لے چکے ہیں کل شام ہی لی ہیں لیکن کوئی ایکشن نہیں۔“ راحیل کے لفظوں کو ہما کے لفظوں سے بریک لگی تھی۔

”گڈ مارنگ آفیسر، کل ہمار پورنڈ۔“ سب نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ گلاسز لگے آنکھوں کے ساتھ وہ درازی لڑکی مسکرائی تھی۔ شیزل کی مسکراہٹ اس کی مسکراہٹ سے کم نہ تھی۔ ٹیم ممبرز نے ایک اور فرد کے اضافے پر نظروں کا تبادلہ کیا تھا۔

”مارنگ ہما، امید ہے تم پوری محنت کرو گی۔“ سینے پر بازو باندھے وہ طائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

”کیس کو میں نے پڑھ لیا ہے۔ کافی دلچسپ ہے۔“ بیڈ پر موجود شکن لیس چادر پر اس نے چلتے چلتے ہاتھ پھیرا پھر ایک گہری سانس لی جیسے کچھ سوچنے کی سعی کر رہی ہو۔

”میرے حصے میں دلچسپ کیس نہ آئیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ اس نے اب کی بار باقاعدہ آنکھیں بند کر کے سانس بھرا تھا۔ شیزل کی بھنویں سکڑ گئیں۔

”کرمنل کبھی بھی اپنی پیچھے کوئی کلیو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ جب وہ واردات کرتا ہے۔“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ راحیل اور نشاء اپنے کام کو چھوڑ کر اسے سن رہے تھے جو کہہ رہی تھی۔ ”تو اس کے دماغ میں سب سے پہلے یہی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح خود کو اس سے محفوظ رکھے۔“ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی سوچ ہوتی ہے اس کی لیکن۔“ اس نے کمرے کو اپنی چار آنکھوں کے ساتھ اسکیں کیا۔

”وہ سب مٹانے کے بعد بھی بہت بڑا ثبوت اپنے پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔“ شیزل نے ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس نے درست فیصلہ کیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا۔

”اور وہ ہوتا ہے ثبوت کو جڑ سے ختم کرنا، کوئی ثبوت نہ ہونا ہی اپنے آپ میں بہت بڑا ثبوت ہوتا ہے۔ ایم آئی رائیٹ؟“ ہما نے مسکرا کر سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بند تھیں جب کھلیں تو ان کی چمک بڑی ہی الوہی سی تھی۔

”اس کمرے میں کسی نے عود لگائی ہے کیا؟“ اس کے سوال پر بے ساختہ سب نے ایک دو بے کودیکھا۔ یہاں کوئی عود والا نہیں تھا۔ جو تھا وہ ابھی ان کے بیچ نہیں تھا۔

”قیس سراستعمال کرتے ہیں۔“ نشاء نے بڑی روانی سے کہا تھا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی اس کا استعمال نہیں کرتا۔“ کئی سالوں کا ساتھ تھا۔ کئی سالوں کی بانڈنگ اس لیے سب کو معلوم تھا کہ کون، کس طرح کی خوشبو استعمال کرتا ہے۔

”ایک اچھے برانڈ کے عود کی خوشبو زیادہ سے زیادہ تین دن تک برقرار رہتی ہے۔ اگر یہاں اور مقتول کے گھر میں سے کوئی عود والا نہیں ہے تو میرے خیال سے قاتل صاحب اس کا استعمال کرتے ہیں اور بے دریغ کرتے ہیں۔“

کمال نے آنکھیں سکیڑ کر اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کی ناک یقیناً بہت تیز تھی۔ اس نے محتاط طریقے سے اپنی ناک کے کونے کو رگڑا تھا۔ اگر اس نے سگریٹ کا ذکر کر دیا تو، وہ ابھی دو منٹ پہلے ہی تو واش روم کے بہانے سگریٹ پی کر آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی خوشبو مٹانے کی غرض سے اس نے ماؤتھ واش سے کلیاں کیں اور سونف چبائی تھی۔ ویسے تو وہ ڈرتا نہیں تھا لیکن بھرم بھی کسی چیز کا نام ہے۔

”اس پوائنٹ کو بھی ہم نوٹ کر لیتے ہیں۔“ شیزل اس کا شانہ تھپک کر کمرے سے باہر آگئی۔ دائیں جانب مڑ کر اس نے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ وہ سیڑھیاں لان میں اتر رہی تھیں۔ یہی سے بیک ڈور کی جانب جاتا راستہ تھا۔ وہ اس راستے پر سہج سہج کر قدم رکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں اس وقت کیمرہ فٹ تھا۔ وہ ایسے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ ریکارڈ ہو رہی ہو۔ لان کی گھاس نرم اور تازہ تھی۔ وہاں کہیں بھی خون کا ایک چھینٹا تک نہیں تھا۔ وہ چلتے چلتے سڑک کی جانب کھلتے دروازے کے پاس آئی۔ اس کے بعد اس نے خود کو موڑا۔ وسیع لان،

کونے میں اترتی ویران سیڑھیاں اور خاموشی۔ وہ واپس سیدھی ہوئی۔ اس نے جانچتی نگاہوں سے دروازے کو دیکھا تھا۔ اہنی دروازہ مضبوطی کے ساتھ بند تھا۔ دروازے پر بھی کہیں کسی کا چیز کا نشان نہیں تھا۔ اگر بارش نہ ہوتی تو شاید کوئی کلیوٹل جاتا۔ کوئی نشان بچ جاتا۔ اس نے گہری سانس لی ابھی قدم ہی اٹھایا تھا کہ ایک احساس کے ساتھ رک گئی، جھٹ سے گردن بائیں جانب موڑی۔ وہاں سرخ گلابوں کے بیچ ایک سیاہ گلاب لہرا رہا تھا۔ وہ اس گلاب کے پاس آئی۔ نزدیک سے اسے دیکھا۔ وہ ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے ڈالی پر سے ڈوری کو ہٹایا اور اس گلاب کو اٹھا کر سیدھی ہو گئی۔ وہ آنکھیں چندھی کیے اسے دیکھ رہی تھی۔ یکدم اس کی دھڑکن تیز چلنا شروع ہوئی تھی۔ اس نے اس کی پتی کو بالکل آنکھوں کے سامنے کیا۔

”سفر آسان ہے۔“ ایک پتی پر لکھا تھا۔ اس نے جلدی سے دوسری پتی کو توڑ کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ سیاہ پھول پر سیاہ موٹی روشنائی بکھری ہوئی تھی۔ لفظ ابھرے ہوئے قدرے غیر واضح سے تھے۔

”منزل مشکل۔“ اس نے تیسری پتی توڑی۔ سیاہ پھول پرت پرت اس کے ہاتھوں میں اکھٹا ہو رہا تھا۔

”کیا خبر ہم اینڈ میں ملیں یا نہ ملیں۔“ اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ ایک اور پتی کو توڑا۔ وہ تھوڑی چمکی ہوئی سی تھی۔ اس پر موجود روشنائی بکھری ہوئی سی۔

”لیکن ایک بات تو طے ہے۔“ اس نے ہاتھ میں اکھٹی پتیوں کو جیب میں ڈالا اور باقی توڑنے لگی۔

”مسافر ہم دونوں ہی ہیں۔“ پھول اس کے ہاتھ میں ایک چوتھائی رہ گیا تھا۔ چوڑی

پتیاں اپنے سینے پر تحریر سجائے ہوئے تھیں۔ خود میں ایک راز سمائے ہوئے تھیں۔

”تم میرے تعاقب میں ہو اور میں تمہاری جستجو میں۔“ آخری پتی بچ گئی تھی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے اسے آنکھوں کے سامنے کیا۔ اس پر، اس پتی پر واضح اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ نام اردو میں تھا اور نہ ہی انگلش میں۔ وہ نام چائیز زبان میں لکھا تھا۔ اوپر موجود ہر تحریر چائیز زبان میں تھی۔ لکھنے والا جانتا تھا پڑھنے والی ہی اس تک رسائی حاصل کرے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہ پھول شیزل کے ہاتھ ہی لگے گا۔ وہ اسے جانتا تھا۔ وہ اسے اچھے سے جانتا تھا۔ شیزل کے دل میں اچانک سے خوف ابھر کر ختم ہوا۔ لان کے آخری سرے پر دروازے کے قریب کھڑی وہ اس بات سے انجان تھی کہ کوئی دروازے کے اس پار مسکراتے ہوئے جا رہا ہے۔ کوئی اس کی حیرانی سے حظ اٹھا رہا ہے۔ کوئی کب سے اسے نیہار رہا ہے۔ وہ انجان تھی۔

وہ بالکل انجان تھی۔

☆.....☆.....☆

روز قیامت جب دل تنگ ہوں گے

آہیں سنگ ہوں گی

جب سوال و جواب، جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا

جب پیش ہوں گے، درویش ہوں گے

متقی و پرہیزگار، گناہ گار و سیاہ کار

کوئی نہ ہوگا مددگار

اپنے اپنے اعمال ہونگے

بہت ہی پیچیدہ سوال ہوں گے
 جب دل کی بات ہوگی اور دکھ کی مات ہوگی
 ہاں تب، بالکل تبھی
 تمہارا نام لبوں سے ادا ہوگا
 تم سے ہی پھر جرح ہوگی
 رنج کا سوال ہوگا پھر فیصلہ کمال ہوگا
 تم دیکھنا اس دن، تمہارا کیا حال ہوگا
 روز قیامت، روز قیامت۔۔۔

نیم اندھیرے کمرے میں لیمپ کی روشنی تلے ایک فائل کھلی پڑی تھی۔ میز کی سیاہ شیشے کی
 سطح میں اس فائل کی ورق گردانی کرنے والے انسان کا چہرہ واضح نظر آ رہا تھا۔ گہری بھوری
 آنکھیں، کشادہ ماتھے پر موجود سلوٹیں اور گال پر ٹکی سیاہ گھڑی والے ہاتھ کی مٹھی، اس نے صفحہ
 پلٹا، کاغذ کی مخصوص آواز فضا میں منتشر ہو گئی۔ اسی دوران اس نے اپنا نچلے لب دانتوں میں
 جکڑا تھا۔ پلکیں جھپک جھپک کر وہ کانٹریٹ کرنا چاہ رہا تھا مگر صبح شینزل کے ساتھ ہوئے
 لفظوں کے تباد لے نے اس کا سارا موڈ غارت کر دیا تھا۔ شش و پنج میں مبتلا وہ مسلسل اپنا سینہ
 تنگ ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا پھر دفعتاً اس کے گالوں کی جلد میں تناؤ آیا۔ آنکھوں کے ارد گرد کی
 ساری اسکن اکٹھی ہو چکی تھی۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے فائل کو ہاتھ مار کر پرے کھسکایا جو
 پھسلتی ہوئی زمین پر جا گری۔ دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر جمائے وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے مجھے، کیوں خود کو تھکا رہا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے
 دونوں ہاتھوں سے چہرے کو رگڑا۔ اس کے سامنے بہت سے بڑے بڑے سفید صفحات پڑے

تھے جن پر اس نے ہائی لائٹرز سے پوائنٹس لکھے ہوئے تھے۔ وہ صفحات اس کی عقب میں موجود دیوار میں لگانے والے تھے جہاں پہلے سے ہی کچھ صفحات لٹکے ہوئے تھے۔

”شینزل پہلے بھی تو ایسی ہی تھی۔ شروع سے ہی تھی۔ میں نے ہی خود کو اس کے پیچھے خوار کیا اور اب میں ہی خطا اٹھا رہا ہوں۔“ اس نے کرسی کی بیک پر تھوڑا سا وزن ڈال کر اس کے پیہوں کو زحمت دی، میز کی سب سے آخری دراز کھولی، دو کتابیں، ایک فوٹو فریم اور ایک البم کے نیچے مومی کاغذ میں کچھ لپٹا ہوا تھا۔ قیس نے اسے باہر نکالا، اس پر سے کاغذ ہٹایا۔ وہ ایک عدالتی سپر تھا جس پر شینزل کے سائن تو واضح تھے مگر اس کے سائن والی جگہ اب بھی خالی تھی بالکل خالی۔

”کچھ رشتوں کے ختم ہونے میں ہی بھلائی ہے۔ ذہنی اذیت سے تو بہتر ہے کہ ہم گریس فل انداز میں الگ ہو جائیں۔ تم کون ہو میں بھول جاؤں گی۔ میں کون ہوں تمہیں بھولنا ہوگا۔“ ماضی میں کہے شینزل کے جملے اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ کا موجب بنے۔ آنکھوں میں خود کیلئے ترحم کوٹ کوٹ کر بھر گیا۔

”بہت سارحم تمہارے لیے قیس الہی، بہت سارحم۔“ کاغذ کو واپس لپیٹ کر اس نے چیزوں کے نیچے چھپا دیا۔ یہ چند اشیاء تھیں جو اس کی زندگی کا کل اثاثہ تھیں۔ جنہیں وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ محبت کے چالیس چراغ، شکوہ جواب شکوہ، اس کی اور شینزل کی تصویر جس میں وہ دونوں آپس میں مسکرا رہے تھے اور وہ ایک تصویر۔ اس کی تصویر جو ان دونوں کی زندگی تھی۔ ان دونوں کی انت الحیات، اس دنیا میں آئی ڈیڑھ دن کی مہمان، فقط ڈیڑھ دن کی۔ قیس میں اس تصویر کو الٹانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اس لیے اس نے اس کو سیدھا کیا اور نہ ہی الٹا رکھا ہوا فریم سیدھا کیا۔ دراز کو بند کر کے وہ اٹھائیس سالہ خوبرو انسان کرسی کی بیک پر

سرٹکا کر آنکھیں موند گیا، چہرہ اونچا تھا چھت کی جانب،

”بہت سارحم تمہارے لیے کیونکہ تم اب بھی اس سے امید لگائے بیٹھے ہو جس نے امید کا ہر در بند کر دیا ہے۔ جس نے تمہیں صفائی کا ایک موقع نہیں دیا اور فیصلہ سنا دیا۔ جدائی کا فیصلہ۔“ اس نے گہرا سانس بھر کر موندی آنکھیں کھولیں پھر اطراف میں نگاہ دوڑائی جہاں فائلز، کاغذات، رپورٹس اور جانے کیا کیا پڑا تھا۔ وہ یہاں کیوں آیا تھا اسے یاد آ گیا۔ انکل حیدر نے اسے کال کی تھی اور بتایا تھا کہ شینزل کے علاقے میں قتل ہو گیا ہے۔ قتل چونکہ ملک کی اپر کلاس کے ہاں ہوا تھا اس لیے اسے جلد از جلد یہاں پہنچ کر اس مسئلے کو حل کرنا تھا۔ وہ یہاں نہ آتا ہرگز نہ آتا اگر درمیان میں شینزل نہ ہوتی۔ اسے لگا تھا وہ یہاں آئے گا تو شینزل اسے دیکھ کر شاید پکھل جائے گی، شاید اس کے دل میں بھی احساس جاگ جائے گا اور وہ اسے معاف کر دے گی مگر وہ غلط تھا بالکل غلط، وہ بندہ شناس انسان تھا۔ چند ملاقاتوں میں ہی جان گیا کہ وہ آج بھی اسے اتنا ہی ناپسند کرتی ہے جتنا اس نے کچھ عرصہ قبل اسے ناپسند کرنا شروع کیا تھا۔ وہ جان گیا تھا وہ اچھے سے اپنی حیثیت اس کی نظر میں جان گیا تھا۔ تبھی تو آج وہ خالد نسیم کے گھر نہیں گیا تھا۔ آج وہ کہیں بھی نہیں جانا چاہتا تھا کہیں بھی نہیں۔

قلب کا سکون اس وقت حاصل ہوتا ہے جب قلب گناہوں سے پاک ہو اور بطور شینزل کے قیس الہی کا قلب پورا کا پورا گناہ کا تو تھڑا ہے۔ تبھی اس نے ظل ہما کو رپورٹ کرنے کو کہا تھا۔ ظل ہما قیس کی کالج کی دوست جو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں بھی تھی۔ پولیس کے جس بیج میں قیس شامل تھا اسی سال کے لڑکیوں کے بیج میں وہ بھی شامل تھی۔ وہ قیس کو چیز کرتی تھی۔ وہ قیس کو پسند کرتی تھی۔ یہ بات قیس اور شینزل دونوں جانتے تھے۔ بہت اچھے سے جانتے تھے۔

”ویسے میرا اتنا کام تو نہیں لیکن چونکہ آپ نے مجھے ہائیر کر ہی لیا ہے تو میں آپ کو شیورٹی

دیتی ہوں اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دوں گی۔ آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“ شینزل نے کافی مشین میں سے دو کپ کافی کے بھرے اور پھر اپنی چھوٹی سی ڈائننگ میز پر آئی جہاں گل ہما ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ آسمانی اور سفید رنگ کی کالر والی چیک دار شرٹ اور بیگی جینز پہنے بیٹھی لڑکی بڑی ہی جاذب نظر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے دراز بالوں کی ہائی ٹیل پونی کے بال دائیں شانے پر گرے ہوئے تھے۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ چاندی کی نتھ جو اس نے ناک میں پہنی ہوئی تھی بہت غور کرنے پر ہی دکھائی دیتی تھی یا ہلکی سی لائٹ پڑ جائے تب ہی وہ نظر آتی تھی ورنہ دور سے تو بالکل بھی وہ نظر میں نہیں پڑتی تھی۔

”تم سے مایوسی کی امید رکھی بھی نہیں ہے میں نے، قیس پر پوری نظر رکھو۔“ اس نے جونہی کافی کاسپ بھرا شینزل کے لفظ توں ہی اس کے ہوش اڑا گئے۔ اتنے اچانک وار کیلئے وہ تیار نہیں تھی اس لیے اچھو قدرے زیادہ لگا تھا۔

”یہ میں نے کیا سنا۔“ شینزل کے بڑھائے گئے ٹشو سے منہ پونچھنے کے بعد وہ کہہ رہی تھی۔ شینزل نے شانے اچکا دیے۔

”دیکھو پاکستان میں نا یہ کرمنل سائنکالوجی کنسلٹنٹ، لیب کے چکر، ذرے ذرے کی تلاشی، تفتیش کیلئے لوگوں کی لائیں لگا دینا وغیرہ وغیرہ نہیں ہوتا، پاکستان میں بس ایک دودن کی چھان بین کی جاتی ہے اور پھر کیس بند ہاں پیسے بنانے کیلئے تاریخ پر تاریخ والا سین ضرور ہوتا ہے لیکن پولیس بیچاری کچھ خاص زحمت نہیں کرتی۔ وہ کیا ہے نا کہ بہت پیپر ڈھوتے ہیں ہم لوگ، کا کے ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو ماؤں کی طرح اوپر والے ہمیں کالز پر کالز کر کے پریش لینے سے منع کر دیتے ہیں تاکہ ہم پریش کر کے نظر نہ ہو جائیں۔ گیند جب اوقات سے باہر ہو کر باؤنڈری پار کرتی ہے نا یعنی غریب طبقے کو چھوڑ کر اپریل میں داخل

ہوتی ہے تب ہمیں ایکشن لینا پڑتا ہے۔ وہ بھی اوپر والوں کی مرضی کا، لیکن اس بار مفاد میرا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم قیس پر نظر رکھو اور اسے پوری طرح خود میں الجھا لو۔“ وہ حیرت زدہ سی اسے سن رہی تھی اسی انداز میں بولی۔

”یعنی آپ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی ہیں۔“ شینزل نے کڑوی کافی کو حلق سے نیچے اتار کر کہا۔

”سمجھدار ہو۔“ وہ مسکرا دی تھکی ہوئی مسکان۔

”ایک سوال ہے میرا، قیس پر نظر کیوں رکھنی ہے مجھے اور آپ کا کیا مفاد ہے اس میں؟“ کڑوی کافی ظل ہما کو مزید کڑوی لگی جب اس نے شینزل کے منہ سے جواب سنا تھا جو یہ تھا۔

”وہ دو منازر ہے۔ ایک نمبر کا فلرٹی، میں نہیں چاہتی میری ٹیم میں وہ اپنا رنگ دکھائے۔ مجھے ماحول صاف رکھنا ہے۔ وہ تمہارا دوست ہے تم ساتھ ہوگی تو وہ آس پاس توجہ نہیں دے گا۔ تمہارا کام اسے برائی سے روکنا ہے اور دوسرا مجھے اس پر بالکل یقین نہیں، ہو سکتا ہے وہ قاتل کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ اس کی راہیں ہموار کرے اس لیے اس کے ساتھ سائے کی طرح رہنا۔“ بولنے کے دوران اس نے اپنی کافی کو ختم کر دیا تھا۔ سرخ مگ جو اندر سے چاکلیٹی رنگ کا تھا اب بالکل خالی تھا شینزل کے دل اور اس کی زندگی کی طرح۔

”آپ اسے اتنا کرپٹ سمجھتی ہیں۔“ مسکان ایک بار پھر سے لبوں پر تھی۔ تضحیک اور تنفر سے بھری مسکان، رازدارانہ مسکان۔

”امم ہم سمجھتی نہیں ہوں بلکہ یقین ہے مجھے۔“ ظل ہما سے کافی نہیں پی گئی تھی اس لیے اس نے آدھی چھوڑ دی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے شینزل کو مخاطب کیا تھا جو لائیت گرے شیڈ کی دراز قمیض اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ بالوں کو جوڑے کی شکل میں گرہ باندھی

ہوئی تھی۔ کف سیلوز تھے جس نے اس کی کلائیوں کو چھپایا ہوا تھا۔ وہ میز پر رکھے سیل فون کی اسکرین کو شہادت کی انگلی سے سکروں کر رہی تھی جب ہما کی بات نے اسے چونکا دیا۔
 ”وہ آپ کے خیالات سنے گا تو مر جائے گا۔“ شیزل نے پلکیں اوپر اٹھائیں پھر چونکنے کے بعد بولی۔

”جو نفرت سہہ کر نہیں مرادہ ان خیالات سے کیا خاک مرے گا۔“ ظل ہما کو اب قدرے برا لگا۔ قیس کو وہ غلط اینگل سے دیکھ رہی تھی۔ پرکھ رہی تھی جو کہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بالکل بھی نہیں۔

”آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ وہ آپ پر جان چھڑکتا ہے۔“
 شیزل نے چھوٹے ہی اس سے کہا۔ ”تم اس سے شادی کر لو اچھی لڑکی ہو، پسند بھی کرتی ہو، سنبھال لو گی اسے۔“

ظل ہما ہنسی اپنے سامنے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھے گئی جس کے دل میں دل کی جگہ پتھر فٹ ہو چکا تھا۔ اس نے ضبط نہیں کیا اور کہہ دیا۔

”وہ سنبھلا ہوا ہے شیزل، اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہاں جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو میں مجبور ہوں۔ میں اسے اس معاملے میں نہیں روک سکتی، شروع سے آپ کو جانتی ہوں تو اسے بھی جانتی ہوں۔ وہ پاگل ہے آپ کے پیچھے، آپ جتنا دور چلی جائیں اس سے جتنی پردہ پوش ہو جائیں وہ ڈھونڈ نکالے گا آپ کو، آجائے گا آپ تک جیسے اب آیا ہے۔“

شیزل نے لبوں پر زبان پھیری پھر سر قدرے نیچا کر کے کچھ سوچنے کے بعد یکدم کھڑی ہوئی۔ ”کافی ختم کر کے جانا، میرے گھر میں رزق ضائع نہیں ہوتا۔“

ظل ہما کے لفظوں نے اس کے قدم جکڑے تھے۔ ”اور دل؟ وہ ضائع ہو جاتے ہیں، ہے نا۔“

وہ نہیں مڑی تھی مڑ جاتی تو آنکھوں میں امنڈتی نہی اور بھینے ہوئے لب اس کے دل کی داستان کھول کر رکھ دیتے۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی بولتی تو لہجہ اس کا سارا پردہ اٹھا لیتا۔ اس نے تڑپتا ہوا گہرا سانس بھرا پھر کمرے میں غڑاپ سے غائب ہو گئی کہ فرار کے سوا اب کوئی چارہ نہیں تھا۔

روز قیامت
جب دل تنگ ہوں گے
ہم سنگ ہوں گے
میں خدا کے سامنے تمہارا نام لوں گی
بے حساب لوں گی
پھر نجات ہوگی نہ کوئی بات ہوگی
فقط

مات ہی مات ہوگی
روز قیامت، ہاں روز قیامت

☆.....☆.....☆

اس نے اپنی پڑمردہ سی نظروں کو آسمان کی وسعت میں ڈالا، دور افق پر ایک باریک سا نقطہ یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں تیرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آنکھوں کے آگے ہاتھ کا چھجا بنایا اور انہیں مزید چندھیادیا تا کہ وہ اس تیرتے ہوئے نقطے کی نشاندہی کر سکے مگر بے سود، اس کی آنکھ کو وہ نظر نہیں آ رہا تھا جو وہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔ نظر وہ آ رہا تھا جو وہ نہیں دیکھنا چاہ رہی تھی۔

”آج کہاں گئی تھی تم؟“ اپنے عقب میں اسے آواز آئی تھی۔ مڑی تو دیکھا اس کا بھائی ہاتھ میں دو رہین لیے کھڑا تھا۔ یقیناً وہ کمرے کی کھڑکی سے اس کی ساری کارروائی دیکھ چکا تھا بلکہ وہ ہی کیوں کوئی اور بھی تھا جو انہیں دیکھ رہا تھا۔ جہانگیر انہیں دیکھ رہا تھا۔

”تم سے مطلب؟“ اس کی نفی کرنے میں جتنا نین کو مزہ آتا تھا شاید ہی کسی کو آتا ہو۔ کمر پر ہاتھ باندھے کھڑا اس کا بھائی اپنی ابرو اچکا گیا۔

”مجھ سے ہی سارے مطلب ہیں میڈم، میری ذمہ داری ہو تم بنا ڈرائیور کے گئی تھی جانتی ہو کتنا پریشان ہو گیا تھا میں۔“ وہ کبھی بھی اظہار کرنے میں نہیں چوکتا تھا اور وہ کبھی اقرار نہیں کرتی تھی۔ ٹھس بیٹھی رہتی تھی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جیسے اس کی پریشانی اس کیلئے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔ وہ اب بھی چپ تھی مزید رہتی اگر وہ اسے پکار کر توجہ اپنی جانب مبذول نہ کرواتا تو۔

”نین۔“

”ڈاکٹر کے پاس گئی تھی کچھ دنوں بعد ماما کا آپریشن ہو گا اور پھر وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس کے ہاتھ سے دور بین پکڑ کر اس نے آنکھوں پر لگائی۔ وہ نقطہ جس کی پہچان وہ کب سے کرنا چاہ رہی تھی ایک عقاب نکلا، آنکھوں کے آگے آئے لینز نے سب کچھ واضح کر دیا۔

”ہمم، تو یعنی سارا انتظام تم نے خود کیا؟“ اس نے دور بین کا رخ موڑا اب وہ پورے آسمان کو چھان رہی تھی۔ جیسے اس کے ہاتھ میں ہفت اقلیم کی دولت آگئی ہو اور ایسا ہی تھا آسمان کی رسیا کو آسمان تھوڑا قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی بات اس کیلئے بہت بڑی تھی۔

”نہیں میرا ایک بھائی ہے وہ میرے ساتھ گیا تھا۔ بالوں میں جیل لگا کر کمر کے پیچھے ہاتھ

باندھ کر، اس کا نام سیٹھ صاحب ہے ڈاکٹر زبڑی پروٹوکول دے رہے تھے اسے، میں نے جو بہت عرصہ پہلے پیسے چرائے تھے وہ اسی کے پاس امانت رکھوائے تھے۔ وہی اس نے وہاں جمع کروائے ہیں۔“ وہ مبہم سا مسکرا گیا۔ جہانگیر اپنے دونوں بچوں کو یوں ساتھ دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہو رہے تھے۔ کیونکہ یہ منظر انہوں نے پہلی بار ہی دیکھا تھا انہوں نے بھی اور مصباح نے بھی جو شوہر کے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔

”جیسے جیسے بڑا ہونا شروع ہو رہا ہے ویسے ویسے اس کے قریب آ رہا ہے۔“ اپنی پشت پر سے شریک حیات کی بات سن کر انہوں نے ان دونوں پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ اسے پتا ہونا چاہیے کہ یہ اس کی بہن ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کی عزت ہے۔“ مصباح متحیر ہوئیں اسی تحیر کے عالم میں کہنے لگیں۔

”مجھے لگا تھا شاید آپ جس طرح خود غافل ہیں حلیمہ اور نین سے اسی طرح چاہتے ہیں کہ سیٹھ۔“ ان کی بات درمیان میں قطع ہوئی تھی بری طرح سے ہوئی تھی۔

”میں اپنی اولاد اور اس کی ماں سے غافل نہیں ہوں۔ کنارہ برت رہا ہوں اور اس میں ہی مصلحت ہے۔ تم اچھے سے جانتی ہو۔“

وہ خاموش ہو گئی تھیں کہ اب کہنے کو کچھ بھی بچا نہیں تھا۔ وہ دونوں جس بالکونی میں کھڑے تھے اس کے آگے سنہری رنگ کی گرل لگی ہوئی تھی۔ عقب سے ان کی خواب گاہ کی دیوار دکھائی پڑ رہی تھی جس پر دیوار گیر پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس پینٹنگ میں اللہ کا نام ننانوے ناموں کو جوڑ کر لکھا گیا تھا۔ سیاہ زمین پر سفید رنگ سے لکھا ہوا اللہ اندھیری رات میں چمکتے چاند کی مانند لگ رہا تھا۔ یہ پینٹنگ جہانگیر نے تب بنائی تھی جب ان کی پہلی اولاد ہونے والی تھی۔ جب نین اس دنیا میں آنے والی تھی۔

”نام کا کیا میں تو ہوں ہی سیٹھ، راج کرنے کیلئے پیدا ہوا ہوں دیکھنا ایک دن اس پوری دنیا پر راج کروں گا۔“ نین نے دور بین کو آنکھوں سے ہٹایا ہٹانے کے بعد اسے وارن کرنے والے انداز میں بولی۔

”دنیا پر راج کا اختیار صرف اللہ کو ہے اس لیے بڑی بڑی اور بے تکی باتیں مت بولا کرو یہ نہ ہو اللہ ناراض ہو جائیں۔“ وہ دونوں باغ میں کچھے بیٹچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے عقب میں فوارہ پانی اگل رہا تھا اور سامنے دور تک پھیلا سبزہ تھا۔ مالی بابا پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہے تھے ساتھ ساتھ پانی کا چھڑکاؤ بھی جاری تھا۔ جس کے سبب کچی مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو چار سو پھیل چکی تھی۔ مٹی کی خوشبو نے ان دونوں کو بھی اپنے حصار میں لیا ہوا تھا تبھی تقویت کی لہر دونوں کے بدن میں دوڑ چکی تھی۔

”اللہ میرے دوست ہیں۔ وہ مجھ سے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض نہیں ہوتے اور میں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا، میں بھی بابا کی طرح سیاست میں جاؤں گا وزیراعظم بنوں گا اور اپنے ملک کو سدھار دوں گا۔“ دور بین اس کی گود میں رکھ کر اس نے تڑخ کر کہا۔

”میرا ملک سدھرا ہوا ہے۔ اس میں موجود لوگ ہیں نا وہ بگڑے ہوئے ہیں پہلے انہیں سدھارنے کی بات کرو پھر ملک کی طرف آؤ سمجھے۔“ وہ ہنس دیا۔ اس کے پاس برابر میں جگہ بنا کر بیٹھا۔

”تو یعنی مجھے پہل تم سے کرنی ہوگی۔“ اس لڑکی نے اپنی بڑی بڑی نظریں اپنے چھوٹے بھائی پر ڈالیں جو اس سے عمر میں کافی بڑا لگنے لگ گیا تھا۔ ایک تو اس کا قد کاٹھ اوپر سے اس کی ڈرینک۔

”تصحیح کرو، وہ تم ہو جو پہلے نمبر پر آتے ہو۔“ اس نے بازو پھیلا کر اسے اپنے حصار میں لیا

تھا۔ نین نے شانہ جھٹکنا چاہا مگر جھٹک نہیں پائی۔

”مانتی ہونا پھر کہ میں ہی نمبروں ہوں۔“ آنکھ دبا کر اسے چھیڑا۔ وہ تپ گئی۔ دور بین اس کی گود میں پھینکی اور بازو شانے سے جھٹک دیا۔

”مجھے تنگ مت کیا کرو تم، جب کہیں میں سکون کیلئے بیٹھتی ہوں جن کی طرح نازل ہو جاتے ہو۔ ہٹو۔“

اسے پتا نہیں کس بات کا برا لگا تھا لیکن جو بھی تھا وہ اس سے لڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ اچنبھے سے اسے وہاں سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد مسکراتے ہوئے شانے اچکا کر ”میری بلا“ سے کہہ کر اس نے دور بین آنکھوں سے لگالی۔ گردن اونچی کیے وہ آسمان کی وسعتوں کو ماپنے میں مصروف ہو گیا۔ کم عمری کی زندگی تھی۔ بے فکری کی زندگی تھی۔

☆.....☆.....☆

الماء فی ناظری

”آنکھ میں پانی۔“

والنار فی کبدی

”دل میں شعلے۔“

ان شئت فاغترنی، او شئت فاقبسی الشریف الریضی۔

”جام پیو یا آگ سے کھیلو۔“

دن چڑھے جب سورج اپنی شان، شان سے دکھاتا ہے اور جب پورا آسمان پرندوں سے بھر جاتا ہے۔ جب ہر گھر میں چہل پہل ہوتی ہے۔ جب ہر گھر میں شور شرابا ہوتا ہے۔ تب ایک گھر ایسا بھی ہوتا ہے جو بالکل خاموش ہوتا ہے۔ وہاں نہ رشتوں کی گرم جوشی ہوتی ہے اور

نہ قہقروں کی یلغار، وہاں بس خاموشی راج کرتی ہے گھور خاموشی۔

”تم نے آج اٹھنا نہیں؟“ وہ اس کے کسمسانے پر متبسم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ انگلیاں بہت ہی نرم سے انداز میں اس کے بالوں میں چل رہی تھیں۔ اس لڑکی نے موندی موندی آنکھیں کھولیں قبل اس کے وہ دہشت سے اٹھ بیٹھتی اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں بھر لیا۔

”گھبراؤ نہیں میں ہوں، کل جو ہوا وہ بس ایک خواب تھا۔“ رتبہ کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھی۔ اس کے بال دونوں شانوں پر آن گرے تھے۔ سیاہ لوز کرل بال۔

”وہ خواب نہیں تھا۔ وہ میری زندگی کی ایک اور ڈراؤنی حقیقت تھی۔“ سفید پانی زرد گال پر تو اتر سے بہنے لگا۔ بھیگی پلکیں جھکی تھی۔ تھوڑی پر بل پڑ چکے تھے ضبط کے بل۔

”تھی نا، ماضی ہو چکی۔ اب حال ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔“ اپنے ہاتھ میں موجود اس کے نرم ہاتھ کو تھوڑا بھینچ کر تحفظ کا احساس دلایا گیا جس پر رتبہ کی پلکیں مزید خم ہو گئیں۔

”میرے پیچھے وقت اور زندگی برباد نہیں کرو، چلے جاؤ نا، جی لو نا۔“ سیاہ یا قوت آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب کر بہت گہرا لگ رہا تھا۔ یہ اس کی آنکھوں کی طاقت تھی جو وہ سہا رہیں پا رہا تھا تبھی تو نظروں کے تصادم کو توڑ کر سر جھکا لیا بولا تو آواز سرگوشی سے بھی کم تھی۔

”کہاں جاؤں، کیا جیوں، تم چاہتی ہو کہ میں مرجاؤں۔“ رتبہ نے تڑپ کر اس کا نام لیا تھا۔ پھر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

”تم پھنس رہے ہو برباد ہو رہے ہو۔ میں چاہتی ہوں ایسا نہ ہو۔“ وہ تلخی سے مسکرایا پھر سر جھٹک کر گویا ہوا۔

”جتنا برباد ہونا تھا میں نے ہو چکا، بہت خمیازے بھگتے ہیں۔ بہت خسارے اٹھائے ہیں اب کسی اور کی باری ہے۔“ لہجے میں تنفر تھا شدید تنفر، بات پھر سے دوہرائی گئی۔“ کسی اور کی

باری ہے۔“ سر اثبات میں ہل رہا تھا۔ فیصلے پر مہر لگادی گئی پختہ مہر۔

”کر لو گے اس کے ساتھ ایسا؟“ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ کہنے والے کے دل میں ہوک اٹھی جسے اس نے فوراً ہی دبا دیا پھر جھوٹی مسکان لبوں پر لا کر بولا۔

”کر رہا ہوں اور سچ پوچھو تو اسے ایسے دیکھ کر تھوڑا تو سکون مل رہا ہے مجھے۔“ لفظوں سے بالکل الٹ اس کے چہرے کے تاثرات تھے اور چہرے کے تاثرات سے بالکل الٹ اس کی آنکھیں تھیں جن میں حزن کی پرت برابر چڑھی تھی۔

”اچھا اب چھوڑوان باتوں کو اور اٹھو، ناشتہ بناتے ہیں بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ میرے پیٹ کی حالت سے تم اچھے سے واقف ہو قبل اس کے یہ پورے گھر میں الارم بجا دے تم اس کا فوراً کچھ انتظام کرو، چلو چلو اٹھو کوئی سستی نہیں۔“ اپنے ہاتھ میں دبے اس کے ہاتھ کو کھینچتا ہوا بیڈ سے اتر ا اور اسے بھی اٹھنے پر مجبور کر گیا۔ وہ جب واش روم گئی تھی تب اس نے دونوں پردوں کو جھٹکے سے کھولا، دونوں سرکتے ہوئے دیوار سے جا لگے۔ سورج کی مخمور شعائیں شیشے سے کر اس ہو کر اس کے چہرے پر گرنے لگیں۔ وہ ونڈو کے شیشے میں اپنے عکس کو دیکھ رہا تھا۔ اسے خود سے نفرت کرنی چاہیے تھی اسے خود سے بے انتہا نفرت کرنی چاہیے تھی کیونکہ وہ تھا ہی اس قابل، ونڈو کے شیشے میں مدھم سا اس کا چہرہ روہانسا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے وجود کی آشنائی نے اس کے دل کو بوجھل کر دیا تبھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے اندر کوئی بول رہا تھا کوئی کہہ رہا تھا جو کہ یہ تھا۔

”میری ہر سانس تم سے نفرت کرتی ہے اور میرے دل کی ہر دھڑکن تمہاری محبت میں مبتلا ہے۔ میرا ہر عمل باغیانہ ہے۔ میری ہر نظر والہانہ، سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ دوں یا تمہارے رکھوں۔ الجھائے رکھوں یا تمہیں سلجھا دوں جبکہ قطار میں تو تم بھی ہو، باری تو تمہاری

بھی آئے گی مروگی تو تم بھی لیکن کیا میرے ہی ہاتھوں۔“ آنکھیں کھول کر اپنے ہاتھ وہ پیٹ تک لایا، کھلی ہتھیلیاں، تھوڑی سی بند انگلیاں۔

”ارے تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔“ عقب سے آتی آواز پر وہ بری طرح چونکا، ہاتھوں کو فوراً نیچے کیا اور بڑی ساری جھوٹی مسکان لبوں پر سجا کر مڑا۔

”سورج بہت خوبصورت ہے آج، سوچا کچھ دیر دیکھ لوں۔“ آگے بڑھ کر وہ بیڈ پر پڑے کمبل اور سلک کی شہد رنگ چادر کو فولڈ کرنے لگا۔ رتبہ کو سورج کی روشنی ناقابل برداشت ہوئی۔

”اچھا۔“ وقفہ۔“ دیکھ لیا تو پھر کرٹن واپس سیدھے کر دو۔“ تہہ شدہ کمبل پر اس نے چادر کو سلیقے سے رکھا جب وہ کہہ رہی تھی تب وہ چادر کو کمبل پر سیٹ کر کے رکھ رہا تھا۔ آدھا جھکا ہوا تھا۔ گردن اٹھائی، چہرے کے تاثرات نارمل رکھے جبکہ کپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔

”وہ کیوں۔“ سیدھا ہوا۔“ اتنی اچھی تو دھوپ ہے آؤ تمہیں بھی دکھاتا ہوں۔“ اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے اسے شیشے کی طرف لے آیا۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا وہ چھ ماہ پیچھے چلی گئی تھی۔ اس کی کتراہٹ اسے بری طرح جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ آنکھیں میچے اس کے ساتھ کانپتے وجود سے کھڑی تھی۔ اس کی ہاتھوں کی لرزش بتا رہی تھی وہ کتنی زیادہ خوف زدہ ہو چکی ہے۔

آنکھیں کھول کر رتبہ اور دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ کتنی دلکش ہے۔ نعمت ہے یہ، اس سے یوں منہ نہیں موڑو۔“ اس نے ہولے ہولے پلکوں کو کھولا۔ سورج اسے چبھ رہا تھا۔ اپنی اپنی بالکونی میں کھڑے قہقہے لگاتے لوگ اس کا سانس روک رہے تھے۔ اس نے اسی رے کے ہوئے سانس کے دوران کہا۔

”پردے برابر کر دو۔“ پھولے ہوئے لہجے کی التجا، سہمے ہوئے لفظوں کی التجا۔

”تم میری بہن ہو کر ڈر رہی ہو، دیکھو میری ناک کٹ جائے گی۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا
نروٹھے انداز میں کہہ رہا تھا۔ رتبہ جھٹکے سے مڑی، اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد وہ دیوار
سے جا لگی تھی۔ وہ سورج سے دور جا چکی تھی لیکن ہاں مررونڈو کے آگے جو کھڑا تھا۔ وہ پورا کا
پورا سورج کی روشنی میں نہا چکا تھا۔ گردن کو دائیں جانب موڑ کر اب اسے دیکھنے لگا تھا جو مدہم
لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں اس جتنی مضبوط نہیں ہوں۔“ اس کے کشادہ ماتھے پر بے تحاشہ بل پڑے، جینز کی
جیبوں میں ہاتھ ڈالے پورا اس کی جانب مڑا۔

”کتنی بار کہا ہے جب ہم ساتھ ہوں تو اس کا تذکرہ مت کیا کرو، وہ اب نہیں ہے۔
اب صرف ہم دونوں ہیں۔“ جو بات بیاں ہوئی تھی وہ شاید دل سے نہیں کی گئی تھی تبھی اس بات
میں صداقت دل کو مفقود لگی تبھی یہ اعتراف بے معنی لگا۔

”مگر تم تو اس سے۔“ مقابل نے اس کی بات کو درشتی سے کاٹا۔ اور اب کی بار جو کہا اس
نے دل کو چھوا اس میں صداقت لگی پاکیزہ صداقت، کسی بھی ملاوٹ کے بنا۔

”ہاں محبت کرتا تھا اس سے، بے انتہا محبت بس سن لیا، سکون آ گیا اب ناشتہ بناؤ بھوک
لگ رہی ہے مجھے۔“ نروٹھا لہجہ، خفت بھرا انداز، وہ خفا ہو کر کمرے سے باہر گیا تھا۔ اس بات
نے رتبہ کے دل کو دکھ پہنچایا بہت زیادہ دکھ۔



دوپہر کا وقت تھا۔ فضا میں خنکی کا راج تھا۔ فوگ ہر سمت تھی۔ کمروں میں ہیٹر آن تھے مگر
پھر بھی سردی کی لہر وقفے وقفے سے بدن میں دوڑ رہی تھی۔ وہ اپنے کیبن میں بیٹھی کام کر رہی

تھی جب لکڑی کے دروازے کو جھٹکے سے کھول کر قیس اندر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ زوردار انداز میں میز پر مارے پھر انہی ہاتھوں پر وزن ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

”ہما کو کس سے پوچھ کر اپائنٹ کیا ہے؟“ اس کے انداز، اس کے تیور دیکھ کر شینزل نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کرسی کی بیک سے ٹیک لگالی۔ ابرو اچکائے ترخ کر کہا۔

”مجھے کسی کو ہائیر کرنے کیلئے تمہاری پرمیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بورڈ کا فیصلہ تھا۔“ اب کی بار مزید گستاخانہ انداز اپنایا گیا۔ یونہی جھکے جھکے، دبے دبے لہجے میں پھنکارا۔

”بھاڑ میں گئی تم اور تمہارا بورڈ۔“ وہ اس کے ”تم“ کہنے پر لبوں کو تضحیکی انداز میں کھینچ گئی پھر کرسی کی پشت چھوڑ کر دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”بندے کی اوقات اس کے غصے میں ہی پتا چلتی ہے بٹ سوری ٹو سے مجھے تمہاری اوقات کا اول دن سے ہی پتا ہے، بائی داوے اس آگ کی وجہ؟“ قیس نے میز پر رکھے ہاتھوں کی مٹھیاں بنائیں، بھوری آنکھوں میں جلادینے والی تپش درآئی تھی۔

”حد میں رہو شینزل کیونکہ میری حد اب جواب دے رہی ہے۔ اب میں مزید اپنے کردار پر کوئی داغ برداشت نہیں کروں گا۔ اب میں لحاظ نہیں کروں گا۔“ تو اصل وجہ یہ تھی۔ وہ پھر سے مسکرائی، موسم سرما کی خوبصورت مسکراہٹ۔

”یونو واٹ قیس، جب تم نے میرے شانے پر جیکٹ ڈالی تھی تب مجھے لگا تھا کہ تم معاف کر دینے کے قابل ہو۔ تمہیں ایک چانس دینا چاہیے لیکن میں غلط تھی۔ تم بالکل بھی اس چیز کے قابل نہیں ہو۔“ کیبن کے چھوٹے سے لکڑی کے دروازے سے پولیس اہلکار آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ قیس جوں کا توں جھکا کھڑا تھا اسی انداز میں کھڑے کھڑے بولا۔

”ایک انکشاف میں بھی کر دیتا ہوں شینزل بی بی، میں نے ابھی تک پیپرز پر سائن نہیں

کیے ہیں۔ کربھی دوں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم آج بھی میری دسترس میں ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ چاہے ہزار عدالت نامے نکلوا لو چاہے ہزار دستخط کروالو آزاد نہیں ہو سکتی تم، ناممکن۔“ گردن کو دائیں بائیں نفی میں ہلاتا وہ اس کے کان سن کر گیا تھا بالکل سن، سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ سانس مدھم سے انداز میں پھول رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے گویا ہوئی۔

”جھوٹ مت بولو۔“ وہ اس کی بات کی تردد کر گیا۔

”جھوٹ بولے کافر، ایک جنگ تم نے شروع کی تھی۔ ایک جنگ میں نے شروع کی ہے اور یہ جنگ اب تب ہی ختم ہوگی جب سب ختم ہوگا۔“ اس نے خود کو سیدھا کیا۔ شیزل کے چہرے کی اڑی ہوائیاں اس کے دل کو تقویت دینے کی بجائے بے چین کر رہی تھیں۔ لیکن اس نے خود کو کنٹرول کیا ہوا تھا بہت زیادہ کنٹرول۔

”مجھے لگتا ہے ہمیں اپنے کام پر فوکس کرنا چاہیے۔ ذاتیات کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے۔“

وہ اس کے پٹری پر آنے پر ہنسا، سر کو پیچھے کو گرا کر، لبوں کو چبا کر، نفی میں گردن ہلا کر۔

”یہی تو سمجھا رہا ہوں میں آپ کو، نجی معاملات کو نہیں لاتے درمیان میں، آپ نے ظل ہما کوٹیم میں شامل کر لیا۔ پتا بھی ہے کتنی پاگل ہے میرے پیچھے، روم روم میری محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اب اچھا لگے گا وہ آپ کے سامنے مجھے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرے ہاں۔“ وہ بھی اس کے پٹری پر آنے پر ضبط کا جام پی گئی۔ درگزر کرنے کا سوچا حالانکہ بڑا کٹھن تھا اور پر سے اس کا انکشاف، شیزل کو لگا اگر اس نے تھوڑی سی بھی دیر دماغ کو کہیں اور نہیں بھٹکایا تو وہ ٹوٹ پڑے گی۔ اور اس وقت وہ بھڑکنا نہیں چاہتی تھی بالکل بھی نہیں۔

”اچھی سوچ ہے۔ ہمیں کیس کو ڈسکس کرنا چاہیے بہت سارا کام پینڈنگ ہے۔“ وہ اس

کے لٹھ مار والے انداز میں سر ہلانے پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”بالکل ٹھیک کہا، ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے انفیکٹ میں تو آ بھی اسی سلسلے میں رہا تھا لیکن جو نہی رستے میں ہما کو دیکھا تو میرا تو دماغ گھوم کر رہ گیا۔ مجھے لگا یہ آپ کی سازش ہے تاکہ میں کیس پر اچھے سے فوکس نہ کر سکوں اور کمانڈ آپ کے ہاتھ آ جائے۔ اس لیے تھوڑا غصہ ہو گیا تھا میں، اس کیلئے معذرت۔“ اس کی بودی دلیل، بودی معذرت اور سفید بہتان پر شینزل کا حلق پورا کا پورا کڑوا ہو گیا۔ بات کردار کے علاوہ بھی کوئی اور ہے وہ یہ جان گئی تھی۔ قیس کے غصے نے ہی کہہ دیا تھا سب، اب چاہے وہ لاکھ بہانے گھڑ لے سر اتو شینزل کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کے اختتام تک بھی وہ پہنچ ہی جائے گی۔

”تم نے فائلز میں جو ہیڈ لائنز کی ہوئی ہیں وہ کافی انفارمیٹو ہیں یعنی دولٹ کے قتل ہوئے، دونوں کی عمریں ایک ہی ہیں۔ ایک ہی وقت میں قتل ہوئے اور ایک ہی مقام پر ملے بس کچھ ریڈیس کا فاصلہ تھا مگر سپاٹ وہی تھا یعنی خدا نخواستہ اگر ایک اور قتل ہوتا ہے تو ہمیں اس جگہ کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اور سب سے اہم لائن جس کو تم نے ہیڈ لائن کیا ہوا تھا وہ یہ کہ ڈیڈون قتل سے کچھ وقت قبل ایک نمبر پر کال کر رہا تھا۔ کال تب تک چلتی رہی تھی جب تک قتل ہوا تھا یعنی فون کے اس پار کوئی تھا جو واردات کو دیکھ نہیں بلکہ سن رہا تھا۔ وہ نمبر ایک لڑکی کا ہے۔ اس لڑکی کو آج ہم نے طلب کیا ہے۔“ اس کی ساری بات بہت تحمل سے سننے کے بعد قیس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

”غلط بات، ہمیں صرف پوچھنا چاہیے ایک لڑکی کو یہاں نہیں بلانا چاہیے بلکہ خود جانا چاہیے، تھانہ کچہری لڑکیوں کیلئے موزوں جگہ نہیں ہے۔“ وہ کھڑا ہوا تھا جب اس کی بات پر رک گیا۔ شینزل نے چھوٹے ہی جو کہا تھا وہ یہ تھا۔

”پولیس موبائل موزوں ہے؟“ قیس نے بھنویں اچکا کر گہرا سانس بھرا۔ اس سانس کا مطلب تھا ”شیزل کی سوچ کا کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اس کی سوچ میں شک کا عنصر غالب تھا۔ وہ جان گیا۔

”ہم وہاں میری جیپ میں جائیں گے اور آپ یونیفارم چھینج کر کے چلیں گی اینڈ دیٹس مائی آرڈر۔“ شیزل نے ابرو اچکائی۔ انگلی سے خود کی جانب اشارہ کر کے بولی۔

”تم مجھے اسسٹ کر رہے ہو۔ میں تمہیں نہیں۔“ انداز خاصا جتانے والا تھا۔ قیس کے لبوں پر دلفریب مسکان آن ٹھہری۔

”ویل، پاور اس وقت برابر ہے ہم دونوں کی۔ میں کرائم ونگ سے ہوں اور خاص طور پر بلایا گیا ہوں۔ ایک طرح سے یہ پورا کیس میرے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ میرے آرڈرز اتنے ہی حتمی ہیں جتنے کہ آپ کو سو۔۔۔۔۔ فالو مائی ورڈز۔۔۔۔۔ پلیز۔“

وہ اس کے تحکم بھرے انداز پر جل بھن گئی۔ شام میں وہ جب سب کام کر کے فارغ ہو کر گھر چلی گئی تب اس کے فون پر میسج آیا تھا۔ بھنے ہوئے پاپ کارن سے بھرا باؤل اپنے سامنے رکھے وہ اس میسج کو پڑھ رہی تھی جو قیس کی جانب سے آیا تھا۔

”دس منٹ میں پہنچنے والا ہوں۔“ یہ میسج پڑھ کر اس نے کسی اور کو بھی پیغام بھیجا پھر صوفے پر آلتی پالتی مارے وہ ڈاکو منٹری دیکھنے میں لگن ہو گئی۔ ابھی اس نے منہ میں تیسرا پھولا ہوا کارن ہی ڈالا تھا جب اس کی کال بیل بجی۔ اس نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا پھر اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے اونچی آواز میں پوچھنے لگی تاکہ آواز باہر والے تک پہنچ جائے۔

”کون ہے؟“ اور آواز پہنچ گئی تھی تبھی تو جواب آیا تھا۔

”ایک ناراض انسان۔“ احد کی آواز تھی۔ وہ خوشگوار انداز میں دروازہ کھولنے چلی گئی

جونہی اس نے دروازہ کھولا، سفید کاغذ میں لپٹے ہلکے گلابی پھولوں کا چھوٹا سا بکے اس کی طرف بڑھایا گیا۔

”کیا زبردست سر پرانز ہے جناب، کیسی رہی ٹریننگ۔“ اس کے ہاتھ سے بکے تھامنے کے بعد وہ اگلے اگلے چہرے کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔ بینگنی رنگ کا اس نے سادہ سا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ لمبی قمیض تھی اور اس کے ساتھ تھوڑا سا کھلا ٹراؤزر، جینز کی جیکٹ اور اس کے اوپر بینگنی رنگ کا ہی گرم اون کا سکارف جو گول گول کر کے گردن کے گرد لپیٹا گیا تھا مگر اس انداز میں کہ گردن اور قمیض کا کالر نظر آ رہا تھا۔ بالوں کا ڈھیلا ڈھالا بن بندھا تھا۔ چہرے کے اطراف میں دو چار پتلی پتلی سی لٹیں تھیں جو بامشکل تھوڑی کی کو چھو رہی تھیں۔

”ٹریننگ اچھی تھی۔ مابدولت کو پروموشن مل چکی ہے جس کی آپ کو ٹریٹ دینی ہے۔ ویسے کچھ زیادہ جلدی یاد نہیں آ گیا پوچھنا۔“ وہ اس کے شکوے پر اپنا سامنہ لے کر رہ گئی پھر سرد سانس خارج کر کے بولی۔

”آہ کیا بتاؤں تمہیں احد آج کل اتنی بزی ہوں کہ اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا بٹ پراس جب میں فری ہوں گی تو سب سے پہلے تمہاری طرف آؤں گی۔“ وہ اس کے تھکے سے انداز میں کہنے پر ہنس دیا۔

”ہاں بڑا دور ہے نامیرا گھر جیسے۔“ اس کا شکوہ بجا تھا اور شیزل کی تاویل۔

”تمہارا گھر دور نہیں ہے میرا کام مجھے دور کر رہا ہے۔ وقت ہی نہیں دیتا کہ کچھ کر سکوں۔“

اب احد سنجیدہ ہوا تھا۔ گرے آنکھوں میں گھور سنجیدگی اتر آئی تھی۔

”تو تمہیں تو کب سے کہہ رہا ہوں میں، چھوڑ دو یہ جاب، میری کمپنی میں آ جاؤ بہت اچھی پوسٹ پر تمہیں اپائنٹ کروادوں گا میں۔“ شیزل نے نچلے لب کاٹتے ہوئے اپنی گردن کو کھجایا

پھر اس کی پیش کش کو رد کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں جب میں جاب ڈھونڈ رہی تھی تب ملی نہیں تھی تو اب کیا فائدہ اور ویسے بھی میں اپنے بل بوتے پر کچھ کرنا چاہتی ہوں کسی کی سفارش سے نہیں تمہارے کنسرن کیلئے بہت شکریہ لیکن۔“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی وجہ لفٹ کی مخصوص آواز فضا میں منتشر ہونے کے بعد اس کے پٹ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ آنے والے کو دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ جبکہ وہ ان دونوں پر نظر گاڑے لفٹ میں ہی کھڑا رہ گیا۔

”اوہ، تمہارے ساتھ باتوں میں لگ کر میں بھول گئی کہ مجھے کیس کے سلسلے میں جانا تھا۔“ قیس کی سرد نظروں کو نظر انداز کر کے وہ احد سے کہہ رہی تھی جس کے لبوں پر ہمہ وقت رہنے والی مسکان بڑی پیاری تھی۔

”تبھی میں کہوں مجھے اندر کیوں نہیں بلایا، چلو کوئی نہیں پھر کبھی سہی اچھا ہاں یاد آیا ماں نے تمہارے لیے رس ملائی بنائی ہے فلیٹ کی کیز دیتی جاؤ فریج میں رکھ دوں گا۔“ اس کی پھیلی ہوئی چوڑی ہتھیلی تھی قیس کی خاموش سرد، ٹھٹھراتی ہوئی نظریں۔

”آکر لے لوں گی۔“ مصلحت کا دامن تھا مگر اس نے فیصلہ کیا تھا جس کا احترام احد نے کیا۔

”ٹھیک ہے پھر۔۔ اپنا خیال رکھنا۔“

وہ مڑا۔ اس کی نظر لفٹ کے دروازے میں پاؤں اڑائے کھڑے قیس پر پڑی۔ وہ اسے مسکراہٹ پاس کرتا ہوا اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ شیزل پھولوں کا بکے لے کر گھر کے اندر گئی تھوڑی دیر بعد فون اور واکی ٹاکی لے کر جب باہر آئی تو دیکھا قیس جوں کا توں لفٹ میں ایستادہ ہے۔ اس کے دل میں نا جانے کیوں ٹھنڈ بڑھنا شروع ہوئی۔ گھر کو لاک کر کے، گلا کھنکارنے کے بعد وہ لفٹ میں اس کے برابر آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ قیس نے دروازے سے

پاؤں ہٹا لیا پٹ جھٹکے سے ایک دوسرے سے ملے تھے جیسے میلے میں پچھڑے ہوئے ماں اور اس کے بچے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کی بھی دیری کیے بنا، والہانہ انداز میں۔ لفٹ میں وہ بالکل خاموش تھا گاڑی میں بیٹھنے تک وہ خاموش رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ہما کو بھی وہاں دیکھ کر کوئی واویلا نہیں کیا تھا۔ ہما اس کے برابر جیپ میں بیٹھی تھی جبکہ وہ پیچھے پہلے ہی جا کر بیٹھ گئی تھی۔ جیپ انجان رستوں سے گزر کر ایک گھر کے آگے آ کر رکی۔ وہ تینوں ایک ساتھ نیچے اترے تھے۔ فیس کیلئے گیٹ کھولا گیا تھا۔ اس کی جیپ کو پورچ میں جگہ دی گئی تھی۔ گرے جینز پر گرے ہی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی ہاں بس شوز اور جیکٹ کا رنگ سفید تھا۔ وہ اپنے آدھے سفید اور آدھے گرے شید دیتے گلاسز کو آنکھوں پر جگہ دیے شینزل اور ہما کے پیچھے چل رہا تھا۔ ان تینوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ان تینوں کے آگے اورنج جوس سرو کیا گیا جسے ان تینوں میں سے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں سست روی سے آگے بڑھ رہی تھیں جب ایک نو عمر لڑکی ڈرائنگ روم کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ دراز قد، بیگی جینز، کھلا ٹاپ اور دائیں بائیں شانے پر گرے بال۔ ہما اور شینزل نے اس لڑکی کے چہرے پر زور سنس دیکھ لی تھی۔ وہ جب ڈرائنگ روم میں آئی تھی تو اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ اس کا باپ، بھائی اور ماں بھی تھی۔ وہ تینوں اس سے ناراض تھے کہ اس نے یہ بات ان سے مخفی کیوں رکھی۔ ان کے منہ پر بارہ اس لیے بھی بچ رہے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو تفتیش سے بچانے کیلئے باہر نہیں بھیج سکے تھے۔ شینزل نے ان کے منہ پر بجے بارہ کو اگنور کیا اور بات کا آغاز کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ سب ایزی ہو جائیں ہم یہاں صرف تھوڑی سی پوچھ تاچھ کرنے آئے ہیں۔“ اس کے اعلان سے بھی کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ سب تاہنوز ویسے ہی بیٹھے تھے جیسے پہلے

بیٹھے ہوئے تھے۔

”تو ملائکہ تم اس لڑکے کو جانتی ہو۔“ اس نے اپنی جینز کی جیکٹ میں سے تصویر نکال کر سامنے کی۔ سب کی نظر اس ہنستے مسکراتے چہرے والے لڑکے پر پڑی۔ ملائکہ نے آہستہ سے ہاں میں سر ہلا دیا۔

”گڈ، پھر تو تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ اس کا قتل ہو چکا ہے۔“ اس لڑکی نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ہمارے بڑی محویت سے ملائکہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو نوٹ کر رہی تھی جبکہ قیس وہ تانہوز ٹھس اور خاموش بیٹھا تھا۔

”ہم، تمہارا دوست تھا وہ یا بوائے فرینڈ؟“ لڑکی کے بھائی کو یہ سوال ناز یا گزرا تبھی وہ درمیان میں کود پڑا۔

”آپ میری بہن سے ایسے واہیات سوال نہیں کر سکتیں۔“ اس کا انداز گستاخانہ تھا۔ لڑکی کے باپ نے اپنے بیٹے کے ہاتھ کو بھیج کر اسے شانت رہنے کا اشارہ دیا۔

”واہیات حرکتیں کرنے کے لیے اپنے گھر کی عورتوں کو چھوٹ ہی نہ دیا کرو۔ چھوٹ نہیں دو گے تو بھڑکنے کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔“ سنجیدہ سے قیس نے ٹھنڈے ٹھارانداز میں باپ کے بیٹے کو جلا دیا۔ شیزل نے ہلکی سی گردن موڑ کر اس کو دیکھا پھر سیخ پا سے اس کے بھائی کو سننے لگی جو کہہ رہا تھا۔

”سرتھوڑا سا تو لحاظ۔“

”تفتیش شروع کریں میڈم، باقی عوام باہر جائے۔“ کھر درے اور ٹھوس لہجے میں بات درمیان میں قطع کرنے کے بعد وہ آنکھ کے اشارے سے انہیں آؤٹ ہونے کا کہہ رہا تھا جس پر وہ تینوں اپنے دانت پیستے وہاں سے چلے گئے۔

”ہاں تو میں کہاں تھی یاد آیا وہی تمہارا بوائے فرینڈ تھا رائیٹ؟“ ملائکہ گھبرا رہی تھی۔ اسی گھبراہٹ کے ساتھ پھر سے لب سے اثبات میں گردن ہلا گئی۔

”تم دونوں کے ریلیشن کو زیادہ عرصہ ہوا تھا یا کچھ مہینے۔“ اب کی بار اس نے لب ہلائے تھے۔
”کچھ مہینے۔“ شیزل نے ہاتھ پھیلا دیے۔

”آل رائیٹ، مجھے وہی کے بارے میں جانتا ہے۔ وہ کس طرح کا انسان تھا۔ کیا کیا کرتا تھا۔ دشمنی دوستی سب۔“ ہما نے فون کو میز کے وسط میں رکھ دیا۔ اس لڑکی کا ایک ایک بیان نوٹ ہو رہا تھا۔

”یہ سب آپ اس کے گھر والوں۔“ بات کاٹی گئی۔ ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں کاٹی گئی۔
”ہم اپنا کام جانتے ہیں جو کہا ہے اس کا جواب دو ورنہ اور بھی طریقے ہیں اگلوانے کے۔“ شیزل نے بگڑے ہوئے اس لڑکے کو دیکھا جو انتہائی بدتمیز اور روڈ تھا۔ ہما نے قیس کے طرز پر جھٹکے سے بھنویں اچکا کر گرائیں۔ کڑوا سا وہ انسان کڑوے طریقے سے ہی پیش آرہا تھا کیوں؟ آئی تھنک آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے۔

”کیا ہو گیا ہے؟“ شیزل نے سرگوشی میں اسے ٹوکا۔ قیس نے ٹیک چھوڑ کر خود کو آگے کیا۔
تھوڑا سا اوپر اٹھ کر اس نے بیلٹ میں انکی پٹل نکال کر لڑکی کے سامنے میز پر رکھ دی۔
”بولنا شروع کرو بچے، ورنہ اس کی آواز سے انسان کی آواز ایک جھٹکے میں ہی بند ہو جاتی ہے۔“ شیزل آنکھیں دکھا رہی ہے۔ ہما گھور رہی ہے اسے بالکل فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کا دل برا ہوا تھا اور یہ سب اس کا ری ایکشن تھا۔

”وہ، وہ میرا کلاس فیلو تھا۔“ ملائکہ ڈر گئی۔ ڈرنے کے دوران ہی کہنا شروع ہوئی۔
”شروع میں ہم دوست بنے بعد میں ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنے رشتے کو آگے بڑھانا

چاہیے۔ اسی دوران جب میں اس کے ساتھ تھی مجھے پتا چلا وہ نہرین میں انٹرسڈ تھا اور اسے بارہا پرپوز بھی کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی تھی اس کے کیا وہ تو کسی بھی لڑکے کو لفٹ نہیں کراتی تھی۔ کیونکہ وہ تھوڑی مذہبی تھی۔ سر پر ٹرکس ٹرین ہوتی تھی اور گلے میں سکارف، وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایٹی ٹیوڈ والی بھی تھی۔ کالج کے بہت سے لڑکے اس کے پیچھے تھے۔ مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے وہی اور اس کے گینگ کو طیش میں مبتلا کر دیا تھا۔“ ہمارے اسے ٹوکا۔

”وہی اور اس کا گینگ، یعنی کون کون؟“ ملائکہ نے گہرا سانس بھرا۔

”وہی، فیصل، عبید، مہران اور خرم، یہ پانچ کا گینگ تھا۔ سب ہائی کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ سب بگڑے ہوئے تھے۔ ان سب نے ہی مل کر نہرین کو ٹارچہ کیا تھا۔ اسے کڈنیپ کیا تھا۔ سگریٹ سے اس کا منہ جلایا تھا اور۔“ روتے روتے اس نے انکشاف کرنا شروع کیے کرنے کے بعد اچانک ہی چپ ہو گئی۔ اس کے چپ ہونے کی وجہ سے ہی شیزل نے غیر آرام دہ انداز میں پہلو بدلا تھا۔ کسی کا چہرہ ست چکا تھا۔ کسی کے چہرے پر نفرت کے آثار امانڈ آئے تھے۔

”اور انہوں نے، انہوں نے اس کا ریپ۔“ وہ رک گئی تھی۔ قیس ایک جھٹکے سے کھڑا ہو کر ونڈو کے قریب گیا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دانت پیسے وہ آنکھیں میچے کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر خفیف سا جھکا تھا اور ناک کی نوک موٹے مٹی رنگ کے پردے کو چھو رہی تھی۔

”تمہیں یہ سب کیسے پتا؟“ شیزل کی آواز نے بھی اس کے درد کو کم نہیں کیا تھا۔ کوئی بھی اس کے درد کو کم نہیں کر سکتا تھا۔

”میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ دیکھیں مجھے میری فیملی نے کوئی بھی بات کرنے سے منع

کیا تھا لیکن میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا کیونکہ میں چاہتی ہوں نہرین کے مجرموں کو سزا ضرور ملے، آپ لوگ، آپ لوگ مجھے تواریسٹ نہیں کریں گے نا۔“

اب کی بار شینزل کی جگہ ہما بولی تھی۔ وہ مسکرائی اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔
”تم ہمارے ساتھ کا پریٹ کرو، ہم تمہارے ساتھ کریں گے ابھی تم نے کہا کہ تم نے وکی کی باتیں سنی تھیں۔ باتیں تو تم نے اور بھی سنی تھیں یعنی وکی جس رات قتل ہوا اس رات وہ تم سے بات کر رہا تھا۔ قتل کے دوران اس کا فون آن تھا اور کال چل رہی تھی۔ اس کے بعد سب غائب، کیا تم مجھے قاتل اور مقتول کے درمیان ہوئی بات چیت بتا سکتی ہو۔“ ملائکہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ بھاری سی آواز تھی۔ وکی اسے دھمکی دے رہا تھا اور وہ وکی پر ہنس رہا تھا۔“ شینزل نے دھیان قیس سے ہٹا کر ملائکہ کی جانب کیا۔ اس کا چونکا ہوا سوال برجستہ تھا۔

”ایک منٹ، ہنس رہا تھا؟ یعنی کوئی آدمی تھا۔“ سر ایک بار پھر اثبات میں ہلا۔
”بالکل ایسا ہی ہے۔ وہ ایک آدمی تھا جو اس کی باتوں پر ہنسنے کے بعد اسے موت کو یاد کروا رہا تھا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ وہ چیخے شاید، شاید وہ پہلے ہی اسے زخمی کر چکا تھا تبھی وکی بری طرح کراہ رہا تھا۔ پھر کافی دیر کی چیختا گیا اور اس کے بعد میں نے بھاری آواز میں دی اینڈ کی آواز سنی اور پھر خاموشی چھا گئی، خاموشی کے بعد کافی دیر تک سیٹی کی آواز گونجتی رہی پھر وہ بھی بند ہو گئی اور کال ڈسکنیکٹ ہو گئی۔“ قیس نے آنکھیں کھول کر رخ ان لوگوں کی جانب کیا۔ اس کے سر میں ٹیسس اٹھنی شروع ہو چکی تھیں۔

”تمام شد، مجھے پہلے ہی شک تھا ایسا ہی کچھ ٹکلنا ہے۔ وہ ہی گھسی پٹی ریپ سٹوری وہی گھسا پٹا کوئی ہیرو جو بدلے کی خاطر قتل کر رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے آج کی جنریشن کو ہما، قتل ریپ

کڈنپنگ ٹارچرنگ دم گھٹنے لگا ہے میرا تو اب۔“ زچ سے انداز میں وہ کھڑی ہوئی۔ اس کی تقلید ہمانے بھی کی تھی۔ قیس جب باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں اس لڑکی کا فون تھا جسے وہ ضبط کر چکا تھا۔

”اس کا مطلب ہے اب ہمیں عبید، فیصل اور خرم پر کام کرنا ہے۔ ان پانچوں نے گناہ کیا ہے تو یہ پانچ ہی نشانے پر ہیں اور جہاں تک میرا دماغ کام کر رہا ہے اگلا نمبر مہراں کا ہونا ہے۔ چلو ڈیٹیلز تو مل گئی ہیں تو ان لڑکوں کے گھروں تک بھی پہنچتے ہیں ہم ابھی تو فی الحال بھوک لگ رہی ہے کچھ کھائیں پاس کے ریسٹورانٹ سے۔“ ہما کی تجویز رد کی گئی۔ جس طرف سے ہوئی تھی اس طرف کا گمان وہ کر سکتی تھی لیکن جس انداز میں ہوئی تھی اس کا گمان اسے نہیں تھا۔

”میرے پاس فالٹو وقت نہیں ہے اور نہ ہی میں ڈرائیور ہوں جس نے جو کرنا ہے جہاں جانا ہے خود جائے، میری طرف سے معذرت۔“ شیزل نے بڑی تفصیل سے اس کا معائنہ کیا۔ نظروں کو شیشے پر جمائے، بھیجنے ہوئے لبوں کے ساتھ وہ ایک ہاتھ سے سٹیرنگ کو تھامے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ دکھ تھا۔ تکلیف تھی اور، اور بھی بہت کچھ چیزیں تھیں جنہیں کھوجنے اگر وہ بیٹھ جائے تو شاید صدیاں بیت جائے۔ اس نے نظریں نیچی کیں۔ ہما گرم کانوں کے ساتھ لب بھیج گئی۔ سیاہ تارکول کی سڑک پر سیاہ ٹائر برق رفتاری سے آگے کی جانب گامزن تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ آج کوئی مر رہا ہے۔ اس بات سے یکسر نا آشنا کہ آج کسی کا وقت آیا ہے بہت برا وقت۔

☆.....☆.....☆

”کہاں کی تیاری ہے؟“

”ادھورے کام کی۔“

”لیکن ہم نے تو ڈسائیڈ کیا تھا اسے تھوڑی سپیس دیں گے۔“ تضحیکی مسکان۔

”وہ اس قابل نہیں ہے۔“

”ایسے مت کہو، اچھی انسان ہے۔“

اچھا انسان جب برائی پر آمادہ کر دے تو وہ اچھا نہیں رہتا پھنسا تو اسے پڑے گا ہی۔“
”کیا پلان ہے پھر۔“

”کچھ خاص نہیں پارسل جائے گا محبت بھرا پارسل۔“

لیب میں اس وقت سعد کام میں مصروف تھا۔ اس کے بدن پر سفید کوٹ تھا اور آنکھوں پر سفید بڑے بڑے گلاسز، وہ ایک شیشے کے چھوٹے سے کنٹینر میں کسی لیکوئڈ کا قطرہ ڈال رہا تھا جب نشاء ناک کر کے اندر آئی۔ اس کے آنے پر جھکے ہوئے سعد نے گردن موڑی پھر واپس سیدھی کر کے گویا ہوا۔

”آج اس غریب خانے کی کیسے یاد آگئی آپ کو۔“ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی اور اس کے سامنے میز کے اس پار دونوں ہاتھ رکھ کر تھوڑی جھک کر کھڑی ہو گئی بالکل ویسے جیسے وہ کھڑا تھا۔ بس فرق اتنا تھا وہ قطرہ قطرہ کنٹینر میں ڈال رہا تھا اور نشاء اس کے گلوں چڑھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”بھائی میرے یاد تو ہر وقت آتی ہے بس مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے کہ وقت نہیں ملتا۔“ وہ اس کے ”بھائی میرے“ کہنے پر چکرا کر رہ گیا۔

”دیکھو مجھے بھائی نہ کہا کرو۔“ اس نے وارن کیا جس پر نشاء مسکرائی۔

”ورنہ کیا کرو گے۔“ سعد نے سفید لمبی میز پر سلیقے سے رکھی ڈھیر ساری شیشیوں پر ایک نظر دوڑائی مطلوبہ شیشی ملنے پر اسے اٹھا کر ہوا میں لہراتا ہوا گویا ہوا۔

”ورنہ یہ پوری کی پوری تمہارے حلق میں انڈیل دوں گا اور آئی مین اٹ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی یہ ہنسی دروازے کے اس پار گزرتے قیس کی سماعت سے بھی ٹکرائی تھی۔ وہ لمحہ بھر کیلئے وہاں رک گیا۔

”اچھا اس سے کیا ہوگا۔“ قیس نے ہلکا سا دروازہ کھولا۔ نشاء اور سعد ایک ساتھ کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک نظر اس شیشی پر ڈال کر اس نے دروازہ واپس بند کر دیا۔ اس کی سماعت سے سعد کے الفاظ بھی ٹکرائے تھے جو کہ یہ تھے۔

”اس سے تم ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤ گی، چلو گی پھر و گی لیکن اپنے کنٹرول میں نہیں رہو گی اور تب میں تمہیں سوئمنگ پول میں دھکا دے دوں گا وہ بھی سب کے سامنے۔“ نشاء کا منہ اس کے ارادوں سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے بولنے میں وقت لگا۔

”یعنی تمہیں ذرا شرم نہیں آئے گی ایسا کرنے میں۔“ سوال کا جواب برجستہ تھا۔

”ناہ، بالکل بھی نہیں اور اب مجھے کام کرنے دو ورنہ خرانٹ میڈم نے میری اچھی خاصی کلاس لے لینی ہے۔ ان کی تو گھوریاں بھی کافی خطرناک ہوتی ہیں۔“ نشاء بھی اس کی بات پر جھرجھری لے گئی۔ اتفاق سو فیصد تھا۔

”صحیح کہہ رہے ہو ویسے۔۔۔ ایک بات شنیر کروں تم سے۔“ اس نے کچھ سوچ کر کہا جس پر سعد سر ہلا گیا۔

”ہمم، ہم، کرو۔“ نشاء رازدارانہ انداز میں تھوڑی آگے ہوئی۔ سعد نے آخری ڈراپ کنٹینر میں ڈالا۔ وہ چوتھائی بھر چکا تھا جوں جوں قطرے سفید کنٹینر میں جا رہے تھے توں توں اپنا رنگ بدلتے جا رہے تھے۔ نیلا رنگ ہر سو تھا۔

”شینرل میم اور قیس سر کے بیچ میں کچھ ہے کیا میرا مطلب ہے میں نے نوٹ کیا ہے قیس

سرکا ان کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ وہ انہیں فوقیت دیتے ہیں۔“ سعد سیدھا ہوا، ہاتھوں سے گلوں اتارے پھر آئی بالز کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے بولا۔

”ایسا کیا، کیا واقعی؟“ نشاء نے زور زور سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

”ہاں نا، تم نے غور نہیں کیا وہ کس والہانہ انداز میں میم کو دیکھتے ہیں۔ ان کی بات کو، رائے کو اول رکھتے ہیں اور سب سے اہم بات ان سے ڈرتے بھی ہیں۔“ سعد اچھل پڑا۔ جلدی سے میز کو کراس کر کے اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔

”ڈرانے والی صفت تو میم میں ہے لیکن جو تم کہنا چاہ رہی ہو وہ میں کچھ سمجھ رہا ہوں۔ کیا معاملہ دونوں طرف سے ہے۔“ نشاء نے ہاتھ جھلایا پھر تاسف سے گویا ہوئی۔

”ہرگز نہیں، میں نے اکثر دیکھا ہے میم انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنی ہیں۔ ہک ہا، اتنا ڈیشنگ، ٹیلنڈ لڑکا لفٹ کروا بھی رہا ہے تو کسے، لڑکوں کی خصلت میں آچکا ہے اپنے سے بڑی لڑکیوں پر ٹرائے کرنا بندہ آس پاس نظر ہی دوڑا لیتا ہے۔“ سعد اس کے کردار کے لچکیلے پن سے خائف ہوا۔ ففتی پرسنٹ بند آنکھوں کا دیکھنے کا شائل بھی تو ویسا ہی تھا۔

”بڑی ہی کوئی گھٹیا قسم کی بات کی ہے تم نے ویسے، شرم کرو سنئیر ہیں ہمارے۔“ نشاء اس کے جلیس ہونے پر تھوڑی پھولی پھر شرارتا گویا ہوئی۔

”سنئیر ہیں اور سنگل بھی چانس تو بن سکتا ہے نا۔“ تبھی یکدم بھاری جتنے والی جاسمین اندر داخل ہوئیں۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں پر۔“ کھردی آواز، لٹھ مارتا انداز، سخت قسم کا سوال۔

”وہ ہم کیس کو ڈسکس کر رہے تھے۔“ جاسمین نے رک کر دو منٹ ان دونوں کے چہروں

کوٹھولا، وہ جان گئیں یہ دونوں یہاں پر کس کیس میں مصروف تھے۔ کلاس لینا چاہ رہی تھیں مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔

”اپنے کیس بعد میں ڈسکس کرنا پہلے اس مصیبت پر کام کر لو جو سر پر منڈلا رہی ہے۔ سعد، مسخ ہوئے چہرے والے کی لاش کدھر ہے؟“ تھوڑا سا ڈپٹنے کے بعد انہوں نے سوال کیا تھا جس کا الجھنے والے انداز میں سعد نے جواب دیا۔

”وہ مردہ خانے میں ہی ہے۔ اس کی شناخت ہو چکی ہے۔ اس کا نام فیصل ہے۔ عمر یہی بیس اکیس کے درمیان کی ہے۔“ جاسمین کے ہاتھ سینے پر بندھے تھے اور ابروتنی تھی۔

”میں نے اتنا لمبا سوال کیا تھا۔“ نجلا ہٹ کے آثار نشاء اور سعد دونوں کے چہرے پر طاری ہو گئے۔ شیزل کیا کم تھی ان کیلئے جو آج یہ بھی شروع ہو گئیں۔

”سوری میڈم۔“ وہ منمنایا، جاسمین ہاتھ جھلاتے ہوئے وہاں سے گئیں۔ ان کے جاتے ہی دونوں نے ایک آزاد سانس خارج کیا۔

”انہیں کیا ہو گیا اور یہ کیوں پوچھ رہی ہیں سب۔“ نشاء نے شانے اچکائے۔
”اللہ ہی جانے، یہاں تو یونہی ہر کسی کو دورا پڑتا رہتا ہے۔ میں تو بابا جاؤں یہ نہ ہو پھر سے کلاس لگ جائے۔“

وہ فوراً لب سے باہر آئی تھی۔ یہاں سے دور، بہت بہت دور اُحد اپنے لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر گلاسز لگے تھے اور گردن کے گرد ہلکی گلابی رنگ کی ٹائی بندھی تھی۔ اس نے سفید رنگ کی فارمل شرٹ پہنی ہوئی تھی جس پر چاندی کے سٹڈ لگے تھے۔ گلابی لب بھنچے ہوئے تھے اور دراز انگلیاں برق رفتاری سے کی پیڈ پر چل رہی تھیں۔ اس کی کلائی میں بندھی گھڑی شام کے سات بجنے کا پیغام دے رہی تھی۔ آج ٹھنڈ کم تھی تبھی اس

نے اپنے کوٹ کو کرسی کی بیک پر پھیلا یا ہوا تھا۔ رحمت کو اگر پتا چل جائے تو وہ اس کی اچھی خاصی کلاس لیں لیکن صد شکر انہیں پتا نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچ پر مسکرایا دفعتاً اس کا فون وائبر یٹ کرنے لگا۔ ماں کا لنگ کے الفاظ اسکرین پر جگمگانے لگے تھے۔ اس نے سبز بٹن کی اور انگوٹھے کو سکروں کیا پھر دایوم آن کر کے گرمجوشی سے سلام کرنے لگا۔

”سلام دعا بعد میں پہلے یہ بتاؤ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔“ اس کی نظریں اسکرین پر تھیں اور کان آواز پر دماغ انگلیوں کے پوروں کو ہدایت دے رہا تھا تبھی وہ بنار کے کی پیڈ پر چلے جا رہی تھیں۔

”بس آج کام کچھ زیادہ تھا اس لیے لیٹ ہو گیا ہوں آپ بتائیں ڈنر کر لیا۔“ ماں کی خفا سی آواز انیرپس سے ابھری جسے سن کر وہ مسکرا دیا۔

”تمہارے بغیر پہلے کبھی کھایا ہے ناراض کر دیتے ہو ایسا سوال پوچھ کر۔“ اس نے وقت دیکھا سو اسات ہونے والے تھے۔ سردیوں کے دن چھوٹے ہوتے ہیں اس لیے رات جلدی آ جاتی ہے۔ سورج چھپنے میں بے صبری کرتا ہے اور چاند نکلنے میں، ان دونوں کی آنکھ مچولی ان لوگوں کو بہت بھاتی ہے جو ان دنوں کے رسیا ہوتے ہیں اور وہ ان دنوں کا رسیا تھا۔

”ماں بہت بری بات ہے۔ آپ جانتی ہیں ناکہ آپ کو میڈیسن وقت پر لینی ہے پھر بھی آپ لیٹ کر دیتی ہیں۔“ اس نے انگلیوں کو مزید رفتار سے چلانا شروع کیا جتنا جلد ہو سکتا تھا وہ گھر جانا چاہ رہا تھا کیونکہ وہ اچھے سے جانتا تھا چاہے لاکھ انہیں سمجھالے جب تک وہ گھر نہیں جائے گا ماں کھانا نہیں کھائیں گی۔

”یہ بات تو تمہیں یاد رکھنی چاہیے ہزار بار کہا ہے وقت پر آیا کرو گھر مگر نہیں تمہیں تو اپنی من مانی کرنی ہے۔“ اس نے آخری لائن ٹائپ کی، فائل سیو کی اور پھر لیپ ٹاپ کو بند کر دیا۔

”ماں کام ہوتا ہے اس لیے دیر ہو جاتی ہے۔ آپ فکر نہیں کریں میں بس پندرہ منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔“

رحمت نے ٹھیک ہے کہہ کر کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ اس نے کرسی کی بیک پر بچھا کوٹ اٹھا کر پہنا پھر اس پر لانگ کوٹ بھی چڑھا لیا۔ ایک بار پھر سے رسٹ وایچ میں وقت دیکھ کر وہ گاڑی کی چابی اٹھاتا باہر آیا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں گھور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اکادکا کاریں تھیں جو ساکن کھڑی تھیں۔ اس نے دور سے ہی اپنی سو یک کو ان لاک کیا اور پھر اس میں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ چڑھا لیا۔ گاڑی کو ریورس کر کے اس نے پارکنگ لاٹ کی ڈھلوان کو کراس کیا اور کچھ ہی دیر میں روڈ پر آ گیا۔ سگنل جام تھا۔ بکے بیچنے والے رنگ بہ رنگ پھول بیچ رہے تھے۔ اس نے خاکی کاغذ میں لپٹا سرخ پھولوں کا بکا خریدا جس کے ارد گرد سفید شاخیں سی نکلی ہوئی تھیں۔ اس بکے کو خریدتے وقت اس کے لبوں پر بڑی مبہم سی مسکان تھی۔ لفٹ میں کھڑے ہونے تک وہ شینزل سے ٹکرا جانے کی دعائیں کر رہا تھا مگر اس کی آج کی دعا کسی بہتر وقت کیلئے ٹل گئی۔ وہ شینزل سے ٹکرایا نہ ہی اس کا دروازہ کھلا تھا۔ گہرا سانس بھر کر اس نے مہکتے پھولوں کا بکے جو نہی اس کے دروازے کی سائیڈ پر رکھا اسے غیر معمولی سا احساس ہوا۔ نیم اندھیرے کاریڈور میں دروازے کی جھری میں سے اسے شینزل کے گھر میں کوئی سایہ سا نظر آیا تھا جو اس کے پاؤں سے ٹکرا رہا تھا۔ احد رکوع کے سے انداز میں جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ نے بکے کے خاکی کاغذ کو ہولے سے چھوڑا، نظریں اپنے بوٹوں پر ڈالیں جہاں کسی چیز کا سایہ موجود تھا۔ دروازے کی جھری کو چیر کر نکلتا ہوا سایہ اب اس کے بوٹوں سے پھسل کی دوسری جانب جا رہا تھا۔ احد سیدھا ہوا۔ اس نے دروازے کے لاک کو دیکھا سرخ باریک سا بٹن روشن تھا یعنی دروازہ باہر سے لاکڈ تھا تو پھر اندر کون تھا؟ کیسے تھا؟ اور کیوں تھا؟ اس نے محتاط

انداز میں دوا انگلیاں دروازے پر رکھ کر بجا نہیں۔

”شینزل، گھر ہو؟“ انداز ایسا تھا جیسے وہ حقیقت سے قاصر ہو۔ سایہ یکدم رکا۔ اس کی نظریں اپنے سیاہ بوٹوں پر ہی تھیں جن پر سیاہ سایہ ایک بار پھر سے رک چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سے ناک کیا۔

”شینزل کیا تم گھر ہو؟“ جامد سایہ میں اب حرکت آئی تھی۔ وہ شاید تیزی سے آگے کی سمت بڑھا ہوگا تبھی کھنچتا چلا گیا۔ احد نے کوٹ کی جیب سے فون نکال کر نمبر ڈائل کیا۔ لفٹ کی جانب جاتے ہوئے اس کے دماغ میں الارم بج رہا تھا تبھی وہ عجلت میں کال کے پک ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔

”کم آن، کم آن، کم آن۔“ سرگوشی میں کہتے ہوئے اس نے اپنی رواں مونچھوں کو رگڑا، تیسری بار نمبر ڈائل کرنے پر کال اٹھائی گئی تھی تب تک وہ لفٹ میں کھڑا ہو چکا تھا۔ سگنل آ رہے تھے تبھی اس کی بات ہو سکی، کال نہیں کٹی۔

”شینزل، تم نے اپنے اپارٹمنٹ کی چابی کسی کو دی تھی یا لاک بتایا تھا؟“ شینزل نے ایک نظر اپنی ٹیم کو دیکھا پھر باہر آ گئی۔ وہ سب اس وقت مہران کی طرف جانے کی تیاریوں میں تھے۔

”نہیں ایسا کیوں پوچھا؟“

احد اپنے شک کے درست ہو جانے پر گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

”کیونکہ تمہارے گھر میں کوئی ہے۔ لاک کی لائیٹ آن ہے مگر اندر کوئی ہے۔“ اور وہ کوئی جو بھی تھا چپکے سے جہاں سے آیا تھا وہیں سے چلا گیا۔ احد بلڈنگ کے باہر آیا۔ جہاں ان دونوں کا اپارٹمنٹ تھا اس کی بیک سائیڈ پر جانے لگا۔

”تھرڈ فلور والوں کی بلی بھی اکثر آ جاتی ہے وہی ہوگی۔“ وہ بلڈنگ کے عقب میں آیا مگر

وہاں کوئی بھی نہیں تھا کوئی بھی نہیں، اس نے متحیر انداز میں یہاں وہاں دیکھا، ندارد۔

”نہیں شیزل وہ کوئی بلی نہیں تھی وہ کوئی انسان تھا۔ میں نے خود اس کا سایہ دیکھا ہے بلی اور انسان میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ شیزل کے ماتھے پر دو بل پڑے۔ اس کے اپارٹمنٹ کی سپیرکیز ایک جاسمین کے پاس ہوتی ہے اور ایک اس کے خود کے پاس، جاسمین اسٹیشن میں موجود تھیں۔ یوں بھی بقول احد کے گھر کے اندر کوئی تھا لیکن باہر لاک کی لائیٹ آن تھی تو جو کوئی بھی گھر کے اندر گیا تھا وہ کسی ونڈو سے ہی گیا تھا۔ جاسمین اس طرح کی حرکت کر نہیں سکتیں کریں گی بھی کیوں، تو پھر اس کے گھر میں کون اور کیوں آیا تھا۔ اس کے دماغ میں سوال چلبلانے لگے۔ فیصلہ کیا اور بولی۔ ☆

”احد تم ارد گرد کا جائزہ لو میں دو منٹ میں آرہی ہوں۔“ اور وہ واقعی دو منٹ میں پہنچ گئی تھی۔ وہ جب بلڈنگ پہنچی تو احد اس کی بیک سائیڈ سے واپس آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر فوراً اس کی طرف لپکا۔

”کوئی کلیو ملا؟“ اندر بڑھتے ہوئے وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ لابی کو کراس کرنے کے دوران وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

”امم ہم، وہاں کچھ نہیں ہے مگر تمہارے گھر میں کوئی تھا ایم ڈیم شیور۔“ وہ دونوں ایک ساتھ لفٹ میں آن کھڑے ہوئے اس بات سے بے خبر کہ کوئی ریسپشن کے کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگا کر بڑی فرصت سے انہیں نہار رہا ہے ساتھ ساتھ ہاتھ میں موجود کافی کے ڈسپوز ایبل کپ سے گرم گرم کافی بھی حلق میں انڈیل رہا ہے، کوئی اندر سے جل رہا ہے۔

”چلو پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ آیا وہ تمہارا وہم تھا یا واقعی کوئی وہاں تھا۔ نہیں تو سیکنڈ آپشن ہے ہمارے پاس، کیمرے کی ریکارڈنگ چیک کر لیں گے۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کو

کسی نے کڑوی کافی کی طرح نگلاتھا۔ جونہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا وہاں کھڑا انسان بھی وہاں سے جھٹکے سے گیا تھا ہاں جاتے جاتے اس نے ڈسپوز ایبل کپ کو شدت سے ڈسٹ بین میں ضرور ڈالا تھا۔ احد اور شیزل آگے پیچھے لفٹ سے باہر نکلے، پاسورڈ اینٹر کرنے کے بعد اس نے فون سے منسلک اپنی چابی کو دروازے کے لاک میں لگایا، کلک کی آواز کے ساتھ وہ وا ہو چکا تھا۔ وہ محتاط انداز میں دروازہ کھول رہی تھی قبل اس کے کہ وہ اندر جاتی احد جلدی سے گھر میں گیا اور دروازے کی سائیڈ پر لگے سارے بٹن پر اپنی انگلیاں پھیر کر آن کر دیے۔ گھر منور ہو چکا تھا مگر وہاں فقط سناٹا تھا صرف اور صرف سناٹا۔ کوئی انسان وہاں ہوگا ایسے کوئی بھی شواہد نظر نہیں آرہے تھے۔ دونوں نے فرش ٹٹولنے کے بعد ایک نظر پورے اپارٹمنٹ میں دوڑائی جو نیٹ اینڈ کلین تھا۔ وہاں کسی کے بھی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔

”یہاں کوئی تھا شیزل، ٹرسٹ می، میں نے خود دیکھا تھا وہ یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں اس طرح سے چل رہا تھا۔“ اس نے باقاعدہ چل کر دکھایا، گھر کا مین ڈور اوپن تھا جس میں سے اس کا سایہ بالکل اسی انداز میں باہر جا رہا تھا جس طرح اس نے دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے پر خفت سے بل پڑ چکے تھے۔ شرمندگی چہرے پر آن ٹھہری۔

”میں وہاں پھول رکھ رہا تھا تو اس طرح سے ہی سایہ آیا اور میں چونک گیا، سچ کہہ رہا ہوں، تمہیں زحمت ہوئی نا۔“ آخر میں گرے آنکھیں اس کے چہرے کو ٹٹولنے لگی تھیں جو کسی بھی تاثر سے عاری تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اس کی نظر دروازے سے قدرے فاصلے پر موجود کنسول میز پر گئی جہاں اس نے رنگ بہ رنگی موم بتیوں کے درمیان میں ایک خوبصورت چینی کا واز رکھا ہوا تھا جو بالکل سفید اور سادہ تھا۔ اس میں کل کا باسی گلاب مرجھایا ہوا پڑا تھا۔ اس واز کے نیچے موجود سفید لفافے پر شیزل کی نظر پڑ چکی تھی۔ وہ کاغذ اس نے وہاں نہیں رکھا تھا رکھی تو اس نے

وہاں کافی کینڈی بھی نہیں تھی یعنی وہاں ضرور کوئی آیا تھا یعنی احد درست تھا۔

”کوئی بات نہیں احد، انسان جب تھکا ہوتا ہے تو وہم ہو جاتے ہیں آئی ریسیپیکٹ یور کنسرن اور مجھے بالکل بھی کوئی زحمت نہیں ہوئی سچ میں۔“ احد کے شانے ڈھلک گئے۔ اسے برا لگا کہ شینزل اس کی آنکھوں دیکھی چیز کو وہم قرار دے رہی ہے۔ وہ برا منا گیا۔

”وہم نہیں تھا شینزل، سچ میں کوئی تھا یہاں۔“ وہ گرے آنکھوں میں چھائی پریشانی پر مسکرا دی۔ تھکے سے چہرے پر خوبصورت سی مسکان۔

”اچھا ٹھیک ہے نا، زیادہ پریشان نہیں ہو میں ریکارڈنگ چیک کر لوں گی۔“ وہ اس کے پاس سے گزر کر دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی ہوئی پھر دائیں جانب سر کو گھما کر پھر سے مسکرائی۔ پنچوں کے بل بیٹھی۔ پھول اٹھائے پھر مڑ کر واپس اندر آ گئی۔

”پھولوں کیلئے شکریہ بہت پیارے ہیں یہ لیکن احد اچھا نہیں لگتا تم روز لے آتے ہو پھر یہ سوکھ جاتے ہیں۔“ اس نے احد کا ماسنڈ ڈائیورٹ کر دیا تھا۔ ”کوئی تھا“ کی سوچ اس کے دماغ سے جھٹک کر وہ پھولوں کی طرف لے آئی تھی اور کیا خوب انداز میں لائی تھی۔

”اچھا نہیں لگتا؟ میرا پھول لانا یا ان کا سوکھ جانا۔“ سیاہ ٹکسیڈو، سفید شرٹ پر گلابی ٹائی، سیاہ ہی بوٹ اور لانگ کوٹ، ہاتھ میں پکڑا سیاہ چمڑے کا آفس بیگ جس کی سٹرپ اس کے بوٹوں کو چھو رہی تھی اور سیاہ ہی ریسٹ وایچ، گرے آنکھیں، قدرے بکھرے بال، ناک پر ٹھہری تھوڑی سی سردی کی سرخی اور گلابی ہونٹ، وہ پٹھان تھا ایک یوسف زئی جس کی اردو میں بھی پشتو کا بچ آتا تھا۔ جس کی توجہ میں بھی مردانہ غرور تھا۔ جس کے ڈھکے چھپے اعتراف میں بھی اظہار تھا۔ شینزل نے چند لمحے خاموشی اختیار کی پھر صاف گوئی سے بولی۔

”دونوں، مجھے دونوں نہیں پسند۔“ احد کے چہرے پر رنگ آ کر گزرے تھے۔ اسے اپنی

سماعت پر یقین نہیں ہوا۔

”پہلے تو کبھی تم نے ایسا نہیں کہا تھا پھر اچانک کیا ہو گیا۔“ دھواں سا لہجہ تھا بکھرا سا انداز۔
”پہلے نہیں کہا تھا مگر اب کہہ رہی ہوں پلیز تم میرے لیے پھول نہیں لایا کرو مجھے یہ سب
پسند نہیں ہے۔“ احد کا دل ڈوب کر ابھرا۔ ڈبکی بہت گہری تھی۔ اس نے نظروں کو جھکایا۔ ایک
سوچ کا کوندا سا لپکا جسے اس نے لفظوں میں ڈھال دیا وہ پوچھ رہا تھا جو یہ تھا۔

”کیا تم مجھے پسند نہیں کرتی؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔“

”کیا میں برا ہوں، کرا در کا ہلکا ہوں؟“

”ہرگز نہیں کیوں کہہ رہے ہو ایسا۔“

”میری فطرت میں جھول نظر آیا تمہیں۔“

”نہیں۔“ وہ ترکی بہ ترکی اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی ہر جواب پر وہ

جھنجھلائے جا رہا تھا۔

”تو پھر گریز کی وجہ، انکار کی وجہ، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں شینزل، ماں سے بات
کر چکا ہوں اور تم مجھے کہہ رہی ہو تمہیں میرا پھول لانا پسند نہیں ہے کیوں؟“ اس نے جو جواب
دیا تھا اس نے احد کے قدموں سے زمین کھینچ لی اس کا جواب یہ تھا۔

”کیونکہ میں شادی شدہ رہ چکی ہوں۔ میری بیٹی پیدا ہوتے ہی مرگئی جس کا غم میں آج
تک نہیں بھولی ہوں اور بھی بہت سی حقیقتیں ہیں جنہیں تمہارا جاننا ضروری ہے لیکن میں ہمت
نہیں رکھتی بتانے کی اس لیے کہہ رہی ہوں لوٹ جاؤ۔۔۔۔۔ پلیز۔“

کوئی پہاڑ ٹوٹ کر گرا تھا۔ کوئی خواب ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ قوت گویائی کچھ لمحے کیلئے سلب

ہوئی۔ دل کچھ وقت کیلئے رک گیا۔ سانس اٹک گئی۔ اس کے دانت پر دانت جے تھے۔ گرے آنکھوں میں نمی کی پرت چڑھ چکی تھی۔ گلے کی ہڈی تواتر سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ پچھلے دو سالوں سے وہ ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ پچھلے دو سالوں سے وہ اس کی محبت میں مبتلا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے وہ کسی نہ کسی طرح اپنا اظہار اس کے سامنے کر دیا کرتا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے ہی وہ جھوٹی مسکان کے ساتھ اس کے ہر اعتراف کو درگزر کر رہی تھی مگر اب نہیں اب وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ”وہ“ آگیا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ چاہ کر بھی اس طرح کا قدم نہیں اٹھا سکتی تھی ہرگز نہیں۔

”تم نے، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ کیسا افسردہ سا گلہ تھا کیسا تھکن سے چور شکوہ۔
 ”میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔“ وہ مسکرایا۔ دل کی مسامری اس کی روح کو بھی نگلنا شروع ہوئی تھی۔

”ہاں صحیح کہا، اس وقت دل توڑ دیتی تو شاید معاملہ کچھ اور ہوتا۔“ پٹھان مضبوط ہوتے ہیں۔ پٹھان کٹھور ہوتے ہیں۔ پٹھان ہمت والے ہوتے ہیں۔ پٹھان سخت جان ہوتے ہیں۔ پٹھان سب کچھ ہوتے ہیں ہاں بس انسان نہیں ہوتے جس کے سینے میں دل ہوتا ہے جو دھڑکتا ہے۔ احساس رکھتا ہے۔ جینا چاہتا ہے اور جینے کی خواہش رکھتا ہے۔
 ”احد۔“ روہانسی سرگوشی۔

”تم شادی شدہ ہو اس بات سے اتنا فرق نہیں پڑا شیزل جتنا تمہارا محبت شدہ ہونے کا پڑا ہے۔ کاش تمہارا دل، تمہاری آنکھیں تمہارے اختیار میں ہوتیں ان میں اس وقت کسی اور کی تصویر نہ ہوتی۔“ وہ اس کا بہت اچھا پڑوسی تھا۔ ایک سعادت مند بیٹا، ایک بہت بہت اچھا انسان، ایک شریف شہری اور ایک بہترین مرد، جو بات کرتا تھا تو احتراماً نظریں جھکا لیتا تھا۔

جس کی آنکھ میں حیات تھی اور لبوں پر ہمہ وقت رہنے والی مبہم سی مسکان، جس کا خلوص خالص تھا اور توجہ قابل دید، آج شینزل نے اپنی زندگی میں ایک اور قیمتی انسان کو گنوا دیا تھا۔ ایک اور مخلص انسان اس کے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسلا تھا۔ وہ ایک بار پھر خالی دامن رہ گئی تھی۔

”احد۔“ پھر سے سرگوشی۔

”ماں کہتی ہیں محبت میں صدق ہو تو دل کی بات کو زباں تک لانے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی معاملات خود ہی طے ہو جاتے ہیں۔ نگاہیں بولتی ہیں۔ دھڑکنیں ایک دوجے سے ہم کلام ہوتی ہیں اور مسکراہٹ۔“ وہ لمحے بھر کور کا۔ گیلا لہجہ کچھ زیادہ ہی بھیکا ہوا تھا۔ ”مسکراہٹ سب عیاں کر دیتی ہیں مگر تمہاری مسکراہٹ، تمہاری مسکراہٹ نے تو مجھے ہمیشہ سے کھٹکا ہی دیا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں مجھے کبھی اپنا عکس نظر نہیں آیا اور، اور میں اس کا خواہ تھا۔ شدت سے تھا۔“

شینزل کا چہرہ ست گیا۔ کان گرم ہو گئے تھے۔ وہ ضبط کر رہی تھی کڑا ضبط۔

”ابھی تم اموشنل ہو رہے ہو ہم بعد میں آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے، ہم۔“ احد کی ڈوبی ہوئی نظر دل پر گہرا جبر تھی۔ وہ پھسکی ہو گئی۔

”صحیح کہا میں واقعی اموشنل ہو رہا ہوں، نہیں ہونا چاہیے۔ ایم ویری سوری تمہارے قیمتی وقت کو برباد کرنے کیلئے۔“ وہ یک لخت مڑا تھا۔ شینزل اس کے یوں جانے پر اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر مٹھیاں بھینچے وہیں کھڑی رہی۔ اس کے دل میں درد ہو رہا تھا بہت زیادہ درد۔

”شکریہ قیس الہی شینزل کو ایک بار پھر سے محروم کرنے کیلئے۔“



دور پہاڑوں پر سونے کی پرت آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔ افق پر بنفشی بادلوں کے درمیان میں سے پرندوں کے غول کے غول نکل رہے تھے۔ پورا چاند سورج کی تیز روشنی میں چھپ سا

گیا۔ کہیں کسی ٹہنی پر ایک کوئل آ کر بیٹھی اور اپنا ساز فضا میں گھولنے لگی۔ اس کوئل کی کوک لان میں بچھی کرسی پر براجمان جہانگیر کی سماعت سے بھی ٹکرائی تھی۔ سفید پینٹ کے نیچے ان کے گلابی خون جھلکاتے پاؤں نرم اور گیلی گھاس پر مضبوطی سے جھے تھے۔ پاؤں سے قدرے فاصلے پر ان کے سفید سیلپرز ایک دو جے کے ساتھ جڑے پڑے تھے۔ گھاس کی گلاہٹ پاؤں کے تلوؤں کے ذریعے ان کے دماغ کو تراوہٹ تو بخش رہی تھی مگر دل کی الجھن اور نظروں کی بے چینی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کل رات سے اب تک وہ سکون کے متلاشی تھے مگر انہیں سکون کہیں نہیں مل رہا تھا۔ جب سے انہیں نوکروں کے ذریعے حلیمہ کی سرجری کا پتہ چلا تھا تب سے وہ بے کل ہو رہے تھے۔ وہ ان سے لاکھ خفا سہی، لاکھ بے نیاز سہی، لاکھ قطع تعلق سہی مگر وہ آج بھی اس سے ویسی ہی محبت کرتے تھے جیسے اول روز کی تھی۔ آج بھی اتنا ہی چاہتے تھے جتنا پہلے چاہا تھا۔ پہلی محبت کا بیج جب دل کی بنجر زمین کو اپنی کونپلوں سے سرسبز کرتا ہے تا تب چاہے وہاں لاکھ طوفان آ جائیں، قحط پڑ جائے، جڑیں سوکھ کر بھر بھر جھڑ جائیں تب بھی اس کی پکڑ مضبوط رہتی ہے۔ التفات کی ایک نظر، چاشنی سے بھرا ایک لفظ، احساس سے پر آنسو سیکنڈ میں ہریالی لانے کے سکت رکھتا ہے۔ پھر کوئی قحط نہیں رہتا، کوئی ویرانیاں اور بنجر پن نہیں ہوتا پھر محبت پروان چڑھتی ہے پہلے سے دوگنی زیادہ، پہلے سے کئی طاقت ور اور منہ زور، جہانگیر کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ جہانگیر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

”پورے خاندان کو خفا کر کے، خود کو ہر بندھن سے عاق کر کے میں نے آپ کو اپنایا ہے حلیمہ، وعدہ کریں اس سب کے بدلے صرف وفا دیں گی مجھے، ایماندار رہیں گی میرے ساتھ، وعدہ کریں حلیمہ بس ایک وعدہ۔“ ان کی نظر مارننگ گلوری پر تھی جبکہ سوچیں کسی اور ہی محور کے گرد گردش کر رہی تھیں۔

”میرے خون میں بے وفائی نہیں ہے جہانگیر، میری ذات میں ضرور کھوٹ ہے مگر میری فطرت میں نہیں یقین کریں تاحیات آپ کے ساتھ رہوں گی۔“ مارننگ گلوری پر ان کی نظر تازہ ہوئی تھی۔ ہوا کی شرارتیں پھولوں کو بھی مچلنے پر مجبور کر رہی تھیں تبھی تو ان کی اٹھکھیلیاں زور و شور سے جاری و ساری تھیں۔

”ذات پات، اونچ نیچ کی کوئی وقعت نہیں ہے ہمارے دین میں، ہے تو حیا کی ہے۔ کردار کی پاکیزگی کی ہے۔ رشتوں کی تابعداری کی ہے۔ میں دنیاوی سوچ سے نبرد آزما ہوں بالکل، میرے دادا نے میری اٹھان صوم و صلوٰۃ پر کی ہے اور میں اسی کا پابند ہوں۔ آپ سے محبت ہو گئی ہے جس کی منزل نکاح ہے۔ نکاح کے بعد بس میرے بعد کوئی اور نہ ہو یہ التجا ہے۔“ ہوائیں تیز ہو چلی تھیں۔ مارننگ گلوری ٹہنیوں سے ٹوٹ کر ان کے قدموں میں گرنے لگے۔ محبت کی قبر پھولوں سے ڈھکے جا رہی تھی۔ خاردار رستوں پر جامنی رنگ بچھ چکا تھا۔

”اولاد جب ہاتھ سے نکل جائے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تم ہاتھ سے نکل چکے ہو جہانگیر اور تمہیں ہم سے دور لے جانے والی یہ کچے مکانوں میں بسنے والی عورت ہے۔ محل پر اس کی نظر ہے جب محل ہی نہیں رہے گا تو خواب بھی مسما رہو جائے گا۔ کہراٹھنے کے بعد ہی حقیقت سامنے آئے گی۔ جاؤ ہم نے تمہیں عاق کیا۔ اس جائیداد سے، ہر رشتے سے، اپنی محبت سے۔“ ساکت آنکھیں، آپس میں پیوست لب اور ماضی میں کھویا وجود دور اپنی کھڑکی سے انہیں نہارتی حلیمہ خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ ان کا دل دُہائیاں دے رہا تھا کہ وہ آج بچ جائیں۔ ان کا دل اپنی موت پر کسی اور کا جنازہ نہ اٹھنے کی دُہائیاں دے رہا تھا۔ ظاہر ہے حلیمہ کی موت پر جہانگیر نے ہی مرنا تھا۔ میت ان کی ہوتی اور جنازہ جہانگیر کا اٹھتا۔ پہلی محبت، آہ۔۔۔ ظالم پہلی محبت۔

”میری تنگ دستی کے دن ہیں حلیمہ، لیکن ایک وقت آئے گا جب سب کے دل پکھل جائیں گے۔ بابا ہمیں معاف کر دیں گے۔ ماں گلے سے لگائیں گی اور بھابھیاں بہت خوش ہوں گی۔ اس دن جشن کا دن ہوگا خوشی کا دن۔“ پہاڑوں پر چپکے سونے کے ذرے آتش فشاں کا ساروپ چڑھا چکے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مٹی کے بڑے بڑے ٹیلوں پر آگ بھڑک اٹھی ہے۔ ان پر نظر جمائے جہانگیر کی آنکھوں میں بھی آگ تھی۔ ماضی کی بدن چھلساتی جہنم سی آگ۔

”غضب ہو گیا جہانگیر بھائی، آپ کی بیگم پڑوسیوں کے گھر رات میں دو گھنٹے تک تھی۔ آپ کی بچی کی رونے کی آوازیں آرہی تھیں مگر مجال ہے جو آپ کی بیگم نے اسے چپ کرایا ہو۔ ایک اور بات کل رات صرف نجیب صاحب ہی گھر پر تھے۔ ان کا پورا کنبہ ساتھ والے گاؤں بیاہ پر گیا ہوا تھا۔“ جہانگیر نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ ہوا کی تیزی نے پورے لان میں پتوں و پھولوں کی لاشیں بچھا دیں تھی۔

”چھوٹے تمہاری بیگم ایک صحیح عورت نہیں ہے۔ اس کا کردار مشکوک ہے۔ بابا نے ساری جانکاری نکلوائی ہے۔ تمہارے پیچھے جاسوسی کروائی ہے۔ وہ خیانت کر رہی ہے۔ تمہارے اور اپنے رشتے کے تقدس کو بھول رہی ہے۔“ بالکونی میں کھڑی حلیمہ نے نمناک نگاہوں سے اپنے شوہر کی پشت کو ٹکا۔ وہ جانتی تھی وہ اس وقت کتنی اذیت میں ہوں گے وہ اچھے سے جانتی تھی۔

”اگر آپ کو میرے کردار میں ذرا سا بھی جھول نظر آتا ہے تو مجھے چھوڑ دیں جہانگیر، اف تک نہیں کروں گی لیکن اپنی آنکھوں سے سوال ہٹا دیں۔ یہ مجھے زندہ درگور کر رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی حلیمہ کو نہیں جانتے۔ کیا آپ نہیں سمجھ رہے کہ لوگ ہمیں جدا کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ بہتان باندھ رہے ہیں۔ میں آپ کی وفادار ہوں رہوں گی مگر ایک سخت بات

کہتی ہوں اگر آپ کے دل میں رائی کے برابر بھی شک آ گیا ہے تو چاک کر دیں اس رشتے کے دامن کو قبل اس کے یہ داغ دار ہو جائے۔“ جہانگیر نے اپنے ہاتھوں کی مٹھی بنائی، ماضی تکلیف دہ تھا مگر حال ماضی سے کئی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔

”بابا نہیں کریں ایسا، میری بیوی پر الزام لگانا بند کریں اور میری روزی کا ہر راستہ بند نہ کریں۔ میری بچی مرنے کے دہانے پر کھڑی ہے۔ میری بیوی کوئی بی کی تشخیص ہو چکی ہے۔ خدا را میرے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھیں مجھے قدموں تک جھکنے پر مجبور نہ کریں۔ آپ تو مجھ سے محبت کرتے تھے نا تو پھر یہ کیسی محبت ہے جو تنگ دستی کی تاروں کو کس کر مجھے چاروں شانے چت کر رہی ہے۔ مجھ پر رحم کر دیں بابا پلیر رحم کر دیں۔“ جڑے ہوئے ہاتھوں نے کروفر سے کھڑے گرے داڑھی مونچھوں والے کو قطعی نہیں پگھلایا الٹا لوہا گرم دیکھ کر کاروباری دماغ مزید تیزی سے چلنے لگا۔

”ٹھیک ہے ہم تمہارے ہر راستے سے ہٹ جاتے ہیں مگر تمہیں میری ایک شرط ماننی ہوگی۔“ بھیگی آنکھیں بجھا ہوا چہرہ، پسماندہ حال سے لمبا چوڑا جوان لڑکا۔

”کس طرح کی شرط؟“ گہری مونچھوں تلے بزرگ ہونٹوں پر فاتح مسکان دوڑی۔

”تمہیں قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف لینا ہوگا کہ تم اس عورت کو چھوڑ دو گے زبان دیتا ہوں تمہاری بیٹی پر چڑھے نمویے کے اثر کو بھی تڑواؤں گا، مالی حالت بھی ٹھیک کروں گا سر پر سے مزید کوئی چھت نہیں چھینوں گا اور اس عورت کے کردار پر بھی انگلی نہیں اٹھاؤں گا بلکہ اس کا علاج کرواؤں گا۔“ جہانگیر دو قدم پیچھے کو لڑکھڑایا تھا۔

”بابا۔“ حیرت، ملال، بے بسی۔

”سوچ لو جہانگیر اپنے خون کو بچانا ہے یا اپنے دل کو۔“ جہانگیر کی پلک سے آنسو پھسلا تھا

اسی پل ہاں اسی پل ان کے باپ کے دل کو کچھ ہوا۔ اس کچھ ہونے نے ہی تھوڑی نرمی برتی تھی۔ اس کچھ ہونے کی وجہ سے ہی رعایت ملی تھی۔
 ”حلیمہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ بھرایا لہجہ، آنسو پتی پلکیں۔

”ٹھیک ہے مت چھوڑو مگر حلف لو پوری زندگی اس سے قطع تعلق رہو گے، کلام نہیں کرو گے اور جو ہم کہیں گے وہ کرو گے۔ وہ تمہاری دسترس میں تو ہوگی مگر تمہاری نہیں ہوگی۔“
 زندگی یا موت، فیصلہ کرنا تھا جلدی کرنا تھا پھر فیصلہ ہو گیا موت کے بدلے زندگی خریدی ہو نہ زندگی بھی کیسی مری ہوئی۔

”حلیمہ کو عمر بھرا اپنے ساتھ رکھوں گا مگر کوئی رشتہ استوار نہیں کروں گا قطع تعلق ہی رہوں گا۔ اس کے کسی معاملات میں دخل اندازی نہیں ہوگی میری لیکن آپ وعدہ کریں اس کا علاج کروائیں گے اسے زندگی کی طرف لائیں گے، میری بیٹی کو بھی بچائیں گے اس کی بھی کفالت کریں گے۔“ قرآن لایا گیا۔ گناہ کیلئے پاکیزہ کلام کی بے حرمتی کی گئی۔ زمانہ جہالت کی تمام جہالت کو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ دل توڑ دیا گیا۔

”منظور ہے مگر تم ایک بات یاد رکھنا وعدہ خلائی موت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، یہ نہ ہو تم مکر جاؤ اور اس کا خمیازہ تمہارے ماں باپ اور آل اولاد کو جھیلنا پڑے۔“ جہانگیر نے دل پر پیر رکھا۔

”ایسا نہیں ہوگا بابا۔“

”ٹھیک ہے پھر حلف لو۔“ ہاتھ مخملی جلد پر گیا پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔

”میں سید جہانگیر حسین بخاری اپنے ہوش و حواس میں حلف لیتا ہوں کہ آج سے میں اپنی بیوی حلیمہ صادق سے قطع تعلق رہوں گا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔“ طوفان آیا آ کر چلا گیا۔ محبت ریزہ

ریزہ ہو کر پوری کائنات میں پھیل گئی۔ سمندروں کی لہروں نے سر پٹخنا شروع کیے اور ہوائیں، وہ نوحہ کناں ہوئیں۔ محبت لٹ گئی، مر گئی۔ عہد ختم ہوئے اور منظر پوشیدہ۔

نموینے کے زیر اثر مرتی اس کی بیٹی میں اس کی محبت کی جان نکال کر پھونکی گئی تھی۔ اس کی نین، اس کی زندگی نے ہفتے بعد آنکھیں کھول کر اس کے دل کو تسلی دی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ وہ مجبور تھا اپنی بیٹی کو سینے سے لگانے سے، اسے پیار کرنے سے، اس پر اپنی محبت نچھاور کرنے سے کیونکہ وہ جانتا تھا وہ اچھے سے جانتا تھا جس دن اس نے نین کی اور قدم اٹھائے اس دن اس کا دل حلیمہ کی جانب ہمکنہ شروع ہو جائے گا۔ اس دن قیامت آ جائے گی۔

مقدس کتاب کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتے ہوئے ان فرعون صفت لوگوں نے ایک بار نہ سوچا تھا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ ظالم پر ضرور پڑتی ہے اور اس قدر زور سے پڑتی ہے کہ وہ بلبلا جاتا ہے۔ حسین بخاری بھی بری طرح بلبلائے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے کو نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا تھا۔ ان کا دوسرے نمبر کا بیٹا ایسا نشے کی لت میں لگا کہ پھر سنبھل نہ سکا اور جب سنبھلا تب اسے چار کندھوں پر اٹھایا گیا۔ سیاست کا دور جو کبھی عروج پر تھا بری طرح زوال پزیر ہوا۔ دونوں فیکٹریوں میں آگ لگ گئی۔ تیسرے نمبر کے بیٹے نے جب بزنس کو ڈوبتے دیکھا تو اپنا حصہ لے کر بیوی بچوں سمیت امریکہ شفٹ ہو گیا۔ حسین بخاری تنہا رہ گئے۔ شریک حیات تو کب کی اوپر تلے دو بیٹوں کی وفات کے صدمے سے کوئے میں جا چکی تھی۔ لے دے کے ایک جہانگیر ہی بچا تھا جو ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ اس نے ماں باپ کو سہارا دیا۔ تھوڑے سے بچے سرمائے سے چمڑے کا بزنس شروع کیا۔ وہ جہانگیر جو جب مسکراتا تھا تو بہاریں کھل اٹھتی تھیں۔ خزاں کا موسم بن گیا تھا۔ طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور سختی آئی کہ پھر واپس نہ گئی۔ ماں باپ کی خوشی کی خاطر جب سب

ٹھیک تھا انہوں نے مصباح کا ہاتھ تھام تو لیا تھا مگر وہ چاہت و توجہ اسے نہیں دے پائے تھے جو کبھی انہوں نے حلیمہ کو دی تھی۔ انہیں اتنی محبت اپنے بیٹے سے نہیں تھی جتنی اپنی بیٹی سے تھی۔ ان کی نین ان کی پیاری نین، وہ اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہتے تھے۔ روح کا سکون کہتے تھے مگر واہ رے قسمت، کیسی جدائی کی مار ماری تھی۔ بیٹی سامنے تھی مگر جدا تھی۔ بیوی سامنے تھی مگر جدا تھی۔

سال بیت گئے۔ ان کے بیٹے کو اس کے دادا نے سیٹھ صاحب کا لقب دیا جو بعد از اس کا نام بن گیا۔ ہر کوئی اسے سیٹھ صاحب ہی کہنا لگا یوں ان کے بیٹے کا پیارا سا نام اس لقب کے نیچے دب کر رہ گیا۔ بیوی کو کووے میں چھوڑ کر وہ خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ ان کی جنازے کو کندھا دیتے ہوئے جہانگیر کی آنکھیں تو نم تھیں مگر دل نہیں بھرایا تھا۔ ایک قلق تھا۔ ایک تشنگی تھی۔ ایک آس سی تھی کہ کیا پتا، کیا پتا ان کے والد انہیں وعدے سے آزاد کر دیں کیا پتا ان کی آنکھوں میں موجود، شرمندگی و دکھ لفظوں کے پیرا ہن میں ڈھل جائیں کہ کیا پتا وہ کہہ دیں ”جہانگیر جاؤ تمہیں تمہارے وعدے سے آزاد کیا جاؤ قطرہ قطرہ رستے دل پر محبت کا مرہم لگا لو جاؤ اپنی محبت کو پالو۔“ مگر ان کی خواہش خواہش ہی رہی، ان کا کاش کاش ہی رہا۔ سید حسین شاہ بخاری خود تو اس دنیا سے چلے گئے تھے مگر جاتے جاتے ناختم ہونا والا درد اور دائمی موت اپنے سب سے چھوٹے بیٹے اپنے لخت جگر جہانگیر کی جھولی میں ڈال گئے تھے۔ بعد میں جب وہ بالکل بے حس و نالاں ہو گئے تب ان سے بڑا بھائی جو بیرون ملک مقیم تھا روتا ہوا ان تک آیا تھا۔ آنے کے بعد التجا کر رہا تھا۔

”جہان جو بابا نے کیا سو کیا اب خدا راتم اپنے وعدے سے آزاد ہو جاؤ اس گناہ سے آزاد ہو جاؤ جو ہم لوگوں کی سازشوں کے تحت سرزد ہوا تھا۔ تمہاری اپنی بیوی سے غفلت، اس کی

آہیں ہم سب کو برباد کر رہی ہیں۔ دیکھو تو سہی کیا بچا ہمارے پاس، سب کچھ تو تباہ ہو گیا، سب کچھ تو برباد ہو گیا۔ میرا بیٹا میری اکلوتی اولاد۔“ وہ یکدم بلک بلک کر رونے لگے پھر اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا تو سنبھلے اور بات وہیں سے جوڑی جہاں ختم کی تھی۔“ میری اکلوتی اولاد تمہارا بھانجا ایک لڑکی کے پیچھے قتل کر گیا۔ اسے، اسے عمر قید ہوئی ہے میرے بھائی، میں اس دکھ کے ساتھ کیسے جیوں گا کس طرح بھلا۔“ ان کے آنسو پھر سے شروع ہو چکے تھے۔ جہانگیر نے نظریں جھکائے رکھیں اٹھانے کی انہوں نے زحمت ہی نہیں کی تھی۔

”بابا کو معاف کر دو تم، اپنی بیوی کی طرف لوٹ جاؤ۔ تم نہیں جانتے میرے بھائی میں نے بابا کی روح کو تڑپتے دیکھا ہے۔ عذاب میں دیکھا ہے۔ وہ بہت اندھیرے میں ہیں۔ تمہیں پکار رہے ہیں معاف کر دو انہیں خدا را معاف کر دو۔“ یہ سب سن کر جہانگیر کا دل پھڑپھڑا تھا۔ ایک ہوک سی تھی جو پورے بدن میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ انہیں کہنا چاہتا تھا کہ اب بتاؤ کہاں ہے تم لوگوں کا اسٹیشن، کدھر ہے انا، غرور، تکبر، شان و شوکت اور امارت، اپنے اونچے خاندان کا زعم ”میں“، اونچی پگڑی کے غرور میں مقدس کتاب کی پامالی کی تھی۔ اس سے مطلب نکالا تھا۔ وہ قرآن جو برحق ہے۔ راستہ دکھانے والا ہے۔ بھٹکے ہوئے کی ڈائریکشن صحیح کرتا ہے۔ جو حج نہیں کرتا انسلٹ نہیں کرتا جو پاکیزہ ہے صرف پاکیزہ، اس کلام کو، اس کتاب کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کیا تو دیکھا اللہ کا کیسا قہر تم سب پر نازل ہوا ہے۔ کس طرح تباہ و برباد ہوئے ہو۔ کیا بھلا یہ کتاب صرف تم لوگوں کی قسموں کیلئے ہی رہ گئی ہے؟ مفاد کیلئے ہی رہ گئی ہے؟ اسے تو اللہ نے دلوں کی ٹھنڈک کیلئے اتارا تھا۔ صحیح غلط کی تمیز کیلئے اتارا تھا۔ یہ کس طرح کا استعمال ہو رہا ہے پھر اس کا، یہ کیسی بے حرمتی ہو رہی ہے اس کی، ڈرتے نہیں ہو اللہ سے، خوف نہیں آتا؟ اوہ ہاں خوف نہیں ہے تبھی تو جھوٹی قسموں اور ننگے وعدوں کیلئے اس

مقدس کتاب کو درمیان میں لاتے ہو۔ خوف ہوتا تو ایسا کرنا تو دور کی بات بلکہ ایسا سوچنے سے بھی روح کانپ جاتی لیکن۔۔۔ خوف ہوتا تب نا۔

”میں نے سب کو معاف کیا بھائی، مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔“

اس وقت تو انہوں نے کہہ دیا تھا مگر آج وہ جانتے تھے کس انجانی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ ایک وعدہ کر کے انہوں نے اپنی بیوی سے دستبرداری لے لی تھی۔ ایک وعدے نے ان سے ان کی جان لے لی تھی۔۔۔ فقط ایک وعدے نے۔

☆.....☆.....☆

لوانی اعرف خاتمتی، ما کنت بدات۔

”اگر مجھے اپنا انجام معلوم ہوتا تو میں کبھی شروع نہ کرتا۔“

ملکجے سے دن میں وہ صوفے کے اوپر پاؤں کر کے بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں اسکیج بک تھی اور ہاتھ میں پینسل، گردن کو ایک سائیڈ پر گرائے وہ منہمک انداز میں کسی کا چہرہ بنانے میں مگن تھی۔ اس کے لوز کرل بال دونوں شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں زندگی کی تھوڑی سی جوت جل رہی تھی۔ اس کے عقب میں ماربل کی زمین کے اوپر ایک سفید رنگ کا پھولا پھولا سا خرگوش بیٹھا تھا۔ خرگوش کے سامنے ایک پلیٹ پڑی تھی جس میں چند گاجریں موجود تھیں۔ وہ اس میں سے ایک ایک کر کے گاجرنکال کر کھا رہا تھا۔ بادلوں کے گدلے پن کی بدولت آج گھر میں تھوڑا اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ایک نظر کچن میں ڈالی جہاں اس کا بھائی کھڑا کچھ بھوننے میں مصروف تھا۔ مزیدار سے چکن کی خوشبو باہر تک آ رہی تھی۔ ایپرن پہنے کچھ گنگناتے ہوئے وہ لڑکا کچے چکن کے پیسز کو باؤل میں سے نکال کر پین میں منتقل کر رہا تھا جب رتبہ نے اسے پکارا۔

”سنو آج کی تاریخ میں نکلش فرمائے ہو جائیں گے۔“ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس کے ساتھ تھا اسی وجہ سے وہ کچھ نارمل ہو پائی تھی۔ ورنہ اس کا نارملٹی کی طرف آنا اس بار بہت مشکل لگ رہا تھا۔

”بن جائیں گے بہنا بس کچھ منٹ اور صبر کرلو۔“ نکلش کے آئل میں ڈالتے ہی مخصوص خوشبو و آواز پورے اپارٹمنٹ میں پھیل گئی۔ وہ مسکرائی۔ برسوں بعد روٹھی ہوئی مسکان اس کے لبوں پر آ کر ٹھہری تھی۔ اس کا بھائی اگر دیکھتا تو ضرور مسمرائز ہو جاتا لیکن اس وقت وہ دل جمعی سے فرمائے کرنے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی نظر اوون میں رکھے کیک پر بھی جا رہی تھی جو پھول چکا تھا بس تیار ہونے ہی والا تھا۔

”صبر ہی تو نہیں ہو رہا جلدی کرونا۔“ وہ مسکرایا تھا مسکرایا تو انہیں کیمرے میں سے دیکھنے والا انسان بھی تھا۔ کیونکہ یہ وہ منظر تھا جو شاذ و نادر ہی نظر میں پڑتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا صدیاں بیت گئی ہوں اس منظر کو دیکھتے ہوئے۔ اسے مسکراتے ہوئے۔

”بیٹا یہ اپنی پنسل اور سکیچ بک چھوڑو اور یہاں آؤ یہ دیکھو۔“ اس نے سیٹی بجنے پر کیک کو اوون سے باہر نکالا۔ گرما گرم پھولا ہوا سنہری کیک وہ پلیٹ میں پلٹ چکا تھا۔ ”یہ تیار ہو چکا ہے اسے آکر سجاؤ اور تھوڑی سی شرم کر لو میری سالگرہ پر مجھ سے ہی کام کرو اور ہی ہو اصولاً تو مجھے آرام کرنا چاہیے تھا اور یہ سب تمہیں کرنا چاہیے تھا۔“

رتبہ نے پنسل اور بک کو صوفے پر رکھا۔ کتاب اس نے اوندھے منہ رکھی تھی اور پنسل اس کی سفید بالکل سادی سطح پر، ننگے پاؤں شاکنگ پنک کلر کے ٹراؤزر کے پانچوں کوزمین سے لگائے وہ اٹھی۔ اس کے پاؤں زرد اور نحیف سے تھے اتنے نحیف کہ ان میں موجود رگوں کا سبز، سیاہ و سرخ جال واضح دکھائی دیتا تھا۔ ٹراؤزر لمبا اور کھلا تھا تبھی اس کے پانچے اس کے

پاؤں کی انگلیوں تک کو چھو رہے تھے۔ وہ قدم قدم چلتی کچن میں آئی۔ کھلی شاکنگ پنک کمر کی لمبی ٹی شرٹ جس پر سفید تاج بنا ہوا تھا کے بازو بھی اسے لمبے تھے یا وہ لمبے نہیں تھے بلکہ اس کے کمزور ہونے پر اس کے سائز میں فرق پڑ گیا تھا۔ وہ ستائشی نظروں سے ایک کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر اس کے بھائی نے برق رفتاری سے کریم کا کوٹ کر دیا تھا۔ سنہری بلڈنگ پر سفیدی پھر چکی تھی۔

”تم تو۔“ وہ رکی نظریں اٹھائیں۔ ”پورے شیف بن چکے ہو۔“ اس کے لبوں پر مبہم سی مسکان دوڑ گئی۔

”تعریف کا شکریہ اب سجاؤ اسے دیکھتے ہیں کس طرح تم اسے ڈیکوریٹ کرتی ہو۔“ نکلس تل کر ٹرے میں منتقل ہو چکے تھے۔ پوری مچھلی بھی منہ میں لیموں کو لیے تلی ہوئی پڑی تھی۔ وہ اس مچھلی کے ارد گرد کھیرے اور سلاد کے پتوں کو سلیقے سے سجانے لگا۔

”تمہیں کس طرح کی ڈیکوریشن چاہیے، اوٹن بنا دوں؟“ کالی مرچ کو چھڑکتے اس کے ہاتھ پل بھر کو تھمے۔ خوشگوار حیرت نے جیسے اس کے پورے بدن کو جکڑا تھا۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ، میں بھی تو دیکھوں اور کون کون سے ہڈن ٹیلنٹ چھپے ہیں میری بہن کے اندر۔“ وہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ارتکا ز اس کے ہاتھوں پر تھا جو کریم کی مدد سے سمندر کے پانی میں لہریں بنانے کے بعد ایک بڑی لہر کو اوپر اٹھا رہی تھی۔ ہلکا آسمانی رنگ کریم میں مکس تھا جو سفید کریم میں جگہ جگہ نظر آ رہا تھا۔ رتبہ نے پورے بیس منٹ لگا کر اوپر کو اٹھی لہر میں سرفنگ کرتا ایک لڑکا کھڑا کیا تھا۔ وہ یقیناً وہی تھا جس کی آج سالگرہ تھی۔ سرفنگ کرتے اس لڑکے کے عین نیچے وہاں جہاں لہر کا سایہ پڑ رہا تھا اس نے سالگرہ مبارک بھائی کا کیپشن لکھا تھا۔ آپس میں پیوست لبوں کے ساتھ اس لڑکے کی آنکھوں میں خوشی بھری نمی ابھری

تھی جسے اس نے پل بھر میں ہی غائب کر دیا۔

”تم تو بہت اچھا ڈیکور کر لیتی ہو بزنس کیوں نہیں شروع کر لیتی۔“ اس نے مشورہ دیا تھا جس پر رتبہ نے کوئی بھی تاثر پیش نہیں کیا۔ وہ سچی ہوئی ٹرائی میں کیک کو رکھنے کے بعد اسے اپنے نحیف ہاتھوں سے دھکیلتی ہوئی لاؤنج میں لائی۔ وہ لڑکا جان بوجھ کر اسے ایسے کام کرنے دیتا تھا تا کہ اس کی موومنٹ برقرار رہے ورنہ جس طرح وہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے کمزور اور کاہل ہو رہی تھی کوئی بعید نہیں تھا چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے۔

”میرا مشورہ اچھا ہے غور کرنا تم۔“ اس نے سینفڈ کینڈل کو جلایا پھر کیک پر بھی ایک آسمانی رنگ کی موم بتی لگا دی۔ وہ اسے جلانے کے بعد اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی جو ہار ماننے کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھا۔

”انویسٹمنٹ میں کروں گا پرافٹ تمہارا، سچ میں آج کل تھیم کیک کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ لوگ پاگل ہیں اس کے پیچھے کوئی شک نہیں یہ بزنس کافی چلے گا۔“ اس نے موم بتی بجھا کر کیک کو کاٹا کاٹنے کے بعد آنکھیں موند کر پل بھر کو دعائیں مانگی پھر آنکھیں کھول دیں۔ رتبہ کا سپاٹ چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

”گفٹ۔“ رتبہ نے توقف کیا۔ ”کیا چاہیے تمہیں۔“ تھوڑی سی اینار ملٹی تاہنوز اس کے انداز میں زندہ تھی۔ وہ مایوس کن انداز میں اس کی اگنورنس برداشت کر گیا۔ بدقت تمام لبوں کو کھینچ کر کہنے لگا۔

”سوچ لو بہت مہنگا سودا کر رہی ہو۔“ وہ اب بھی سپاٹ تھی ہاں اس بار تھوڑا سا زرد رنگ مزید گھل گیا تھا اس کے چہرے پر۔

”سوچ کر ہی پوچھا ہے۔“ وہ دل سے خوش ہوا پھر تھوڑا سا آگے جھک کر سرگوشیاں انداز

”واک پر جانا چاہتا ہوں اپنی بہن کے ساتھ چلو گی؟“ رتبہ کا منہ تھوڑا سا کھلا، آنکھیں قدرے پھیلیں، زردی کچھ اور گھل گئی۔ ڈر کی لکیریں اس کے ماتھے پر ابھر گئی تھیں۔ بہن کی حالت پر وہ اس کا ہاتھ احتراماً تھام کر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔

”رتبہ، دنیا اور دنیا والوں سے آخر کب تک کٹ کر رہ سکتے ہیں ہم کبھی تو سامنا کرنا ہے نا اور جب۔“ اس نے تحفظ کا احساس دلاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھوڑا سا دبایا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں تو کس بات کا ڈر ہے۔“

”تمہیں ایکرو فوبیا ہے نا۔“ کیک کی خوشبو اور کینڈل کی بھینی بھینی خوشبو چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک زیادہ تھی رتبہ کی سرگوشی کی آواز کم۔

”اسی طرح مجھے ہیومن فوبیا ہے۔ میں۔“ بولنے میں دشواری ہوئی۔ ”صرف تم سے فیملر ہوں باقی کسی انسان کے تصور سے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں مرجاؤں گی۔“ آواز کی لرزش اس کی تکلیف کی انتہا تھی۔ اس کے بھائی کا جیڑا بری طرح بھینچا۔

”ایک دفعہ کا ذکر ہے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولنا شروع ہوا۔ ”بغداد کے شہر میں ایک سادھو رہتا تھا۔ اس کی آواز میں لوچ تھی، درد تھا اور سحر بھی۔“ رتبہ کی جھلمل کرتی آنکھیں ساکت ہوئیں۔ گلے میں اٹکا گولا آہستہ آہستہ نیچے کی اور سرکنے لگا۔

”وہ جب جب گاتا تھا تب تب لوگ اس کے پاس ایسے جمع ہونا شروع ہوتے تھے جیسے شمع کی گرد پروانے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان پروانوں میں ایک وہ بھی تھی جو اس وقت کی معزز گھرانے کی معزز ترین ہستی گردانی جاتی تھی۔ وہ بہترین ناصح تھی۔ فصاحت و بلاغت میں اس کا ثانی کوئی نہیں تھا۔ لوگ دور دراز سے اس سے صلاح و مشورے کیلئے آتے تھے۔ اس

سے ملنے کی خاطر کئی کئی دن انتظار کرتے تھے۔ پنچایتوں کی سربراہی وہ کرتی تھی مگر جب اس سادھو کی آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی تھی۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکتی تھی۔ سیاہ چوٹے میں خود کو چھپائے، نقاب چڑھائے اسے تکتی رہتی تھی۔“

لقد عمرت حتی لا ابالی
اھتفی فی صبا حی ام مسائی
و حق لمن اتت ما ثان عا ما
علیہ ان یمل من الشواء

”میں نے بڑی عمر پائی ہے۔ اب مجھے یہ پرواہ نہیں کہ صبح مروں یا شام مروں۔ اور جس شخص کی عمر دوسو برس ہو چکی ہو، اس کا دنیا میں رہنے سے اکتا جانا بجا ہے۔“
(زہیر بن جناب الحمیری)

”ایک شام وہ یونہی سوز کے ساتھ اس شعر کو گنگنا رہا تھا۔ جب وہ معزز ہستی دے قدموں مجمع کو چیرتی ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھی۔ وہ اس سادھو کے نقوش کو کھوج رہی تھی جس کے بال دراز تھے اور چہرہ داڑھی و مونچھوں میں چھپا ہوا تھا۔ ملگجی شال وہ خود کے گرد لپیٹ کر اس عورت کو دیکھنے لگا جو اس سے تھوڑی سی دور بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ وہ شاید اسے پہچان چکا تھا۔ جان چکا تھا تبھی گنگنا نے لگا۔

تمنت سلیمی ان نموت بحمھا
واھون شیء عندنا ما تمننت

”سلیمی نے تمنا کی کہ ہم اس کی محبت میں مرجائیں، اور ہمارے لیے اس کی یہ تمنا پوری کرنا بہت ہی آسان ہے۔“

”سیلی کون تھی؟“ رتبہ نے اسے درمیان میں ٹوکا۔ اس کے بھائی کا جذب نہیں ٹوٹا تھا۔

وہ اسی ارتکاز کے ساتھ بتانا شروع ہوا جس ارتکاز کے ساتھ بتا رہا تھا۔

”وہ اس کی بہن تھی (یہ بات فرضی ہے) جس نے غیر مسلم کی محبت میں گرفتار ہونے کی پاداش میں اپنے بھائی کو جلاوطن کروایا تھا بعد از پنچایت کے فیصلے کے تحت اپنے بھائی کی بیوی کو قتل کروادیا تھا۔ اس نے ظالم فیصلہ کیا تھا جس کے تحت اس کا بھائی معارف کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد ایک سادھو بن گیا تھا۔ جو نگر نگر پھر کر اپنے لفظوں کے جادو سے لوگوں کے دلوں میں سحر پھونک دیتا تھا۔ وہ جو دنیا سے بیگانہ تھا لوگوں سے نا آشنا، اپنی بہن کو پہچاننے کے بعد آنکھوں میں نمی لے آیا تھا۔ وطن سے جلاوطن ہوتے وقت اس نے اپنی بہن سے کہا تھا۔

”اے وقت کی ملکہ، آج یہ فقیر اس دیس کو چھوڑ کر جا رہا ہے مگر یاد رکھنا اگر بھولے سے وہ یہاں لوٹ گیا تو اس کی لحد یہیں بنے گی۔“

”اس نے جو کہا تھا وہ سچ کہا تھا رتبہ، اسی دن اسی وقت آنکھوں میں ڈھیروں التجائیں لیے وہ سادھو اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ لوگوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ اسے دفنایا تھا مگر جب سب کو معلوم ہوا یہ تو وہی انسان ہے جو ایک غیر مسلم کی محبت میں گرفتار ہو کر جلاوطن کر دیا گیا تھا تب تھوڑی دیر کو کہرام مچا تھا۔ مگر اس کے گیتوں کے رسیا اس کہرام کو دبانے میں پیش پیش تھے۔ تب صرف افسوس تھا اور بے حد تھا۔ اس معزز ہستی کو ترحم بھری نگاہوں سے دیکھا جانے لگا جس نے اپنے جلال اور رتبہ کی بدولت اپنے بھائی کی زندگی کو ختم کر دیا تھا۔ جس نے فقط اس لیے اسے جلاوطن کروادیا صرف اس لیے اس کی بیوی کو مروادیا کہ وہ خدا کو ماننے والی نہیں تھی۔ اور یہ بہت بڑی بات تھی بہت زیادہ بڑی، شرک بے شک گناہ کبیرہ سے بھی اوپر کا گناہ ہے لیکن تب تک جب تک شرک کیا جائے۔ وہ پیدائشی غیر مسلم تھی جس نے اپنے شوہر سے

عشق کرتے ہوئے ایک اللہ کو پہچانا اور مسلمان ہو گئی۔ یہ خبر یہ حقیقت جب تک معزز ہستی تک پہنچی تھی تب تک وہ قاتل کے نقش قدم پر خود کو چلا چکی تھی۔ اس دن سے کچھتاوا اس کا مقدر بن گیا تھا۔ اس دن سے ایک طوق سا تھا جو اس کے گلے سے لگ چکا تھا۔ وہ دو جانوں کی قاتل تھی۔ کبھی خوش نہیں رہی تھی۔ اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا رتبہ؟“

رتبہ نے تھوک لگلا، نفی میں سر کو ہلاتے ہوئے بولی۔

”میں کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ اس کے بھائی نے چیخ کی مدد سے ایک کے بیٹھے ذائقے کو حلق سے نیچے اتارا پھر تھکے سے لہجے میں گویا ہوا۔

”اس سادھو کی محبت اس کی بیوی تھی جس کے غم میں اس نے خود کو گھلا دیا۔ میری محبت تم ہو رتبہ اور تمہارا غم مجھے اندر سے کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔“ ایک تار کی صورت آنسو اس کی آنکھوں سے بہنا شروع ہوئے تھے۔ رتبہ نے کلائی کی پشت سے آنسوؤں کو رگڑا پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”سادھو بے حس بھی تو ہو سکتا تھا۔“

”سادھو بے حس ہو سکتا تھا لیکن ایک بھائی نہیں ہو سکتا۔“ رتبہ کے دل پر چابک پڑا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

”یعنی، یعنی تم کہہ رہے ہو میں معزز خاتون کی طرح سفاک ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ اس کا بھائی تذبذب کا تاثر آنکھوں میں لے آیا۔ وہ خفا سے انداز میں کہنے لگا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا، بہتان مت باندھو۔ تم میری بہن ہو۔ میں تم سے ایک درخواست کر رہا ہوں۔ تم نے گفٹ کا پوچھا تھا وہ مانگ رہا ہوں۔“ اس کا دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ موڈ

خراب ہو رہا تھا لیکن اس نے ضبط کر لیا۔ وہ اپنے برے رویے سے، لہجے کی تلخی و سختی سے اپنی بہن کا دل سہا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے حتی المقدور کوشش کر کے نارمل سی جون میں بولنا چاہا تھا لیکن پھر بھی لہجے میں ناراضگی کا عنصر غالب آ گیا۔

”میں نہیں کر سکتی، میں چاہ کر بھی دنیا کا سامنا نہیں کر سکتی۔ مجھے، مجھے وہ وقت یاد آ جاتا ہے جب میں جب میں۔“ اس سے مزید الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ تبھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی بہن کا سر اپنے شانے سے لگایا۔

”اچھا بس شششش، نہیں بیٹا ایسے نہیں روتے۔ رتبہ، اچھا دیکھو آج میری سال گرہ ہے نا، آج خوشی کا دن ہے اور میں نے تمہارے لیے مزے مزے کے کھانے بنائے ہیں چلو مل کر کھاتے ہیں۔“ وہ ہڑبڑا گیا تھا اس کے رونے پر اس لیے بشاش سے لہجے میں گویا ہونے کے بعد اس نے چیخ میں تھوڑا سا کیک لیا اور رتبہ کی جانب بڑھا دیا۔

”آں کرو اور اس کے بعد میری تعریف کرو۔“ بھیگی ہوئی جڑی پلکوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے منہ کھول کر میٹھے ذائقے کو حلق سے نیچے اتارا۔ حلق سے کیک کے نیچے اتر جانے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر سے پھسل پڑے تھے جنہیں اپنی انگلیوں کے پوروں سے صاف کرتے ہوئے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

”دیش لائک آمائی لٹل گڈ گرل۔“ ایک آنسو اس کی تھوڑی سے پھسلتا ہوا گردن تک آ لڑھکا۔ وہ اپنے بھائی کے کمنٹ پر روتے ہوئے پھر سے مسکرائی۔

”تم سے۔“ ہچکی۔“ بڑی ہوں اور ٹریٹ ایسے کر رہے ہو جیسے۔“ دوبارہ ہچکی۔“ کوئی چھوٹی بچی ہوں۔“ اس نے گہرا سانس بھر کر اپنی بہن کی آنکھیں اچھے سے صاف کیں جب بولا تو لہجہ میں پدرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ چاشنی بھی گھلی تھی۔

”بھائیوں کیلئے بہنیں چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتیں، بھائیوں کیلئے بہنیں بہنیں ہوتی ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ ان کی عزت ہوتی ہیں۔ ان کا مان، دوست، غم گسار، کرائم پارٹنر، ان کی محبت، ان کی پوری زندگی کی ساتھی، سب کچھ ہوتی ہیں۔ میں بھلے تم سے تھوڑا سا چھوٹا ہوں مگر میرے لیے تم کبھی بڑی نہیں ہوگی۔ یہ پلڑا تو میرا ہی بھاری رہنا ہے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہائیٹ کو بیٹھے بیٹھے ناپا تو وہ ہنس دی۔ مغلوب سے دل کے ساتھ اس کی نظر جھک چکی تھی۔ ناک پر احساس کی سرخی تھی اور آنکھوں میں تشکر بھرا احساس۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ اس نے اپنے لفظوں کو سنا۔

”صحیح کہا، پریشان کر دیتی ہوں نا تمہیں۔“ اس کے بھائی نے اپنے ہونٹوں کو بھینچا جس کے سبب اس کی رواں داڑھی کے نیچے چھپے گالوں پر گڑھے بن گئے تھے۔ وہ شرارتی لہجے میں کہہ رہا تھا جو یہ تھا۔

”ہاں کبھی کبھی لیکن یونواٹ، تمہاری پریشانی بھی عزیز ہے۔“

رتبہ نے بھرائے دل کے ساتھ اپنا سر جھٹکے سے اس کے شانے پر رکھا۔ اس کے سر رکھتے ہی لبوں پر آئی جھوٹی مسکان سمٹی۔ گالوں سے گڑھے غائب ہوئے اور آنکھوں میں کسی کیلئے نفرت کی آگ جل اٹھی، گہری نفرت کی آگ۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھلے وہ کرسٹل کی بال کو اچھالتا ہوا یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے سوال تھے اور چال میں جھنجھلاہٹ، چہرہ سخت و سپاٹ تھا اور گردن کی رگیں تنی ہوئیں۔ وہ آج پھر سے وہیں تھا جہاں دو لاشیں انہیں ملی تھیں۔ آج تیسری لاش تھی جسے ان کے قدموں کے نیچے ڈال دیا گیا

تھا۔ کسی انجانے نمبر سے ہیڈ آفس فون آیا تھا کہ ہل اسٹیشن کے آس پاس کوئی زیر زمین گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ اور اس کی ٹیم وہاں کی اور دوڑے تھے۔ جب زمین کو چاک کیا گیا تو وہاں سے ایک بوری میں کئی ٹکڑے برآمد ہوئے۔ وہ ٹکڑے اور کسی کے نہیں بلکہ ایک اور نو عمر لڑکے کے تھے۔ جنہیں جوڑنے پر بھی اس کی شناخت ناممکن تھی تبھی ڈی این اے کے ذریعے اس کی شناخت کو جانچنے کیلئے اس کے جسم کا ایک ٹکڑا لیب بھجوا دیا گیا تھا۔ میڈیا وہاں موجود تھی۔ وہ وہاں کیسے آئی کسی کو علم نہیں، پچھلے دو کیس جواب تک ویسے کے ویسے پڑے تھے کی بھنک بھی باہر نہیں گئی تھی مگر اس بار میڈیا کی دخل اندازی نے پورے ملک میں سنسنی مچا دی تھی۔ لوگوں میں خوف و ہراس منٹوں میں منتقل کر دیا گیا ساتھ ساتھ پولیس کی نااہلی پر بھی بڑا شور اٹھایا گیا۔ صبح سے انہیں شام ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک وہ سوچوں میں گھرا بس چکر ہی کاٹ رہا تھا۔

”سر، نمبر تو ٹریس ہو گیا ہے مگر مجھے لگتا ہے فون چوری کا ہے کیونکہ اس کا جی پی ایس ڈیرہ غازی خان کا پتہ دے رہا ہے۔“ راجیل کی اطلاع پر اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی پھر ایک نظر دور پریشان کھڑی شینزل پر ڈالی جو انگلیاں چٹختے ہوئے نوکر اس والی پہلی پٹی کے اندر کھڑی میڈیا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اسے کس چیز کی پریشانی ہے۔ وہ جانتا تھا اسے کس چیز کا ڈر ہے۔

”میں جانتا تھا ایسا ہی ہو گا اپنی ویز تم اس غیر ضروری بھیڑ کو یہاں سے ختم کرواؤ۔“ اسے آرڈر دینے کے بعد اس نے کرٹل بال کو بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور ٹھوس قدم اٹھاتا شینزل کی جانب بڑھنے لگا۔ راستے میں سفید گلوں چڑھائے ماریہ نے اسے پکارا وہ ہاتھ کھڑا کر کے اسے روکنے کے بعد پہلی وسیاہ پٹی کو اوپر اٹھا کر اندر آ گیا جہاں کمال، ہما اور نشاء لاش کے ٹکڑوں کے گرد موجود تھے۔ ایک نگاہ ان پر ڈال کر اس نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے سے

ناک کے کنارے کو مسلا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں تفکر تھا اور شاید دل میں ڈر۔

”بی ایزی، کچھ نہیں ہوگا۔“ اپنے قریب سے قیس کی آواز سن کر وہ چونکی پھر گلا کھنکھارتے ہوئے گویا ہوئی۔

”میں جانتی ہوں، کنسرن کیلئے شکریہ۔“ قیس نے سفید کاغذ کی موجودگی اپنی جینز کی جیب میں کی، کرنے کے بعد ابرو چڑھا کر بولا۔

”مجھے لگتا ہے کوئی تو ہے جو آپ کا دشمن ہے اور وہ بھرپور کوشش کر رہا ہے کہ آپ پھنس جائیں۔“ شیزل نے اسے کاٹ کھانے والے انداز میں دیکھا پھر دبے لہجے میں غراتے ہوئے بولی۔

”اس وقت تو تم مجھے دشمن لگ رہے ہو، چپ رہو۔“ قیس یک لخت مسکرایا جھٹکے والی آدھے لمحے کی مسکان، تنی ہوئی ابرو کے ساتھ۔

”واقعی؟ تو پھر دشمنوں والے کام کرتا ہوں۔ میڈیا کو وہ خط دکھا دیتا ہوں جو آپ کیلئے بڑے پیار سے لکھا گیا ہے، کیا کہتی ہیں پھر۔“ شیزل نے دانت پیسے۔ دل تو کر رہا تھا ساتھ کھڑے انسان کا گلا گھونٹ دے مگر ہک ہا، کاش یہ اس کے اختیار میں ہوتا۔

”خون تو نہیں کھول رہا تمہارا اس طرح کی بات کرتے ہوئے۔“ وہ اس کے تن فن کرنے پر ایک بار پھر سے مسکرایا۔

”ہم تو یعنی مادام تسلیم کرتی ہیں کہ میرا ان کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔“ اس کی بے تکی بات پر وہ بدک گئی۔ آس پاس کون ہے یہ بھی بھول گئی تبھی آواز قدرے اونچی تھی جو تھوڑی سی دور اس کی ٹیم کی سماعت سے با آسانی ٹکرائی۔

”رشتہ؟ اب رشتہ درمیان میں کہاں سے آگیا۔“ قیس نے مضبوط بوٹوں والا قدم مزید اس کی جانب بڑھایا۔ آنکھوں میں استحقاق درآ، ایسا استحقاق جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے پھر لبوں کو کھینچ کی احترا ماً گویا ہوا۔

”یہ بات نہ کیا کریں آپ، جس دن میرے لب کھل گئے اس دن آپ نے پھر سے خفا ہو جانا ہے۔ میں مزید آپ کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔ ایک، صرف ایک اور موقع دے کے دیکھ لیں مجھے یقین کریں آپ کے تمام گلے دور کر دوں گا۔ آپ جانتی ہیں میں آپ سے کس قدر۔“ شیزل نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے تھم جانے کو کہا۔ جذبات کی رو میں بہکتا وہ سب اگلنے کو تھا جب وہ جھٹکے سے پیچھے کو ہوئی۔ ظل ہمالاش کے ٹکڑوں کے قریب بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خاموشی تھی دبیز خاموشی۔

”حد میں رہو قیس الہی اور بھول مت جایا کرو کہ میرے ساتھ کیا کر چکے ہو تم، کام پر آئے ہو کام پر فوکس کرو۔“ وہ ایک بار پھر سے اسے جھٹلا چکی تھی۔ دھتکار چکی تھی۔ قیس لب بھینچ کر رہ گیا۔ دل پر خنجر چلا تھا جس کا لہو یک بارگی میں ہی پورے بدن میں رسنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے، ضبط کو تھام کر قدم پیچھے موڑ لیے۔ دماغ میں خون ٹھو کریں مار رہا تھا۔ کوئی او وقت ہوتا تو وہ اسے اچھے سے سمجھاتا مگر کوئی اور وقت ہوتا تب نا۔

”میرا وجود کیوں کھٹکتا ہے آپ کو، میں قریب ہوں تو تپ جاتی ہو کیوں؟ یاد رکھنا جس دن میں تپ گیا نا جھلس جانا ہے آپ نے۔“ شیزل نے سینے پر بازو باندھے۔ وہ یونیفارم میں اچھی لگ رہی تھی۔ یونیفارم چمکتی تھی اس پر۔

”دھمکی دے رہے ہو؟“ بھینچی ہوئی ابرو، ماتھے پر بل، آنکھوں میں تفکر۔

”ہاں دے رہا ہوں کیا کر لوگی۔“ شیزل نے بری طرح سے دانت کچکچائے۔ اس لڑکے کا

کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

”یہ وقت ہے اس طرح کی باتیں کرنے کا، اس طرح کی بحث میں پڑنے کا۔“ قیس نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ہما کی طرف گردن موڑی جس کے کان ان دونوں پر ہی جمے تھے۔

”پھر سے وقت، نا جانے وہ کون سا وقت ہوگا جو آپ کے مزاج کو سوٹ کرے گا۔“ تلخ سے لہجے میں کہنے کے بعد اس نے قدم ہما کی طرف موڑ لیے۔ ”آئی بڑی۔“ سر کو زور سے جھٹکا۔

شینزل نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس بھرا تھا۔ جب آنکھیں کھولیں تو ان میں ضبط کے سرخ دھاگے اور احساس کا ڈھیر سارا پانی تھا جسے وہ پلکیں جھپک جھپک کر پیچھے کو دھکیل رہی تھی۔

”سر آپ ہمیں اس طرح جانے کو نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان میں میڈیا آزاد ہے اور یہ ہمارا حق ہے کہ ہم لوگوں تک آگاہی پہنچائیں۔ ہمیں اس قتل کے متعلق جانکاری چاہیے۔ سیریل کلوکون ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ ہمیں سوالوں کے جواب اور تھوڑی سی کوریج چاہیے پھر ہم چلے جائیں گے۔“ ایک صحافی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا جبکہ راحیل پولیس اہلکار کی مدد سے ان غیر ضروری لوگوں کو وہاں سے دور لے جانے کی سعی کر رہا تھا۔ جب سچوئشن کنٹرول سے باہر ہوئی تب قیس آنکھوں پر شیڈز لگا کر اپنے بازو کہنیوں تک چڑھائے ان صحافیوں تک پہنچا جو اس کے آتے ہی بے تکیے سے سوال لے کر شروع ہو گئے تھے۔

شینزل نے اسے وہاں جاتے دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے خوف کو پولیس کی اور بڑھتے قیس نے بھی دیکھا تھا۔ مگر وہ خاموش رہا اور خاموشی سے ہی ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ قیس نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے انہیں تھم جانے کو کہا۔ اس کی آسمانی

رنگ کی ڈریس شرٹ کا ایک حصہ پینٹ کے اندر تھا جبکہ دوسرا پینٹ سے باہر نکل چکا تھا۔ بازو جو کہنیوں تک چڑھائے تھے وہ بھی قدرے مٹی زدہ سے تھے۔ اور سیاہ جینز پر بھی گرد پڑ چکی تھی۔ صحافیوں نے اپنے سامنے لمبے چوڑے ہینڈسم سے لڑکے کو کھڑے پایا تو وہ چپ ہو گئے۔ اس کی آواز نے انہیں چپ کر دیا تھا۔

”اسلام علیکم سب کو، دیکھیں آپ لوگ یہاں موجود ہیں ہونا بھی چاہیے کیونکہ آپ لوگوں کا یہاں ہونا جائز ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ہم لوگوں پر پریشربہت زیادہ ہے جس کے سبب ہم کسی بھی قسم کا اس وقت کوئی جواب آپ کو نہیں دے سکتے۔ اس لیے آپ لوگوں سے ہمبل ریکونسٹ، ہمیں ہمارا کام کرنے دیں جو ہم کوئی نتیجہ اخذ ہوتا ہے ہم خود پریس کانفرنس کریں گے شکریہ۔“

”لیکن سر۔“

”سیریل کلر جیسے کیس پاکستان کی تاریخ کو سوٹ نہیں کرتے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہیں۔“

”مرنے والا کون ہے؟ اس کی جینڈر کیا ہے؟ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے؟“

”سر، یہ پہلا قتل ہے یا اس سے پہلے بھی اور قتل ہو چکے ہیں۔“

”سر ہمیں ہمارے سوالوں کے جواب چاہیے۔۔۔۔۔سر۔۔۔۔۔“

وہ اس طرح کے بے شمار سوال نظر انداز کر کے واپس اسی جگہ پر آ رہا تھا جہاں انسانی جسم کے ٹکڑے خود آلود بوری میں پڑے تھے۔ ڈونٹ کر اس والی پہلی پٹی کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے ایک لمحے کیلئے شینزل پر نظر ڈالی تھی۔ شیڈز کے پیچھے اس کی نگاہوں کی خفگی کی انتہا کو اگر وہ جان جاتی تو پانی پانی ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں کے خوف نے ایک بار پھر سے قیس کے دل کا

خون کیا تھا۔ نا جانے شیزل کو مارنے کے اتنے گر کہاں سے آ گئے۔ نا جانے وہ آ گے کب کب
اور کتنی بار اور کس کس انداز میں مارے گی۔۔۔۔ نا جانے۔

☆.....☆.....☆

سانس جب رکتی ہے
تب آس ٹوٹتی ہے
دل کی دہلیز پر
ایک قدم اور
آسمان سے گرتی پھوار
کھلکھلاتی ہے
سانس جب رکتی ہے
تب آس ٹوٹتی ہے

پب کی نیلی پیلی، سرخ سبز اور بنفشی روشنی چمکتے ہوئے ڈانس فلور پر پڑ رہی تھی۔ ایلینٹ
کلاس کے بچے عمر کی قید سے آزاد اپنی اپنی مستیوں میں مگن تھے۔ ڈی جے کے بدلتے ہوئے
ساؤنڈ پر چیخوں کے ساتھ اس کی پزیرائی کی جاتی۔ ڈانس فلور اور بار کاؤنٹر کے آس پاس
موجود ہر کوئی بندروں کی طرح اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ تقریباً ہر لڑکی کے بال ڈانس کرنے
کی وجہ سے دونوں شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ کچھ کے بالوں میں نیون لائٹس والے ہیر کچر
لگے ہوئے تھے۔ کچھ کے خرگوش والے تھے اور کچھ کے ان کے نام والے، وہ ان سب کے بیچ
سٹول پر جھولتے ہوئے ہاتھ میں گلاس تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے سفید لائٹ والے سیاہ
ڈاننگ جوگروزن پڑنے کی وجہ سے جگمگا رہے تھے۔ جیکٹ ایک شانے پر تھی جبکہ دوسرا شانہ

خالی تھا۔ سفید ٹی شرٹ میں موجود اس کے مسلز آدھی آستینوں کے وجہ سے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں وہ گردن کو ہولے ہولے تھرکائے آخری گھونٹ بھر رہا تھا جب اس کے سیل فون کی تھر تھراہٹ نے اس کے دائیں بازو میں گدگدی کی۔ قیس نے گھونٹ بھر کر گلاس کاؤنٹر پر رکھا۔ وہ ویٹر کو اسے بھرنے کو کہہ رہا تھا اسی دوران اس نے جیکٹ کو گود میں رکھا اور اس کی پاکٹ سے اپنا فون برآمد کر لیا۔

”سر آپ کی ڈرنک۔“ گلاس اس کی سمت سرکایا گیا۔ موبائل فون کی سکرین پر ابھرنے والا میسج ”کسی“ کا تھا۔

”کہاں ہو؟“ لکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ٹائپ کیا۔
 ”مسجد میں۔“ حسب توقع جواب مل جانے پر دوسری طرف خاموشی چھائی رہی پھر جواب ابھرا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری، گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا اور پھر ٹائپ کرنے لگا۔

”جماعت کھڑی ہونے کا انتظار۔“ اب کی بار خاموشی کا دورانیہ کچھ زیادہ تھا۔
 ”قیس الہی، رات کے بارہ بجے کون سی جماعت کھڑی ہوتی ہے۔“ اس نے آنکھیں چڑھا کر سوچا پھر وہ ٹائپ کیا جو کرنے کو اس کا دل چاہا۔

”وہ تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے یہ بتاؤ آتش فشاں پھٹا ہوا ہے یا ٹھنڈا ہو گیا۔“ وہ جانتا تھا ہما اس کا اشارہ سمجھ گئی ہے تبھی اس بار خاموشی زیادہ طویل ہے۔ مدت کے بعد جب اسے یقین ہو گیا اب کوئی جواب نہیں آئے گا تبھی اس کی سکرین روشن ہوئی تھی۔

”قیس، تم دونوں میری سمجھ سے واقعی باہر ہو، سچ میں قابل رحم ہو۔“ اس کے الفاظ روشن

سکرین پر موجود تھے۔ اپنے وجود میں لمحہ بھر کا سکوت لینے کے بعد اس نے گلاس خالی کر کے بل ادا کیا پھر مضبوط قدموں سے چلتا باہر آ گیا۔

”برادر، جس حساب سے تم پی رہے تھے مجھے لگا تھا لڑکھڑاؤ گے بٹ یو آر سٹرانگ مین۔“ ایک لڑکا اس کا شانہ تھپکتا ہوا پارکنگ کی سمت بڑھ گیا۔ وہ شاید اس پر کافی دیر سے نظر رکھے ہوئے تھا اب اسے یوں حواسوں میں دیکھ کر شدید حیران ہوا تھا۔ قیس اسے کہہ نہیں سکا کہ جو وہ ”پی“ رہا تھا وہ ”کچھ اور“ نہیں تھا بلکہ سادہ سالیمنیڈ تھا جس کی اسے ان دنوں شدید ضرورت تھی۔ اس کے ڈاکٹر نے کہا تھا۔

”سر در اور چکر پانی کی کمی کہ وجہ سے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ پانی پیئیں اور آو آ رالیں کا استعمال کریں۔“

او آ رالیں تو اس نے استعمال نہیں کیا تھا ہاں یہاں جی بھر کر لیمینیڈ پی لیا تھا۔ آج کے ہیکلک دن میں اس کیلئے خود کو وقت دینا بہت ضروری تھا۔ وہ ایک کاپ تھا۔ اسے یہ شعبہ بالکل پسند نہیں تھا لیکن اختیار کرنا پڑا کیونکہ یہ اس کی ذاتی ترجیحات کی بنا پر ضروری ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ وقت جب اس نے ناسا کے ساتھ مل کر ”مون“ پروجیکٹ میں حصہ لیا تھا۔ وہ پاکستان کا کم عمر ترین آسٹرنٹ تھا جس نے اپنی زندگی کے ایک سو دس دن مون سیٹلائٹ میں گزارے تھے۔ خلاء میں جھولتے ہوئے، اپنے وجود سے نا آشنا ہو کر، ایک ریت کے ذرے کی طرح جو بس ہوا کی دوش پر یہاں سے وہاں اپنی تقدیر کے ہاتھوں اڑتا پھرتا ہے۔ بھاری بھر کم سوٹ پہنے جب وہ خلاء میں تاحد نگاہ پھیلے سیاہ رنگ کو دیکھتا تھا تو اس کا دل اس رب تعالیٰ کی ہیبت سے کانپ جاتا تھا۔ شیشے کی چادر اس کے ریٹینا پر ان گنت سیاروں اور ستاروں کی پر چھائیاں چسپاں کر رہی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے اپنے منہ پر چڑھا گلاس

دھندلا لگتا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ جان جاتا تھا یہ اس کی آنکھیں ہیں جو دھندلا گئی ہیں بھلا گلاس پر نمی کیوں آئے گی۔ اسی طرح ایک دن خلاء میں جھولتے ہوئے اسے اس کی ایک کلنگ نے پرپوز کیا تھا۔ وہ ایک آسٹر لین تھی۔ نو مسلم تھی۔ خوبصورت اور وضع دار بھی، وہ چاہتا تو اس کا رشتہ قبول کر کے آرام سے اپنی باقی ماندہ زندگی امریکہ یا آسٹریلیا میں گزار سکتا تھا۔ لیکن اس کے نصیب میں خواری تھی تبھی اسے محبت بھی پاکستان میں ہوئی اور اس نے شادی بھی وہیں کی یہ سوچے بنا کہ اب سے کچھ عرصے بعد اس کی زندگی بالکل بدلنے والی تھی۔ وہ جو خلاء کا رسیا تھا۔ اسے تسخیر کرنا چاہتا تھا۔ اس بار ایسا زمین پر آئے گا کہ پھر کبھی اڑ نہیں پائے گا۔

پانچ سال پورے پانچ سال اپنا نام ناسا میں منوانے کے بعد وہ جب پاکستان لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اسے محبت ہو چکی تھی۔ اسے شادی کرنی تھی اور پھر واپس ناسا کے ساتھ جڑ جانا تھا۔ اسے محبت ہو چکی تھی۔ اس نے شادی کی اور پھر سب تباہ ہو گیا۔ اس کا کیریئر، اس کے خواب اس کے مقاصد سب کچھ۔۔ وہاں آ کر وہ ایک معمولی سا پولیس آفیسر بن چکا تھا۔ قتل، خون، چوریاں، ڈکیتیاں بس یہی رہ گیا تھا اس کی زندگی میں۔ وہ اڑنے کے خواب، وہ خلاء کا منظر، وہ رب کی قدرت، وہ جنون و محنت سب دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ کروڑوں کمانے والا اب چند روپوں کی نوکری پر تھا۔ دنیا گھومنے والا بس ایک ہی شہر میں پھنس گیا تھا۔ زندگی جینے والا زندگی سے ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ سب تباہ ہو گیا تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ نوڈی تھا لیکن صبح سے لے کر اب تک اس نے کچھ نہیں کھایا تھا فقط طنزیہ جملوں اور بہتانوں کے۔ رات کی طرح وہ صبح بھی بھوکا ہی رہا تھا۔ ناشتے میں اس نے ایک کپ کافی اور دو کوکیز لی تھیں۔ اس کے بعد وہ کال آنے پر بھاگا دوڑا اسٹیشن پہنچا تھا جہاں ٹکڑوں میں کٹے شخص کی تصویر بنائی جا چکی تھی۔ اس نے غور سے اس

چہرے کو دیکھا اور پھر آئی بالز گھما کر شیزل کو۔

”یہ کون ہے؟“ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی شیزل نے گہرا سانس بھرا، قیس نے شانے اچکا دیے۔

”بہت ہی کوئی فضول سوال ہے، تم سمجھاؤ اسے۔“ وہ ظل ہما کو کہتی ہوئی دوسری اسکرین کی جانب متوجہ ہوئی تھی جہاں قتل ہوئے باقی لڑکوں کی تصاویر موجود تھیں۔ ظل ہما نے کھڑے کھڑے اپنی کہنی اس کی کہنی سے ٹکرائی اور مدھم آواز میں پوچھنے لگی۔

”بھوکے ہو؟“ قیس نے بے بسی سے جواب دیا۔

”کل سے۔“ ظل ہما کی شاکی نظروں نے اس کی ناک کی چونچ کو دیکھا جو قدرے سرخ لگ رہی تھی۔

”بیمار بھی ہو؟“ اس بار سوال بدلا لیکن جواب وہی دہرایا گیا۔

”کل سے۔“ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے اپنے آس پاس موجود لوگوں کو دیکھا پھر محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

”میرے گھر کب شفٹ ہو رہے ہو؟“ ترکی بہ ترکی جواب آیا۔

”کل سے۔“ پھر وہ خود ہی ٹھٹھکا، متعجب نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔

”کیا مطلب؟ یہ کچھ زیادہ گہری بات نہیں ہوگئی۔“ وہ اس کے ٹھٹھکنے پر متاثر ہوئی تھی۔

دھیمی مسکان کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

”دیکھو نا، تم کل سے بھوکے ہو، کل سے بیمار ہو کسی کو تو تمہارا خیال رکھنا چاہیے۔ کوئی تو ہو جو تمہاری عیادت کرے۔ خدمت کرے۔“ اس کی بات کے اختتام سے بہت پہلے قیس کی نگاہیں خود بخود شیزل کی جانب اٹھیں تھیں جنہیں نوٹس کرتے ہوئے ظل ہما نے اسے جھڑکا۔

”ہر وقت ”کسی“ اور ”کوئی“ صرف شیزل ہی نہیں ہو سکتی قیس، اس کے آگے بھی دنیا ہے۔“

اس نے جو جواب دیا تھا اس نے لمحہ بھر کیلئے غل ہما کو لا جواب کیا تھا۔ اس کا جواب یہ تھا۔ ”ہوگی، مجھے فرق نہیں پڑتا کیونکہ میری دنیا کو وہی ڈومینیٹ کرتی ہے۔“ اسی دوران مار یہ ان دونوں کے درمیان آئی تھی۔ ان دونوں نے اسے اپنے درمیان سے گزرنے کی جگہ دی۔ وہ میز سے کچھ کاغذات اٹھا کر چلی گئی تھی۔ شیزل نے دور سے ہی غل ہما کو مخاطب کیا۔

”اگر آپ کی چٹ چاٹ بند ہو گئی ہو تو کام کی بات کر لیں ذرا۔“ قیس کو چھوڑ وہ اس کے پاس گئی تھی۔ آدھے گھنٹے کی بحث و مباحثہ کے بعد وہ لوگ اسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے تیسری ڈیڈ باڈی ہاتھ لگی تھی۔ اوپر سے آرڈرز ملے تھے کہ وہ ہل اسٹیشن اور اس کے پیچھے موجود تمام جنگلی علاقے کو کور کریں۔ اس کیلئے انہوں نے فورسٹ ٹیم سے بھی رابطہ کیا تھا۔ جنہوں نے انہیں پوری سپورٹ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مرنے والوں کی ڈیڈ باڈیز بہت پریشہ کے بعد ان کے گھر والوں کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ بیک ٹو بیک تین قتلوں نے پاکستان کی پولیس کی ساکھ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تھی اور سب کو ہراساں کر گئی تھی۔ ہر کوئی احتیاط برت رہا تھا۔ ہر کوئی باہر نکلنے سے گریزاں تھا۔

”تین دن؟ تین بہت زیادہ نہیں ہوتے ایک جنگل میں رہنے کیلئے؟“ یہ قیس تھا جو فون پر آرڈرز سننے کے بعد بوکھلا گیا تھا۔ اچانک فیصلہ بدلا اور لیڈر شپ اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ جنگل میں تین دن کیلئے وہ اپنی ٹیم کو لیڈ کرے گا ایسا کہہ دیا گیا۔ ہر قسم کے آرڈرز اسے ہی ملنے لگے تھے۔ اس پر شیزل نے واویلا اٹھایا تھا لیکن کسی نے اس کی بات کو خاطر میں نہیں لیا۔ وہ بھی آخر کتنی بحث کرتی اس لیے چپ ہو گئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ قیس جنگل میں جانے سے کترا

رہا ہے تو اس نے جان بوجھ کر خود کو بہت پرسکون اور خاموش کر لیا۔ وہ ہر وہ کام خاموشی سے کر لیتی تھی جس پر قیس کو اعتراض ہوتا تھا۔ اس بار بھی تھا۔ وہ سب مان رہا تھا۔ اس نے ہر ایک حکم پر سر تسلیم خم کیا تھا مگر یہ بات اسے اچنبھے میں ڈالنے سے زیادہ جھنجھلا گئی تھی۔ اسے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں سے شدید الجھن ہوتی تھی۔ وہ کیسے ان کے درمیان رہ پائے گا۔ اس نے مڑ کر اپنے ٹیم ممبرز کو دیکھا جو ایکساٹڈ سے اس کی شکل کو نہارے جا رہے تھے۔

”تین دن ہمیں جنگل میں کیמپنگ کرنی ہوگی؟“ یہ ماریہ تھی جس کی آواز کی لوچ اس کے دل کی کیفیت کو بیاں کر رہی تھی۔

”کیمپنگ نہیں تحقیق۔“ شینزل کی تصحیح نے اس کے جوش پر پانی ڈالا تھا۔
 ”آل رائیٹ ہم سب سرشام ہی نکلیں گے اس لیے وقت پر آنا۔“ بوجھل پن سے کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

قیس اسے صبح سے بجا بجا لگ رہا تھا مگر وہ اگنور کر رہی تھی۔ جنگل میں قیام کی خبر شینزل اور قیس دونوں کو بد مزہ کر گئی تھی۔ ایک کو جانوروں اور کیڑے مکوڑے سے الجھن تھی تو دوسری کو اس کی ذات سے۔ وہ اس دوپہر گھر آ کر کافی دیر اس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ بھلے کام کا بنیادی اصول فقط کام تھا لیکن وہ پھر بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی۔ چاہے لاکھ وہ اسے نظر انداز کر لے نظر تو بہر حال پھر بھی آتا تھا نا اور یہ نظر ہی تھی جو اس کے اعصاب کو چٹخا رہی تھی۔
 بری طرح چٹخا رہی تھی۔ اس شام اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ ایک پختہ فیصلہ۔

☆.....☆.....☆

ثم یتزک الحزن فی طبقات
 ”پھر ادا اسی تہہ در تہہ رہ جاتی ہے۔“

آپریشن روم میں جانے سے قبل حلیمہ نے اپنی سنجیدہ سی بیٹی کو دیکھا۔ زرد رنگت، نحیف وجود، بکھی ہوئی آنکھیں۔

”ادھر آؤ۔“ دونوں بائیں کھول کر وہ اپنی بیٹی کو بلا رہی تھی جو چپ چاپ جا کر ان کے گلے سے لگ گئی۔ کافی دیر خاموش آنسو بہانے کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی ہر وہ بات جو دل میں تھی۔ ہر وہ آس جو اسے اپنی بیٹی سے تھی۔

”نیں تم جانتی ہونا ہماری زندگی اللہ کی امانت ہے۔“ مدھم آواز میں مانوس سا سوال تھا۔ بچی نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”اور ہر ایک کو اس کی اور لوٹ کر جانا ہے۔“ مریضوں والے لباس میں بیڈ پر بیٹھی اس کی ماں پینتیس سال کی نہیں بلکہ پچانوے برسوں کی لگ رہی تھی۔ کمزور جھریوں زدہ چہرہ، زندگی سے عاری آواز۔

”اور جب جانے والے چلے جاتے ہیں تو ان کے پیچھے روتے نہیں، صبر کرتے ہیں۔ ان کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ آسانی طلب کرتے ہیں۔“ بچی کے دونوں ہاتھ اس کی ماں کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں قید تھے۔ وہ نم پلکیں جھپک کر انہیں دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”آپ۔۔ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟“ سوال پر حلیمہ نے گہرا سانس بھرا۔ یوں جیسے وہ کوئی بوجھ سانسینے سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

”تمہارے بابا۔“ انہوں نے بات گول کر دی جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ ”اچھے انسان ہیں۔ تمام عمر مصروف رہے ہیں۔ تم سے بہت زیادہ محبت کی ہے انہوں، مجھ سے وعدہ کرو اپنی باقی کی زندگی تا بعد از مرگ تم ان کی۔“ بہت چھوٹی سی عمر سے لے کر اب تک حلیمہ نے نین کے دل میں یہی بات ڈالی ہے کہ اس کا باپ ایک مصروف اور معروف انسان ہے۔

وہ زیادہ فارغ نہیں ہوتا اس لیے ان کے ساتھ بہت باتیں نہیں کر سکتا۔

”کافی دیر نہیں تو کچھ لمحے ہی ہمارے ساتھ بیٹھ جایا کریں بابا۔“ ایک دن اس نے ماں سے تکرار کے دوران کہا تھا۔

”وہ اپنا سارا وقت مصباح آنٹی اور سیٹھ صاحب کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں پر وہ ہماری طرف نہیں آتے۔ ہمیں مخاطب نہیں کرتے ایسا کیوں؟“ سوال پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ حلیمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی کیا تاویل دیں کہ وہ بہل جائے۔

”وہ مصروف ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ مصروف، ایک سیاستدان پریوں بھی مصروفیت چھتی ہے اور تم نے دیکھا نہیں کل انہوں نے تمہارے لیے کتنے سارے کھلونے بھیجے ہیں۔“ وہ اسے بہلا رہی تھیں غلط کر رہی تھیں۔ وہ یہ بھول گئیں تھیں کہ ان کی بیٹی گیارہ سال کی ضرور ہے مگر گیارہ سال والے بچوں جیسی سوچ نہیں ہے اس کی، وہ اس عمر سے بہت آگے نکل گئی ہے بہت زیادہ آگے۔

”مجھے خیرات کی چیزیں نہیں چاہیے۔ وہ میرے لیے ٹوائز لائے ہیں۔ وہ اپنے نوکروں کے بچوں کیلئے بھی کھلونے لائے ہیں۔ یہیں سے آپ دیکھ لیں ہم ان کیلئے کیا ہیں۔“ اس دن کے بعد سے نین کا دل جہانگیر سے کھٹا ہو گیا تھا۔ وہ بابا سے ”صاحب جی“ کے درجے پر فائز ہو چکے تھے اور آج تک اسی درجے پر تھے۔

”میں یہ نہیں کروں گی۔“ ماضی کو جھٹک کر اس نے ماں کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اس جواب کے ساتھ مزید ٹھنڈا ہوتے دیکھا۔

”اگر آج آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو میں وعدہ کرتی ہوں، کل میں جہانگیر مینشن چھوڑ

دوں گی۔ وہاں ہرگز نہیں رہوں گی۔ آپ اگر اب بھی مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہیں تو سوچ لیں۔“ حلیمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ زندگی نے وفا نہیں کی تھی۔ ان کا آپریشن ناکام گیا تھا۔ حلیمہ نے کہا تھا۔

”چوری اور دھوکے سے لیے ہوئے پیسوں میں عذاب ہوتا ہے جو خوشیوں کے ساتھ زندگی کو بھی نکل لیتا ہے۔ تم چاہتی ہو میں وقت سے پہلے مر جاؤں۔“ بہت منتوں، تاویلیوں کے بعد حلیمہ ان پیسوں سے علاج کروانے پر راضی ہوئی جنہیں نین نے ان کا حق قرار دیا تھا۔

”میں ایسا نہیں چاہتی بالکل بھی نہیں۔“ اس نے پر زور انداز میں تردد کیا۔

”تو پھر کیوں نین، تمہارے بابا میرا علاج کروا تو رہے ہیں۔ باہر بھی بھیج رہے تھے مگر میں تمہاری وجہ سے نہیں گئی۔ اور یہاں۔۔۔ کیا کمی کی انہوں نے جو تم بھند ہو کہ میں ان ہی پیسوں سے علاج کرواؤں۔ آپریشن کرواؤں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ مصباح کی تلخ نظروں کو نہیں بھول رہی تھی۔ وہ ان کی ناپسندیدگی کو نہیں بھول رہی تھی۔ وہ انہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ مصباح نے کہا تھا۔

”جہانگیر کے پیسوں پر تمہاری ماں اور تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ خیرات کی رقم سے علاج ہو رہا ہے۔ تم لوگوں کا پیٹ بھر رہا ہے کیا یہ کافی نہیں۔“ اسے خیرات نہیں چاہیے تھی۔ اسے صدقہ نہیں چاہیے تھا۔ وہ کسی اور کی مصیبت اپنی ماں کے حصے میں نہیں لے سکتی تھی۔ جہانگیر کی اولاد اور اس کے سر کی رقم وہ اپنی ماں کے حتمی آپریشن پر خرچ نہیں کروانا چاہتی تھی۔ اس نے جہانگیر کے، لیے وقت سے تھوڑا پہلے خود ہی اسی ہسپتال میں اپنی ماں کے آپریشن کا وقت لے لیا تھا۔ اس کے دل کو تسلی تھی کہ وہ پیسے چوری کے ضرور تھے لیکن صدقہ و خیرات کے ہرگز نہیں تھے۔ مگر اس کی تسلی، تسلی ہی رہی۔ اس کی ماں دنیا چھوڑ کر اسے اکیلا کر کے چلی گئی۔

اور آج وہ اپنی ماں کی لاش کو لان کے وسط میں پڑا دیکھ رہی تھی۔ سبزے کی چادر کے اوپر چار پائی پر پڑا وجود کفن کی مانند ہی سفید تھا۔ نور تھا کا برسا گیا تھا۔ ہوا کے دوش پر اڑتے پتے اس کی ماں کی چار پائی کے نیچے آ، آ کر آہ زاری کر رہے تھے۔ اس سے تین سال چھوٹے مگر چھ سال بڑا لگتے اس کے بھائی نے اپنا ایک بازو اس کے گرد پھیلا کر اسے خود سے لگایا تھا۔ وہ ٹھس لب سے، آنکھوں پر بند باندھے اپنی ماں کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھے گئی تھی۔ جو کچھ ہی دیر میں وہاں سے اٹھالیا گیا تھا۔ شام کو وہ سارا لان لوگوں سے خالی ہو گیا تھا۔ وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ مالی بابا نے پورے لان کو پانی سے دھو دیا تھا۔ نم گھاس پر گھٹنوں میں سر دیے وہ وہیں بیٹھی تھی جہاں اس کی ماں کو لٹایا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے شانے پر ایک گرم لمس محسوس ہوا تھا۔ وہ اس لمس کو پہچانتی تھی۔ وہ اس کا بھائی تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ سوال احمقانہ تھا۔ عمر بھی تو کم تھی نا۔ نین نے سر اٹھا کر سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر واپس سر گرالیا۔

”رولو۔“ الفاظ پھر سے ابھرے تھے۔ اس بار اس نے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اب بھی اس کے شانے پر ہاتھ رکھے اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس کا سفید سوٹ ایک بار پھر گھاس کے داغ سے گندا ہو گیا تھا لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔

”تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاؤں۔“ ہمدردی تھی یا محبت سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کو کمرے میں بند ہو کر بے آواز روتا ہوا دیکھ آیا تھا۔ وہ اس کے نارونے پر بے چین تھا۔ وہ جانتا تھا وہ جب تک نہیں روئے گی نارٹل نہیں ہوگی۔ مگر وہ اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ کسی کی بھی بات نہیں سن رہی تھی۔

”پانی پیو گی؟“ ایک اور کوشش، ایک اور رنجیکشن۔

”یہاں سے چلے جاؤ پلیرز، میں اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز بھی نارمل نہیں تھی۔
اس کے بھائی نے گہرا سانس بھرا۔

”میں یہ نہیں کر سکتا، تمہیں میری ضرورت ہے۔“ نین چیخ اٹھی۔ اس کا ہاتھ درشتی سے جھٹکا
تھا اس نے۔

”مجھے نہیں ہے کسی کی بھی ضرورت، تمہاری اور نہ ہی کسی اور کی۔“ سرخ آنکھوں کے
ساتھ وہ گلے میں خراشیں ڈال کر چیخ اٹھی تھی۔ اس کی آواز چٹخنی ہوئی تھی۔ بدن جھلسا ہوا۔

”مگر مجھے ہے نین، میں تمہارا بھائی ہوں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے تمہیں یوں دیکھ کر۔“ وہ
تلخی سی مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ہزار شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ دکھ ایسا تھا کہ مانو دل چیر
گیا ہو۔ درد ایسا تھا جیسے کند چھری سے بدن کٹ رہا ہو۔ اس کے بھائی کے دل کو کچھ ہوا۔
ہوک اٹھی۔ بہت بری ہوک۔

”تم لوگوں کو تکلیف۔۔۔ ہونہہ۔“ جملہ تھایا تیزب، سیٹھ صاحب کی آنکھیں بھرا اٹھیں۔
اس نے سختی سے لب بھینچتے ہوئے گلے میں اٹکتے گولے کو نیچے اتارا۔ اس کی بہن کتنی متنفر ہو چکی
تھی اس سے، کتنی دور نظر آرہی تھی وہ۔

”تم جب تک روگی نہیں۔“ اس نے بھاری قدرے گیلی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”کچھ
کھاؤ گی نہیں۔ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ بالکل نہیں۔“ وہ ایک بار پھر اسے بازوؤں کے
حصار میں لے چکا تھا۔ باپ نے بچپن سے اس کے کان میں یہ بات ڈالی تھی کہ وہ اس کی ذمہ
داری، اس کی عزت ہے۔ ماں کے بعد اس کا رتبہ اس پوری دنیا میں اس کیلئے زیادہ ہونا
چاہیے۔ وہ اس کا محافظ ہوگا۔ اسے ہر دھوپ چھاؤں سے بچائے گا۔ اسے کبھی تنہا نہیں
چھوڑے گا تو پھر اب کیسے وہ اسے یوں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ مرتے دم تک اس کے ساتھ رہے گا

اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم، جینے دو مجھے۔“

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بھاگتی ہوئی وہاں سے گئی تھی۔ مالی بابا پڑمردہ دل کے ساتھ دور سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس رات اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور اگلے پورے دن وہ کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ شام سے تھوڑا پہلے حلیمہ کے پورشن میں سے ملازمہ کاغذ لے کر آئی تھی جس پر دو لائین تحریر تھیں۔

”میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ آپ سمجھنا میری ماں کی طرح میں بھی مر گئی۔“ جہانگیر سکتے کے عالم میں وہاں بیٹھے رہ گئے تھے مگر ان کا بیٹا چپ نہیں رہا تھا۔ وہ چیختا چلاتا واویلا کرتا اپنی بہن کو ڈھونڈنے نکل گیا تھا۔ جہانگیر اور مصباح اس کے شور پر ہنق دق رہ گئے تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے ان کا بیٹا اپنی بہن کیلئے کتنا حساس ہے۔ مصباح نے تو بہت کوشش کی تھی۔ بہت من گھڑت باتیں بڑے طریقے سے گھڑی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنی سوتیلی بہن سے متنفر ہو جائے۔ مگر وہ چھوٹا تھا۔ اس کے دماغ میں باتیں جگہ نہیں بناتی تھیں۔ اس لیے وہ اس سے دور ہونے کی بجائے مزید اس کے قریب ہو گیا۔ اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا اس لیے اسے صرف اسی سے بے انتہا انسیت ہوئی۔ یہ قلبی رشتہ تھا یا خون کا جوش جو بھی تھا وہ اپنی بڑی بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ حد سے زیادہ والی محبت۔

☆.....☆.....☆

”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ اپنے دوست کے سوال پر مڑا پھر مسکرا کر جواب دیا۔

”رتبہ کے پاس۔“

”اوہ۔“ اس کے دوست نے لبوں کو سیکڑا۔ ”مگر تم کل ہی تو گئے تھے۔“ وہ اپنے دوست

کی بات پر ایک بار پھر مسکرایا۔

”میں روز جاسکتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن آج اس لیے جا رہا ہوں کیونکہ آگے کے دو تین دن یا شاید ایک ہفتہ نہیں جا پاؤں گا۔“ اس کا دوست سسٹم آن کرتے ہوئے ٹھٹکا۔

”ایسا کیوں؟“ سسٹم آن ہو چکا تھا۔ رتبہ کچن میں کچھ بناتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”پتا تو ہے تمہیں یار۔“ آخری جملہ اس نے آنکھ مار کر ادا کیا تھا۔ جیکٹ کے بازو موڑ کر اس نے گھڑی کو سیٹ کیا۔

”پھر تم اسے بتا دینا یہ نا ہو پریشان ہو جائے وہ، سنبھلتی نہیں ہے مجھ سے پھر۔“ وہ سر کو پیچھے گرا کر ہنسا۔ اس کی ہنسی اچھی تھی۔ اس کے دوست نے سوچا۔

”کس طرح کے ڈاکٹر ہو تم ایک مریض سنبھالا جاتا تم سے۔“ اس نے بھی آگے سے جتانے والا جواب دیا تھا جو گھڑی سیٹ کرتے اس انسان کو عیش عیش کر گیا۔

”مریض سنبھالا جاتا ہے رتبہ نہیں سنبھالی جاتی، ایک تم کم تھے نامیری زندگی میں جو اس کا بھی ایڈیشن کر دیا ہے۔“ سفید کوٹ والے کے دوست نے ہچکچہ کی تھی۔

”تمہیں ضرور اپنے میڈیکل پروفیشن کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ کوئی کہے گا موصوف ورلڈ ہیلتھ کے ساتھ کام کر کے آرہے ہیں۔“ سفید کوٹ والا سلگ گیا۔ دروازے کی طرف اس شخص کو جاتے ہوئے دیکھ گویا ہوا۔

”مجھے کسی کی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آج میں زیادہ فارغ بھی نہیں ہوں اس لیے اپنی میٹنگ جلدی ختم کرنا ورنہ میں نے چلے جانا ہے۔“ دروازے کی چوکھٹ کو پار کرتا وہ شخص اونچی آواز سے اسے وارن کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”پھر آج کی دیہاڑی بھی آدھی لینا۔“ سفید کوٹ والا صدمے کی حالت میں اس کا بات

سنتارہ گیا۔

”میں ایک ڈاکٹر ہوں۔“ وہ بلند آواز میں صدے سے نکلنے کے بعد چلایا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ کو عبور کرتا وہ انسان حد سے زیادہ محظوظ ہوا۔ اس کے ہونٹوں کی ہنسی رتبہ نے بھی محسوس کی تھی۔ اس وقت جب وہ پشت موڑ کر دروازہ لاک کر کے سیدھا ہوا تھا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی حسب عادت سکچنگ کرنے میں مصروف تھی۔ مگر اسے وہاں دیکھ کر مصروف نہیں رہی تھی۔ اس نے سکیج بک کو الٹا کیا۔ مینسل اس کے اوپر رکھی پھر اسے دیکھ کر بجھے چہرے پر گلاب کھلا کر بولی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی جلدی آگئے۔“ اس کا بھائی جو اس کے برابر نیچے کارپٹ پر آکر بیٹھا تھا اپنے گھٹنے پر بازو ٹکا کر پھکی مسکان لبوں پر لے آیا۔

”تم نے تنہائی کو اتنا قریب کر لیا ہے کہ۔“ اس نے کندھے اچکائے۔“ اب کوئی تمہارے قریب ہو بھی تو تمہیں یقین نہیں ہوتا۔“ وہ اس کا گلہ محسوس کر گئی تھی۔ اس کے شکوے میں مایوسی سی تھی۔

”کوئی۔“ وہ رکی۔“ نصیحت سناؤ گے آج؟“ وہ نفی میں گردن ہلارہا تھا۔ نظریں اسکیج بک پر تھیں۔

”ناہ، آج صرف ہماری باتیں ہوں گی۔ آج میں صرف اپنی بہن کے ساتھ وقت بتانے آیا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔ روئی کے گالوں جیسا نرم اور نحیف ہاتھ اس کے چوڑے ہاتھ کی قید میں تھا۔ وہ اپنے اور اس کے ہاتھ پر نظر رکھے رکھے یکدم ہولے سے ناک سے آواز نکال کر مسکرایا ساتھ میں نفی میں بھی سر ہلارہا تھا جیسے اپنی ہی سوچ کو جھٹک رہا ہو۔ رتبہ اس کے تاثرات پڑھنا جانتی تھی۔ تنہائی کی ایک اور عنایت۔ اس نے مدھم آواز میں اپنے

بھائی کو مخاطب کیا۔

”کچھ کہنا چاہتے ہو“ تائیدی انداز میں سر ہلایا گیا پھر اس نے نہایت احترام کے ساتھ اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کا بازو ایک بار پھر سے کھڑے گھٹنے پر آن ٹکا تھا۔

”کچھ دن نہیں آ پاؤں گا یہاں، تھوڑا کام ہے۔ اس لیے سوچا آج ہی آ جاؤں۔“ رتبہ نے گہرا سانس لیا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں کچھ زیادہ واضح ہو گئی تھیں۔ اس نے غور کیا، اس کی بہن کا وزن دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔

”وہ کہو جو دل میں ہے۔“ وہ ایک بار پھر سے نفی میں سر ہلارہا تھا گویا دل کی بات کو جھٹک رہا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی فیلنگز ہیں جو کمزور کرتی ہیں باقی تم جانتی ہو تمہارا بھائی کتنا مضبوط ہے۔“ وہ بجھے دل کے ساتھ مسکرائی، مسکراہٹ سے زیادہ آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔

”میری وجہ سے تم۔“ وہ اس کی بات کاٹ گیا، لحاظ بھری درشتی سے۔

”تمہاری اور میری وجہ الگ نہیں ہے اس لیے اس بات کو جانے دو۔ میں یہاں اپنی بہن کے ساتھ وقت بتانے آیا ہوں۔ ہر جائی کے ذکر کیلئے نہیں۔“ رتبہ نے سامنے کی اور دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے کیمرہ تھا۔ سفید کوٹ والا اس پہلی جلد والی لڑکی کو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

”ایسا ہے تو پھر کچن میں چلتے ہیں۔ تمہارے لیے کچھ۔“ وہ رکی۔ اسے بولنے میں اب بھی دشواری ہوتی تھی۔ ”بنا دیتی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”یہ کی نابات۔“ اس کا ہاتھ رتبہ کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ وہ اسے تھام کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا کھاؤ گے۔“ وہ دونوں کچن میں جا رہے تھے۔ ایک اسکرین میں ان کی پشت دکھ

رہی تھی۔ ایک میں لفٹ سائیڈ اور رائیٹ سائیڈ، ایک میں اوپر سے جاتے ہوئے دکھ رہے تھے اور ایک میں بالکل سامنے سے۔

”آں۔“ بہت دراز آں تھا۔ بہت فرصت کے ساتھ سوچا گیا پھر جھٹ سے جواب آیا تھا۔ ”کچھ بھی لیکن پیک کر کے دینا ہے۔ میں مزید کچھ دن تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا کھانا چاہتا ہوں۔“

سفید کوٹ والے کافون بجا تھا۔ اسے فوری طور پر ڈیوٹی کیلئے نکلنا تھا۔ وہ اسکرینز آف کر کے کمرے اور اپارٹمنٹ کو اچھے سے لاک کر کے وہاں سے باہر آیا تھا۔ لفٹ میں کوئی پراہلم تھی۔ اس لیے اس نے سیڑھیوں سے اترنے کا فیصلہ کیا۔ سفید کوٹ کو بازو پر ڈالے دوسرے ہاتھ سے فون کو سکروں کرتا ہوا وہ برق رفتاری سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ موبائل کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں اتنا انہماک تھا کہ اسے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اس کے بدن سے اٹھتی خوشبو اور ایک دوسرے کو کراس کرتے وہ دو۔

ٹینزل نے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ٹھٹھک کر خود کو روکا اور مڑی۔ اس کی خوشبو جانی پہچانی سی تھی۔ وہ الجھے ہوئے انداز سے اس انسان کو دیکھ رہی تھی جو میسج ٹائپ کرتا ہوا غڑاپ سے باقی سیڑھیاں بھی اتر گیا۔ شناسائی کی رمت کی خاطر اس نے تھوڑے سے لب وا کر کے اس کو پکارنے کی کوشش کی جس کا اب فقط سر نظر آ رہا تھا لیکن پھر وہ بھی غائب ہو گیا۔ وہ دوسری منزل سے نیچے اتر چکا تھا۔

”میں بھی پاگل ہو گئی ہوں۔“ کچھ سوچ کر سر جھٹک کر وہ خود کو ملامت کرتی اوپر آئی۔ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف مڑتے ہوئے اس کی نگاہ خواہ مخواہ تیسری منزل کی سیڑھیوں پر پڑی تھی۔ پھر وہ تیزی سے مڑ کر اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے آئی اور اس کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

ابھی وہ بیگ میں کپڑے ٹھونس ہی رہی تھی جب اس کا فون بج اٹھا۔ عجلت میں اس نے کال رسیو کر کے فون لاؤڈ اسپیکر پر لگایا۔ وہ جاسمین ڈسوزہ تھیں جو لائن پر تھیں۔

”قیس نے مجھے بتایا تم نے ماریہ کو جنگل میں جانے سے منع کر دیا ہے۔ اسے برا لگا ہے اس بات کا۔“ وہ الماری میں سے اپنا ایک سوٹ نکالتے ہوئے بولی۔

”کسے برا لگا۔ آپ کے چہیتے کو یا اس کی چہیتی کو؟“ جاسمین کو اس کی بات بری لگی جس کا انہوں نے برملا اظہار کر بھی دیا۔

”اگر میں کہوں گی تمہارے چہیتے کو تو تم تپ جاؤ گی۔ مجھے تمہاری بات بہت نازیبا لگی ہے اس لیے یہ بتاؤ تم نے ماریہ کو کک آؤٹ کیوں کیا؟“

”میں اس بارے میں جواب دہ نہیں ہوں۔“ اس کی آواز میں تھوڑی کڑواہٹ تھی جسے خود ہی محسوس کر کے وہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔

”یہ بات تمہارے منہ سے سوٹ نہیں کرتی محترمہ، کیونکہ میری پوزیشن تم سے بہت اوپر ہے۔“ انہوں نے جتایا تھا۔ شیزل نے تھک کر لمحے کا پاز لیا پھر جھنجھلا کر بولی۔

”یہ ٹرپ کیس کے حوالے سے ہے۔ پکنک کے نہیں جہاں میں رنگ برنگے جوڑوں کو دیکھ کر اگنور کر دوں گی۔“ جاسمین ڈسوزہ کی ناراض سی آواز اسپیکر سے ابھری۔

”تم اب قیس کے ساتھ ساتھ ماریہ پر بھی بہتان لگا رہی ہو۔ تم کیا بنتی جا رہی ہو شیزل۔“ اس نے بیگ میں پٹخنے کے سے انداز میں کپڑے پھینکے پھر لب کاٹتے ہوئے گویا ہوئی۔

”میں وہ کہہ رہی ہوں جو میں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے جلد از جلد بس یہ کیس بند کرنا ہے۔“ جھنجھلاہٹ سے بھرپور آواز ائیر پیس سے برآمد ہوئی۔ اس پورے کمرے میں ان کی آواز گونج رہی تھی۔

”تمہیں آخر جلدی کس بات کی ہے؟“

بات کی تہہ تک پہنچنا جاسمین کی فطرت بھی تھی اور ان کا شعبہ بھی۔ جواب الٹ موصول ہوا۔ جس سے وہ متفق نہیں ہوئیں۔

”مجھے احد کے ساتھ شادی کرنی ہے اور پھر اس شہر کو چھوڑ جانا ہے۔“ وہ صرف خود کو بہلا رہی تھی یہ اسے پتہ تھا لیکن جاسمین کو اس کی بھنک کیسے لگ گئی۔ ان کی ہنسی اسے بوکھلا گئی۔ وہ چند سپر زکو فائل میں اکٹھا کر رہی تھی۔ اس نے ایسا کرنا بند کر دیا۔

”حقیقت یہ نہیں ہے شیزل، حقیقت یہ ہے کہ تمہیں قیس کے ساتھ نہیں رہنا۔ اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے تم ہانپ رہی ہو اور یہ غلط بات ہے۔“ ہنستے ہنستے وہ یکدم سنجیدہ ہو کر گویا ہوئیں۔

”دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔“ اس نے خود کو کہتے ہوئے سنا۔ ”ایک وہ جو آپ نے کہی اور ایک وہ جو میں نے کہی۔“

”تم وہ باتیں کیوں کرتی ہو لڑکی جو فساد پیدا کر دیتی ہیں خبردار جو منہ سے مزید کچھ نکالا۔“ وہ اسے ڈانٹ رہی تھیں اور نا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ شیزل چپ چاپ ان کی ملا متیں سنتی جا رہی تھی اور پھر فون بند ہو گیا۔ شام کے سائوں سے پہلے وہ اور اس کی ٹیم جنگل کے اس ڈائریکشن میں پہنچ چکے تھے جہاں دوسری لاش برآمد ہوئی تھی۔ فورسٹ ٹیم کے دو ممبر انہیں محفوظ مقام پر لے گئے تھے۔ ماریہ، نشاء اور سعد اس ٹیم کا حصہ نہیں بنے تھے۔ کمال، ظل ہما، قیس اور شیزل تھے جو وہاں موجود تھے۔ وہ خالی الذہنی کی حالت میں اسے کمپ لگاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔



وانت لعینی قرۃ حین نلتقی
وذکرک یشفی اذا خدرت رجلی

”جب ہم ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو، تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور جب میرا پاؤں سن ہو جاتا ہے تو تمہیں یاد کرنے سے مجھے شفا ہو جاتی ہے۔“
وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کبھی انگلیاں چٹختا، کبھی لب کاٹتا اور کبھی گہرے گہرے سانس بھرتا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے اور کیا نا کرے۔ وہ اپنی ماں کو شیزل کی حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ شیزل پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جو پیدا ہوتے ہی مر گئی اور یہ بھی کہ وہ آج تک نفرت کرنے کے باوجود اپنے سابقہ شوہر سے نفرت نہیں کر پائی۔ آج بھی کہیں نا کہیں اس کے دل میں اس کے سابقہ شوہر کیلئے محبت ہے۔ وہ اپنی ماں کو بتانا چاہتا تھا کہ اس سب کے باوجود وہ شیزل سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس سب کے باوجود وہ بری طرح سے اس کی محبت میں مبتلا ہے۔

رحمت نے اپنے خوب رویے کو دیکھا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے گرے ٹراؤزر اور مرون جری شرٹ میں ان کا بیٹا چمک رہا تھا۔ اونچا قد، چوڑے شانے، گھنے بال، خوبصورت آنکھیں اور دل موہ لینے والی مسکان۔۔۔ ارے اس کی مسکان کہاں گئی؟ انہوں نے ٹھٹھک کر سوچا۔ اس فریم میں سب ٹھیک تھا مگر اس کی پریشانی ٹھیک نہیں تھی۔ یہ پریشانی کیونکر ان کے بیٹے کو ہوئی؟

”احد سب ٹھیک ہے؟“ ماں کی پکار پر اس کے قدم سیکنڈز میں رکے تھے۔ وہ متحیر انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔ کیا اس کی پریشانی بولنے لگی ہے؟ اسے نئی فکر لاحق ہوئی۔

”ہاں جی۔“ چھوٹے ہی کہا۔ پھر اپنے بازوؤں کے روٹنگٹوں پر اچھتی سی نگاہ ڈالی جو سرد ہوا کے تھپڑوں کے سبب کھڑے نہیں ہوئے تھے بلکہ رحمت کے اسے پکارنے پر ہوئے تھے۔ وہ تابعدار تھا۔ وہ فرمانبردار تھا اور وہ ان سے ڈرتا بھی تھا۔

”تم پریشان دکھ رہے ہو۔“ اس نے اپنے سرخ ہونٹ دانتوں میں پکڑ کر چھوڑے پھر پھسکی سی مسکان کے ساتھ اعتراف کیا۔

”تھوڑا سا ہوں۔“ گرے موزوں میں قید اس کے پاؤں کی انگلیاں یک لخت سرد ہوئیں۔ حالانکہ کے کلاگز پہنے ہوئے تھے پھر بھی اسے لگ رہا تھا اس کے پاؤں ٹھنڈے ماربل پر ہیں۔

”تو مجھ سے بانٹو پریشانی بچے، خود کیوں پی رہے ہو سارا غم۔“ وہ تیزی سے چلتا ہوا ان کے پاس آ کر بیٹھا۔ خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے اس نے اپنی گرے آنکھوں سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ جو اس کے لفظوں کی منتظر تھیں۔ اس کی پریشانی سننے کیلئے بے تاب، ان کی بے تابی ختم ہوئی۔ ان کے گبرو جوان بیٹے نے بولنا شروع کیا۔

”ماں میرا ایک دوست ہے۔“ اس کے لفظ خاموش لاؤنج میں گونجنا شروع ہوئے۔ وہ ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ سب اپنی ماں سے کہہ نہیں پا رہا۔ رحمت کی سماعت اس کا ہر حرف جذب کر رہی تھی۔ بات زیادہ گھمبیر تھی ایسا انہیں لگا تھا۔ بات بالکل معمولی ہے یہ انہوں نے جان لیا۔

”تو اس میں تو کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ خواہش کا اظہار ہر بالغ کا حق ہوتا ہے۔ وہ بنا جھجک اپنے پیرنٹس سے بات کر سکتا ہے۔“ احد کی گھنی پلکوں کی اوٹ میں چھپی آنکھوں میں لحظہ بھر کو ایک تاثر ابھرا تھا جسے پلکیں جھپ کر جھٹکتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”ماں وہ لڑکی اس سے بڑی ہے۔“ رحمت نے ہنستے ہوئے ہاتھ کو ہولے سے گھٹنے پر مارا۔
 ”تو کیا ہوا شینزل بھی تو تم سے بڑی ہے قریباً دو سال، میں پھر بھی تمہاری اور اس کی شادی
 کیلئے راضی ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہوتی بیٹا۔“ اس نے تھوک نگلا، گہرا سانس بھرا اور
 باقی لفظوں کو دل کے ساتھ ساتھ لبوں سے بھی باہر نکالا۔

”ماں وہ شادی شدہ تھی۔ اس کی اولاد بھی تھی جو پیدا ہوتے ہی مر گئی۔“ اب رحمت کی بولتی
 بند ہوئی تھی بالکل ایک منٹ کیلئے، وہ یک ٹک اپنے بیٹے کو تکیے گئیں پھر انہوں نے گلا کھنکھار
 کر کہنا شروع کیا۔

”یہ بھی کوئی ایسی نامناسب بات نہیں ہے۔ ہمارے دین میں بیواؤں اور طلاق
 یافتہوں سے شادی کرنا بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے ایک اچھے معاشرے کی ترویج
 ہوتی ہے۔ بہت سی برائیاں ہیں جو آج کے دور میں لبرل ازم کے خوبصورت سے کور میں
 لپٹ کر ماحول کو بگڑے ہوئے ناسور سے زیادہ گندا کر رہی ہیں۔ یہ عمل ان عورتوں اور
 مردوں کو اس برائی سے بھی بچاتا ہے۔ ہمارے نبی خاتم النبیین ﷺ نے اپنے سے بہت
 بڑی عمر کی عورت سے شادی کی تھی۔ بیوہ سے بھی کی تھی اور طلاق یافتہ سے بھی، انہوں نے
 شادی کی کیلنگریز پلیٹ میں پیش کر کے ہمیں دے دی ہیں کہ آیا ہم کس طرح کا ہمسفر اپنے
 لیے چن سکتے ہیں۔ جب ہمارے دین میں اس کی ممانعت نہیں ہے تو ہم کیسے خود اس چیز کو
 غلط جج کر سکتے ہیں۔ اپنے دوست سے کہو بے فکر ہو کر اپنے گھر والوں سے بات کرے۔ وہ
 ضرور انکار نہیں کریں گے۔“

اتنی سی بات تھی۔ اتنی عام سی بات تھی۔ جسے سر پر غبار کی طرح چڑھا کر وہ پچھلے تین گھنٹوں
 سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ پہلے ہی ماں سے بات کر لیتا تو کم از کم اتنی پریشانی تو نہیں جھیلنی

پڑتی۔ وہ ویسے بھی شینزل کے منہ سے کسی اور کیلئے اعتراف سن کر بہت اداس تھا۔ اسے یاد آیا وہ کل اس کے پاس گیا تھا اس سے بات کرنے۔

شینزل ٹیبل پر خاکی کاغذ میں لپٹے سرخ تازہ پھولوں کا گلدستہ پڑا ہوا تھا۔ جن کے درمیان میں سے سبز شاخیں سی نکل رہی تھیں۔ ایک صوفے پر احد بیٹھا تھا۔ سیاہ ڈریس پینٹ شرٹ میں، ٹائی ندار دھٹی اور خاکی رنگ کا کوٹ صوفے کی انتہائی بائیں جانب پڑا ہوا تھا۔ جبکہ اس کے عین سامنے دوسرے صوفے پر شینزل ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ اتفاق سے اس نے بھی آج خاکی رنگ کا کوآرڈ سیٹ پہنا ہوا تھا۔ باکس پلاز و تھا اور اوپن لانگ شرٹ تھی جس کا ایک حصہ گھٹنے پر جما تھا جبکہ دوسرا ٹک رہا تھا۔ سیاہ رنگ کے موزے تھے۔ بالوں کا جوڑا بندھا تھا اور کالر نیک گرم سٹولر کی وجہ سے چھپ چکا تھا۔ اس نے سبز کافی مگ احد کی طرف بڑھایا جسے شکریہ ادا کرتے ہوئے تھام لیا گیا۔

”بہت دنوں بعد آئے۔“ اس نے خود کو کہتے سنا۔ کڑوی سیاہ کافی دونوں کو تراوٹ بخش رہی تھی۔

”تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگتا اس لیے۔“ وہ یکدم ہنس دی۔ احد نے اس کی ہنسی سے نظریں چراتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا۔

”پہاڑی لوگ بھی طنز کرتے ہیں۔ دلچسپ۔“ وہ نجمل ہوا۔

”پہاڑی لوگ بھی انسان ہوتے ہیں۔“ اس کی آواز مدھم، بھاری اور شائستہ تھی۔ شینزل نے بھنویں اچکائیں۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

”جن کے سینے میں دل ہوتا ہے اور۔“ اس نے تھوڑا توقف کیا، سوچا، پھر کہا۔ ”وہ چاہتا ہے اس کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ اسے اپنایا جائے۔“ وہ چونکی۔ نظر اس کے چہرے پر

دوڑائی جس پر سنجیدگی بری طرح بچ رہی تھی۔ ادھر ادھر جھکی ہوئی بکھرتی نظریں اور کافی کے گھونٹ بھرتے سرخی مائل ہونٹ۔ اس نے ایک گہرا سانس بھرا وہ بلاشبہ انتہا کا ہینڈسم انسان تھا۔ وجاہت کا پیکر، سویر اور نفیس۔ وہ بزنس میں تھا۔ اگر وہاں کوئی اس طرح کا ایوارڈ ہوتا تو ضرور اسے ملتا۔ اس نے اپنی سوچوں کو جھٹکا۔ احد کے عقب میں اس کے اپارٹمنٹ کا پورا کھلا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی بھی مرد آتا تھا تو وہ اسی طرح پورا دروازہ کھول دیا کرتی تھی۔ پھر اسے بند نہیں کرتی تھی۔ یوں وہ خود کو ”محفوظ“ سمجھتی تھی۔ شروع شروع میں احد کا اس کے گھر آنا منع تھا لیکن جوں جوں جان پہچان بنی۔ شرافت کا عنصر نظر آیا۔ لحاظ اور تمیز کی جھلک ملی۔ اس کے گھر کے دروازے احد کیلئے کھل گئے۔ شروع شروع میں وہ اس کے آنے پر مین ڈور پورا کھول کر اندر چلی جاتی تھی اور جب تک احد واپس نہیں جاتا تھا وہ مین ڈور بند نہیں ہوتا تھا۔ بعد ازاں احد نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ اندر آتے ہی وہ دروازہ کھول کر اسے دیوار کے ساتھ لگاتا اور پھر اس کے ساتھ ہی اپنے شوز اتار دیتا تھا۔ اسے شینزل کا محتاط پنا اچھا لگا تھا۔ شینزل کو اس کا اخلاق اور اس کا کردار۔

”میں تمہیں حقیقت بتا چکی ہوں۔“ احد نے اوپر والے ہونٹ کو دانٹوں میں جکڑ کر چھوڑا ساتھ ہی اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔

”مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔“ وہ پھیکا سا مسکائی۔

”تمہیں شاید نہ پڑے لیکن تمہارے آس پاس کی دنیا کو پڑے گا۔“

کافی کاگ دونوں کے ہاتھوں میں قید تھا بس فرق اتنا تھا شینزل اسے دیکھ رہی تھی اور وہ سیاہ مائع میں لرزتے اپنے چہرے کو۔

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔“ شینزل کو حیرانی ہوئی۔ حیرت سے ہی گویا ہوئی۔

”تم ضدی نہیں تھے احد، ضد کیوں کر رہے ہو۔“ وہ چھوٹے ہوئے بولا اور جو الفاظ کہے تھے اس نے شیزل کو ششدر کر دیا۔

”کیونکہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔“ کافی کو گھورنا ترک کر کے، وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا تھا۔ ایش گرے آنکھوں کے حصار نے پوری طرح شیزل کو اپنے قبضے میں لیا۔ اس بری طرح سے کہ فرار مشکل نظر آئی۔ دونوں کے دلوں کو کسی نے مٹھی میں جکڑ کر چھوڑا تھا۔ خون پوری رفتار سے رگوں میں دوڑا۔

اے ابن آدم، ذرا نگاہ نیچی رکھ

یہ نہ ہو کہ

حوا بہکے اور سزا لہکے

”میرے خیال سے اتنی وضاحت کافی ہے۔“ کمزور لمحہ چپکے سے آ کر گزر گیا۔ بہت نرمی سے اس نے اپنی آنکھوں کی قید سے اس کی آنکھوں کو چھڑایا تھا۔ پھر وہ واپس اپنے سابقہ کام میں مشغول ہو گیا۔ گھونٹ بھرنے کے بعد سیاہ مائع میں خود کو تکیے میں۔

”تم۔“ آنکھیں بند کر کے اس نے خود کو سنبھالا۔ ”تم جاؤ یہاں سے۔“ وہ اتنے عرصے میں پہلی بار اس کی آنکھوں کی مقناطیسیت سے تائب ہوئی تھی۔ پہلی بار ہی احد کی پرسنالٹی کی کشش اس پر عیاں ہوئی تھی۔

”ہرگز نہیں، گزرے ہوئے لمحہ کو ماضی جان کر ہمیں بات پھر سے وہیں سے شروع کرنی چاہیے جہاں سے۔“ شیزل نے مستحکم انداز میں اسے ٹوک دیا۔

”احد میں ابھی اس چیز کیلئے تیار نہیں ہوں۔ میری شادی شدہ زندگی بہت سے کرائسز کا شکار رہی ہے۔ میں نے اس وقت میں بہت کچھ جھیلا ہے۔ بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ اور

میں نے یہ بات نوٹس کی ہے۔ شادی اس انسان سے نہیں کرنی چاہیے جس سے آپ محبت کرتے ہو۔ اس انسان سے کرنی چاہیے جس کے ساتھ انڈراستینڈنگ ہو کیونکہ محبت شادی کیلئے کافی نہیں ہوتی۔ ایک جیسی سوچ معنی رکھتی ہے۔ تم میری حقیقت نہیں جانتے اور میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی۔“

احد نے خالی مگ کو جھک کر میز پر دھری ٹرے میں رکھا۔ پھر ایک اور کمزور لمحہ سے بچنے کیلئے اس کی آنکھوں میں دیکھے بنا مخاطب ہوا۔

”حقیقت کیا ہے مجھے اس سے بھی فرق نہیں پڑتا یقیناً آپ کا ہر لفظ درست ہے یقیناً آپ نے بہت کچھ سہا ہوگا مگر میرے ساتھ شادی کرنے پر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں آپ کو بہت خوش رکھوں گا ٹرسٹ می اور ویسے بھی میں آپ کو چاہتا ہوں آپ تھوڑی نا مجھے چاہتی ہے۔“ اس کے جملے قائل کرنے والے نہیں تھے بلکہ اس کا شائستہ لہجہ اور پاز میٹو وائز تھیں جو اسے چاروں شانے چت کر رہی تھیں۔

”احد۔“ اس بار وہ اسے ٹوکنے کی جسارت کر گیا۔

”آپ مجھے اپنے سابقہ شوہر کے بارے میں بتا سکتی ہیں۔ وہ سب عادتیں جو آپ کو زچ کرتی تھیں۔ مجھ میں ہوئیں تو میں ٹھیک کر لوں گا اور اگر نہیں ہوئیں تو جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ آپ اچھے سے جانتی ہیں کہ میں کذابوں میں سے نہیں ہوں۔“ اس نے طویل سانس بھرا۔ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ یہ کئی عرصے کا تعلق بتا گیا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے اپنی بات منوائے بنا نہیں جائے گا۔ یہ نئی بات تھی۔ اور حیران کن تھی۔

”یہ سب ڈسکس کرنے میں آکر ڈلگتا ہے لیکن میں بتا دیتی ہوں کہ میرا شوہر بہت باتوئی تھا۔ اسے چوبیس گھنٹے باتیں کرنی ہوتی تھیں۔ اٹنے سیدھے سوالات کا اسے بہت شوق تھا۔

راتوں کو جاگنا پسند تھا۔ شاہ خرچ تھا۔ مذاق بہت کرتا تھا۔ ”سینس بیگم“ نوہ مجھے اس خطاب سے بلاتا تھا جس سے مجھے چڑھتی۔ ٹریولر تھا۔ بہت دنیا گھومتا تھا۔ مجال ہے جس ملک گیا ہو وہاں اس کی گرل فرینڈ زنہ بنی ہوں۔ دنیا کے ہر شہر ہر کونے میں اس کی گرل فرینڈز تھیں۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں دوست تھیں۔ اس کا فون ہر وقت بجتا رہتا تھا۔ دن رات کا کوئی تفرق ہی نہیں تھا اس کیلئے، بارز میں بہت جاتا تھا۔ خود کو زندہ دل اور مجھے بوڑھی روح کہتا تھا۔“ کہتے کہتے وہ پھکی مسکان کے ساتھ آنکھوں میں نمی لے آئی۔

”کھانے اور پہننے کا بھی بہت شوقین تھا۔ یہ جو تم مجھے کہتے ہونا کہ میرا ڈریسنگ سینس اچھا ہے اور میں بہت اچھی اچھی چیزیں بنا لیتی ہوں۔ یہ سب اسی کی عنایت ہیں۔ وہ مجھے کہتا تھا اس نے مجھے گروم کیا۔ وہ اچھا تھا اور ساتھ میں بہت زیادہ برا، کسی بھی لڑکی کو گھورتے ہوئے اسے فرق ہی نہیں پڑتا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ بس اپنی کرتا تھا اور اپنی ہی منواتا تھا۔ بڑی ڈومینینگ پر سنالٹی تھی اس کی۔ اور بھی بہت کچھ اور بہت اہم باتیں ہیں احد، جو میں تم سے نہیں کر سکتی اگر میں نے کیں تو کئی مہینوں تک ڈپریشن میں رہوں گی۔“ ایک آنسو چپکے سے اس کے گال پر پھسلا تھا جسے اس نے انگلیوں کے پوروں سے پونچھ دیا۔ احد جو خاموش سامع کی طرح اس سن رہا تھا اس عرصے میں پہلی بار بولا۔

”شکر، مجھے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے فقط اس کے کہ تھوڑا سا میں بھی شاہ خرچ ہوں۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنسی۔

”آئی اگری کہ یہ سب تم میں نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“ آس بھر سوال۔

”تو پھر یہ کہ پہلے رحمت آنٹی کو سب سچ بتاؤ پھر میں کچھ سوچوں گی۔“ یقین بھرا جواب۔

”سوچیں گی نہیں، فیصلہ کریں گی اور وہ میرے حق میں ہوگا۔“ مان بھری گزارش۔
 وہ ہنس دی۔ آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے صاف کیا۔ ”وعدہ نہیں کرتی کوشش ضرور کروں
 گی۔“ اعتماد بھری نوازش۔

اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ یہ سب آسان تھا۔ رحمت تک بات پہنچانا اور ان کی رائے جاننا تو
 یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ بھلے ان کے رشتے میں اعتماد تھا لیکن جھجک بھی تھی جس نے اسے جھوٹ
 کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اب جب وہ ان کی رائے جان گیا تھا تو قدرے ہلکا پھلکا
 ہو گیا تھا۔ مگر پہاڑ اب بھی تھا جو اسے سر کرنا تھا بہت جلد کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

من نفع فی اذن المحیۃ یاربی

تعویذۃ الانتظار الی تسعی تو قاتا

”پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا

افسون انتظار تمنا کہیں جسے۔“

چار افراد ایک ساتھ گھنے جنگل میں قطار بنا کر چل رہے تھے۔ دولڑکے اور دولڑکیاں، ان
 سے آگے قریباً دو فرلانگ بھر کے فاصلے پر فورسٹ ٹیم کے دو ممبر تھے۔ دونوں ہی مرد تھے جو ان
 چار افراد کو اس ڈائرکشن میں آگے لے جا رہے تھے جہاں جانوروں کا خطرہ نہیں تھا۔ جہاں
 کوئی بھی انسان آسانی سے جاسکتا تھا۔ جہاں تین لاشوں کی ایک ہی سمت تھی۔ اندازے کے
 مطابق وہ ایک جگہ آکر رکے۔

”اگر قاتل جنگل میں بسا ہے تو وہ یقیناً اسی علاقے میں کہیں ہوگا اور اگر اس نے قتل
 کر کے لاش کو پھینکنا ہے تو وہ یہیں کہیں پھینکے گا کیونکہ اس علاقے کے آگے جانوروں کا بہت

خطرہ ہے۔“ فورسٹ ٹیم کا ایک ممبر روانی سے انہیں اطلاع دے رہا تھا۔ ان سب نے اسی علاقے میں کمپ لگا لیے۔ کمال اور قیس فورسٹ ٹیم کے ساتھ مل کر یہ کام سرانجام دے رہے تھے جبکہ ظلم ہما اور شینزل ایک کونے میں کھڑے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ شینزل نے ماریہ کی رپلیسمنٹ میں ظل ہما کو ٹیم کا حصہ بنایا تھا۔ اس فیصلہ پر ماریہ کے علاوہ کسی نے احتجاج نہیں کیا تھا۔

”میم، کیا میں بھی نہیں آرہی ہوں؟“ نشاء نے اس سے سوال کیا تھا جس کا جواب اس نے بڑی سہولت کے ساتھ دیا۔

”قیس الہی کا کہنا ہے کہ تمہیں سعد کے ساتھ رہنا چاہیے۔ فورانسک سرگرمی ہمارے لیے بہت معنی رکھتی ہے۔“

پھر اس نے بنا کسی جواز کے ظل ہما کو ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ اس کے آرڈرز تیار کروائے تھے اور اب وہ ان کے ساتھ تھی۔

”ہمیں یہاں کیا کرنا ہوگا؟“ کچی مٹی کی گیلی خوشبو کو پھیپھڑوں میں اتارتے ہوئے وہ شینزل سے سوال کر رہی تھی جس نے شانے اچکاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”ویل، اس پورے علاقے کی چھان بین کرنی ہے اور یہاں کے ہر کونے پر کیمرے فکس کرنے ہیں اور اس پورے علاقے کو کور کرنا ہے تاکہ۔“ دفعتاً اس کی نگاہ قیس پر پڑی جس کے ہاتھ پر بے دھیانی سے کیل ٹھونکتے ہوئے ہتھوڑا لگ گیا تھا۔ وہ بڑے سارے کیل کو پاؤں سے سہارا دینے کے بعد ہاتھ کو بری طرح جھٹک رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں ہتھوڑا تھا اور چہرے پر درد کے تاثرات، قبل اس کے شینزل مزید کچھ کہتی ظل ہما لپک کر اس کی طرف گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں قیس کا ہاتھ تھا۔ اور وہ بے چینی سے قیس کے انگوٹھے کو ٹٹول رہی تھی جس کا گوشت

پھٹ کر اس میں سے خون رسنے لگا تھا۔ فورانسک ٹیم کے ایک ممبر نے اس کے انگوٹھے پر پٹی کر دی تھی۔ شیزل سانولے سے اس انسان کو دیکھے گئی جو پٹی بندھنے اور سمپتھی (ہمدردی) اکھٹی کرنے کے بعد پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔ اس نے چارکول رنگ کی جینز پہنی ہوئی تھی جسے فولڈ کر کے ٹخنوں سے اوپر کیا گیا تھا۔ فورسٹ گرین کلر کی جیکٹ تھی جس کے نیچے اس نے ہم رنگ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ”بروک گھوسٹ“ میں پاؤں قید تھے۔ آنکھوں پر سبز شیڈز لگائے ہوئے تھے اور جیکٹ کے بازو کہنیوں تک چڑھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ کی نسبت آج نارمل سے حلیے میں تھا۔ کیمپ کو لگانے کے بعد وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر پانی پی رہا تھا۔ ظل ہما کو بوتل پکڑانے کے بعد وہ اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اسی دوران اس کی نگاہ شیزل پر پڑی تھی جو جانے انجانے اس کا موازنہ احد کے ساتھ کر رہی تھی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک شائستہ مزاج، دھیمی طبیعت کا خوش اخلاق خوش گفتار انسان تھا۔ جس کی آنکھوں میں سحر بسا تھا۔ جس کی طبیعت دل موہ لینے والی تھی اور شخصیت دل جکڑ لینے والی۔ تو دوسرا کچھ بھی نہیں تھا۔ بلنٹ، فلرٹی، غصے کا تیز اور معمولی شکل و صورت کا حامل، انتہائی درجے کا کھاؤ انسان۔ یہ اس کا ڈریسنگ سینس، اس کا ایٹی ٹیوڈ، اس کا پیسہ اور اس کی آواز میں موجود مقناطیسیت تھی جو لوگوں کو اس کی جانب کھینچتی تھی۔ وہ جس کے سامنے سے بھی گزرتا تھا وہ اسے مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ جب بولتا تھا تو لوگ حیرت میں مبتلا ہو جاتے تھے کیونکہ اس کی آواز، آواز نہیں ساز تھی۔ بھاری، گھمبیر جو زیادہ تر شوخیوں میں گھل جاتی تھی۔ ورنہ تو اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔

”کیا ہو جاتا اگر یہ بھی احد کی طرح ہوتا۔“ اس کے دماغ کے کسی گوشے میں ایک سوچ ابھری تھی۔

دو دن ان لوگوں نے اچھے سے اس علاقے کا راؤنڈ لیا تھا۔ ہر تنکا، ہر ذرہ چھان مارا تھا لیکن انہیں کہیں بھی وہاں کسی انسان کا وجود نہیں ملا تھا۔ یا اس کے وہاں رہائش کے شواہد نہیں ملے تھے۔ آج ان کی اس علاقے میں آخری رات تھی۔ صبح ہوتے ہی انہیں واپس چلے جانا تھا۔ وہ وہاں ہر اس جگہ کیمرہ لگا چکے تھے جہاں انہیں شک تھا کہ اب قاتل اس جگہ پر آ سکتا ہے۔ انہوں نے کوئی اینگل نہیں چھوڑا تھا۔ فرانک کیلئے جتنی بھی چیزیں انہیں ملی تھیں۔ وہ ان سب کو محفوظ جگہ پر رکھ چکے تھے۔ اور اب کچھ دیر سستا رہے تھے۔ فورسٹ ٹیم کا ایک ممبر اس پورے عرصے میں شینزل سے بہت متاثر رہا تھا۔ اب بھی وہ اس کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ سردی کی شدت کی وجہ سے وہ سب لکڑیاں جلائے اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ قیس کی نظروں کے سامنے وہ دونوں تھے اور اسے یہ منظر بالکل بھی نہیں بھارہا تھا تبھی وہ چائے لینے کے بہانے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسٹیل کی کیتلی میں سے چائے کے دو کپ بھرے اور شینزل کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

”برادر، تھوڑی سی جگہ چاہیے۔“ فورسٹ ٹیم کا ممبر خوش اخلاقی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ شینزل نے اس کے ہاتھ سے چائے تھام کر اپنے قریب قدموں میں رکھ دی۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ اس کی دی ہوئی چائے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔

”زہر نہیں ہے اس میں۔“ شینزل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”سچ میں۔“ وہ اسے یقین دہانی کروا رہا تھا جسے اس نے یکسر انور کر دیا۔

”یعنی میں کلام کروں تو چپ اور کوئی مخاطب کرے تو ہزاروں الفاظ وہ بھی مسکراہٹ کے ساتھ واؤ۔“ اس نے اپنی چائے بھی قدموں میں رکھ دی۔ وہ جانتی تھی وہ پچھلے تین دن سے بیمار ہے۔ اسے زکام تھا جو بعد از بخار میں بدل گیا لیکن یہ بخار کس شدت کا تھا یہ بہر حال ان

میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ سب اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھتے تھے اور پھر اس کے تسلی دلانے پر چپ ہو جاتے تھے۔ ظل ہمانے اسے پٹی چھینچ کروانے کا کہا تھا۔ وہ وہاں انہیں دیکھ کر ہی آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ فورسٹ ٹیم کا وہ ممبر جس نے اس کی پٹی بدلی تھی اس کا ہاتھ پکڑتے ہی بدک گیا۔

”یا خدا، تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ پھر وہ اس کا ماتھا چھو رہا تھا ساتھ ہی گردن پر بھی انگلیاں رکھیں۔ ”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”تم اچھے خاصے بیمار ہو۔“ شیزل نے ایک سرسری نگاہ اپنے بائیں جانب بیٹھے انسان پر ڈالی جو اس کی اور ظل ہما کی بات کو رد کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس ایک انسان کیلئے پریشان ہو چکے تھے۔

”ارے کچھ نہیں ہوا مجھے، ہلکا سا ٹمپر پچر ہے بس، وہ بھی اس لیے کیونکہ مجھے ڈسٹ الرجی ہے۔“ اپنے پھولے ہوئے ہاتھ کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے سرسری سے لہجے میں کہا تھا۔ بیمار ہونا گویا اس کی شان میں گستاخی تھی۔

”نہیں یا تم واقعی بیمار ہو اور۔“ اس نے جونہی پٹی کھولی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ”لا حول واللہ، تمہارا تو زخم بھی خراب ہو گیا ہے۔ قیس تم انسان ہو؟“ شیزل نے اب کی بار باقاعدہ گردن موڑ کر اس کے انگوٹھے کو دیکھا جس کا گوشت بری طرح سے ادھڑا ہوا تھا۔ وہ اب سبز ہو رہا تھا۔ شیزل انگوٹھے کی سوجن اور رنگ دیکھ کر جان گئی کہ وہاں فریکچر ہوا ہے۔ اس کے دل کو پہلی بار کچھ ہوا تھا۔ جیسا بھی تھا۔ جو بھی تھا۔ جو بھی اس سے سرزد ہوا تھا۔ چاہے لاکھ عداوت، لاکھ قطع تعلق سہی وہ کبھی اس کا اپنا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا رشتہ رہ چکا تھا بہت گہرا رشتہ، وہ یکدم وہاں سے اٹھ کر گئی تھی۔ اگر نہ جاتی تو اس کے دل کی کیفیت فوراً اس انسان

تک پہنچ جاتی۔ اور فی الحال وہ اس طرح کی کوئی بھی بات افورڈ نہیں کر سکتی تھی خاص کر تب جب وہ اپنی شادی پلان کر رہی تھی۔ پورے آدھے گھنٹے بعد اسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے درخت پر بیٹھی تھی۔ جانتی تھی اس کے پیچھے وہی آکر کھڑا ہوا ہے۔ اور وہ ٹھیک تھی اس کے برابر بیٹھنے والا بھی وہی تھا۔ اڑتی ہوئی بھاپ کا کپ اس کے چہرے کے قریب آیا تھا۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ شیزل کی خاموش نظریں اس کے چہرے کو ٹوٹتی رہیں۔ خشک ہونٹ، ستا ہوا چہرہ اور سرخ ناک۔

”تم جانتے تھے تمہیں فریکچر ہوا ہے پھر بتایا کیوں نہیں۔“ اس کا دکھ اس کے دل میں ہی تھا لبوں تک نہیں آیا تھا۔ خشک الفاظ بالکل جذبات سے عاری تھے۔

”میں نے سوچا مرد ہوں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ شیزل نے چائے کا مگ تھام لیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے گہرا گھنا، تاریک جنگل تھا۔ ان کی عقب میں بھی ویسا ہی جنگل تھا۔ بس تھوڑی سی دورائیں ہاتھ پر مڑ کر ان کے کیمپس آتے تھے۔

”بیماری مرد یا عورت کو نہیں ہوتی۔ بیماری انسان کو ہوتی ہے اور وہ انسان پر ہی اثر انداز ہوتی ہے چاہے وہ طرم خان ہی کیوں نہ ہو۔“ قیس نے دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد کپ کو درخت کی کھر دری سطح پر رکھ دیا۔ اسے کوئی بھی ذائقہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”متفق ہوں آپ سے۔“ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”تم کبھی انکار کرتے ہو۔“ اس کی بڑبڑاہٹ کافی اونچی تھی۔ چہرے پر خفگی کے اثرات تھے۔ وہ مسکرا دیا۔

”یعنی میں سمجھوں آپ کو میری فکر ہو رہی ہے۔“ آواز میں شوخی ایک بار پھر سے گھل گئی۔

شینزل نے ابرو چڑھا کر دیکھا۔

”خوش فہمیوں کے سمندر سے نکل آؤ۔“ اسی وقت اسے چھینک آئی تھی۔ وہ دوسری جانب منہ کر کے چھینکنے کے بعد ناک رگڑتے ہوئے شینزل کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ متورم ہو چکی تھیں۔ ناک بھی اچھی خاصی سرخ تھی۔ اسے مٹی راس نہیں تھی۔ کبھی بھی نہیں تھی۔ حسب عادت جواب نہیں آیا۔

چند ثانیے گھور خاموشی رہی پھر اس کی بھاری سرگوشی خاموشی میں گونج اٹھی۔

”شینزل۔“ وہ اس پکار پر کانپ گئی تھی۔ وہ اس کی بات پر کانپ گئی تھی۔ ”ایم سوری۔“ توقف۔ ”بہت یاد آتی ہے آپ کی، پلیز لوٹ آؤ۔“ وہ ششدر انداز میں اسے دیکھنے لگی تھی۔ ایک لمحہ کو اسے لگا قیس کی آنکھوں میں نمی چھلکی ہے پھر اگلی ہی لمحہ وہ اس کے نظریں چرانے پر اٹھ کر جانے لگی تھی لیکن بری طرح ٹھٹھک کر رک گئی کیونکہ اس کا ہاتھ قیس کے ہاتھ میں قید ہو چکا تھا۔

”ہاتھ چھوڑو تمہیں درد ہو رہا ہوگا۔“ وہ اس کے آدھے ہاتھ کو پھولا ہوا دیکھ کر گویا ہوئی۔ ”اگر اتنی ہی پرواہ ہے تو بیٹھ جاؤ کچھ دیر۔“ وہ جانتی تھی وہ ہٹ دھرم ہے۔ اپنی ضد منوانا اس کا پسندیدہ کام ہے۔ اس لیے مجبوراً تمام ناپسندیدگی کو بالائے طاق رکھ کر وہ بیٹھ گئی تھی۔ ”تم نہیں بد لے، آج بھی ویسے ہی ہو۔“ اس نے شینزل کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں قید کر لیا خاموشی سے سیدھا ہو کر وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ قیس کے سینے پر تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپر قیس کے دونوں ہاتھ تھے۔ یہ جیسے ایک بند تھا جو وہ اس کے گرد باندھ چکا تھا۔ تاکہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔

”میرا بھی آپ کے بارے میں یہی خیال ہے۔“ وہ آنکھیں بند کر کے گویا ہوا۔ اس کے

ہاتھ جل رہے تھے شیزل جان گئی وہ اچھا خاصا بیمار ہونے والا ہے۔ وہ سال میں ایک بار بیمار ہوتا تھا بری طرح ہوتا تھا۔ اسے فکر لاحق ہوئی۔ وہ تشویش سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو اچھا خاصا ستا ہوا تھا۔

”فلرٹ تم میں سے گیا نہیں کسی لڑکی کو نہیں چھوڑتے تم۔“ وہ آنکھیں بند کیے ہی ہنس دیا۔
 ”آپ نے مجھے نوٹ کیا، یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔“ اب ہنسنے کی باری شیزل کی تھی۔ بہت عرصے کے بعد ان کے درمیان بات ہو رہی تھی بہت عرصے کے بعد وہ اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

”حالانکہ تمہیں شرمندگی سے ڈوب مر جانا چاہیے۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔
 ”شرمندگی سے مروں نہ مروں آپ کے جملوں سے ضرور مر جاؤں گا۔“ وہ خاموش رہی، ایک منٹ، دو منٹ، دس منٹ، قیس نے آنکھیں کھولیں اس کی آنکھوں میں سرخ دھاگے بہت زیادہ تھے۔ یہ نشاندہی تھی اس بات کی کہ وہ نیند میں جا رہا تھا۔ اس نے شیزل کو خود کو تکتے پایا پھر اس کے لب ہلتے دیکھے جو کہہ رہے تھے۔

”اس کیس کے بعد تم میرے ارد گرد نظر نہیں آنا۔ اسے تم میری ریکوئسٹ سمجھ لو۔“ قیس نے اپنے دکھتے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو مٹھی میں بھرا۔
 ”میرے بنارہ لوگی۔“ اس کا دل ڈوب کرا بھرا۔

”رہ رہی ہوں۔“ پھر وہ گہرائی میں گر گیا اتنی گہرائی میں کہ پھر وہ اسے کہیں نہیں ملا کہیں بھی نہیں۔

”میں آنکھیں بند کر رہا ہوں سو جاؤں تو چلی جانا۔“ وہ جانتا تھا وہ چلی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اسے چھوڑ دیتی تھی لیکن اس رات وہ اسے چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ صبح کا نور پھیلنے سے کچھ دیر پہلے

شینزل نے اس کا سر انتہائی آرام سے اپنی گود سے ہٹا دیا تھا۔ وہ جب سوکراٹھا تھا تو اس کے سر کے نیچے شینزل کی جیکٹ تھی۔ وہ نہیں تھی۔ اس نے بھاری پوٹے کھول کر اپنے وجود کے ہونے کا یقین کیا۔ آنکھوں کے سامنے فلک شگاف درخت تھے جن میں سے سورج کی کرنیں بہت دقت کے ساتھ نکل رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس بھرا، حلق میں کانٹے محسوس ہوئے اور منہ میں چچپاہٹ۔ وہ گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

”آئی ہیٹ بیماری۔“ بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی کمر کودائیں بائیں جانب کیا اور ہاتھوں کو دو تین بار پھیلا کر اکٹھا کیا جیسا وہ جم میں مشین کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اس کے سر کے نیچے شینزل کی جیکٹ تھی۔ اس جیکٹ کو اٹھاتے ہوئے وہ بڑبڑایا تھا۔

”بہت بڑی زحمت کر دی مادام نے۔“ وہ جب وہاں سے اٹھ کر کیمرے کی جانب آیا تو سب جانے کو تیار تھے۔ کیمرے کھول کر پیک کر دیے گئے تھے۔ سارا سامان سمیٹ لیا گیا تھا۔ سب کے شانوں پر ان کے بیگز موجود تھے۔ ظل ہما اس کا بیگ اپنے قدموں میں رکھے کھڑی تھی۔

”کہاں تھے تم، سب کب سے انتظار کر رہے ہیں۔“ قیس نے گردن کی پشت کو رگڑتے ہوئے اچھلتی نگاہ اپنی ٹیم پر ڈالی۔ شینزل ایک بار پھر فورسٹ ٹیم کے ممبر سے باتیں کرتی ہوئی نظر آئی۔

”چلتے ہیں۔“ اس نے جھک کر اپنا بیگ اٹھایا اسے شانوں پر ڈالنے کے بعد وہ وقت دیکھ رہا تھا۔ ”ساڑھے سات بج گئے؟ واقعی کافی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ اپنا بیگ پہنے کسی کا بھی انتظار کیے بنا چل دیا تھا۔ سب حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”انہیں کیا ہوا؟“ یہ کمال تھا جو کہہ رہا تھا۔



سرخ آسمان کے نیچے ایک چھوٹے سے دروازے کے باہر ایک پندرہ سولہ سال کے قریب کا لڑکا کھڑا تھا۔ جوانی اس پر خاصے اچھے طریقے سے چڑھی تھی۔ وہ دراز قد اور ہینڈ سم تھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک بہت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چہرہ تھا کہ نظر نہ ہٹانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ خوش اخلاق، خوش گفتار، قمیض شلوار اور واسکٹ میں موجود، سیٹھ صاحب۔

اس نے ایک بار پھر لکڑی کے دروازے کو بجایا۔ اس بار اس کی دستک کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس بار دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ مسکرایا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ اپنی بڑی بہن کو دیکھ رہا تھا جو اس سے چھوٹی دکھتی تھی۔ سادی سی شلوار قمیض پہنے دوپٹے کو شانے پر پھیلائے وہ اس سے دست سوال تھی جو بنا اجازت اندر آ گیا تھا۔

”اپنی بہن سے ملنے آیا ہوں، کوئی قباحت ہے کیا؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بہت سارے تھیلے صحن میں بچھے تخت پر رکھ دیے۔ خود وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ نین نے دروازہ بند کیا اور پھر مڑ کر اسے دیکھنے لگی جو اپنی جیب میں سے فون نکال کر اس میں مصروف ہو چکا تھا۔

”روز نہیں آیا کرو تم، صاحب جی کو پتا چلے گا تو بہت خفا۔“ اس نے نین کے بات بھاری انداز میں قطع کی۔

”بابا۔“ پھر اس نے فون سے نظریں ہٹائیں۔ ”بابا ہیں وہ ہم دونوں کے۔“ نین کا دل بھرا لیکن اس نے آنکھیں نہیں بھرنے دیں۔

”آج سے قریباً سات سال پہلے میں اپنے سب رشتے کھو چکی ہوں۔ میری ماں کے مرنے کے بعد میرا کوئی اپنا نہیں رہا اس دنیا میں سوائے تمہارے۔“

اس نے اپنا فون تخت پر رکھا پھر اس کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کا چھوٹا بھائی لمبائی

چوڑائی میں اس سے کافی بڑا ہو چکا تھا۔

”پتا ہے نین، تم بہت غلط کر رہی ہو اپنے ساتھ، تم نے چھوٹی سی عمر میں گھر چھوڑ دیا۔ پھر ضد کر کے حلیمہ ماما کی دوست کے گھر رہنے لگیں۔ حالانکہ میں تمہاری اس حرکت کے بعد کتنا بیمار ہوا تھا۔ تمہیں پھر بھی مجھ پر ترس نہیں آیا۔ تم نے مجھے اور اس کے بعد سب رشتے چھوڑ دیے۔ تمہیں احساس ہے بابا اس بات سے کتنے ہرٹ ہوتے ہیں۔ وہ تمہیں کتنا یاد کرتے ہیں۔“ نین نے اپنے لب کاٹے۔ حلیمہ آنٹی کی دوست دستک کی آواز سے پہچان گئیں تھی کہ کون آیا ہے۔ اس لیے وہ کھانے کے لوازمات سے بھری ٹرے درخت کے نیچے بچھے تخت پر رکھ کر چلی گئی تھیں۔

”کچھ اور بات کرو، میں آج اداس نہیں ہونا چاہتی۔“ وہ تخت پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا بھائی بھی وہیں اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے کوئی اور بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے ایک کوکی اٹھا کر منہ میں ڈالی پھر کچھ سوچ کر بات کا آغاز کیا۔

”تم اچھے کالجز اور سکولز میں بابا کے اصرار کے باوجود نہیں پڑھی کہ تمہیں ان کا احسان نہیں لینا تھا۔ تم باہر ملک بھی اپنی اسٹڈیز کیلئے نہیں گئیں اب جبکہ تم یہاں پر واجبی سی یونیورسٹی سے پڑھ رہی ہو تو بابا نے سوچا ہے وہ ان کے دوست کے بیٹے سے تمہاری منگنی کر دیں۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ تمہاری شادی کر دیں گے۔“

نین نے خاموشی سے اس کی بات سنی پھر جب وہ ایک کوکی کھانے کے بعد کافی کا گھونٹ بھر چکا تھا۔ نین نے خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔ وہ، وہ سب کہہ رہی تھی جس پر سیٹھ صاحب یقین نہیں کر سکتا تھا بالکل بھی نہیں۔

”میں ان کی بات مان لیتی اگر میں کسی کو پسند نہ کرتی ہوتی تو۔“ سفید قمیض شلواری میں موجود لڑکے کو لگا اسے سننے میں دشواری ہوئی ہے۔ تبھی اس نے تصدیق کی۔

”کیا؟ کیا کہا۔“ نین نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے لیکن کچھ رد و بدل کے ساتھ۔

”میں۔“ وہ رکی پھر گہرا سانس بھر کر اعتراف کرنے لگی۔ ”میں کسی کو پسند کرتی ہوں اور بہت جلد ہم لوگ شادی کر لیں گے۔“ اس نے آہستہ سے پلکیں اٹھا کر اپنے بھائی کو دیکھا جس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ چکا تھا۔ وہ نو عمر دکھتی اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا۔ جو محبت کے اظہار کے بعد اسے اطلاع دے رہی تھی کہ وہ شادی کرنے والی ہے۔ وہی بہن جس سے وہ آج تک ایک ایک بات کرتا آیا تھا۔ اپنی اب تک کی زندگی کا ہر فیصلہ اس کی رائے کے مطابق کرتا تھا۔ اپنی زندگی کا ہر فنکشن، ہر خوشی، ہر کامیابی پر اس نے اسے فوقیت دی تھی اور اب وہ اسے بتا رہی ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کرنے والی ہے۔ حیرت ہے۔ اگر اسے اس سے محبت نہ ہوتی اگر اس کے دل میں اس کیلئے تھوڑا سا بھی احترام کم ہوتا تو وہ اسے دھتکار کر، اس سے خفا ہو کر چلا جاتا۔ مگر وہ مجبور تھا بہت زیادہ مجبور۔

”تم شادی کر لو گی۔“ اس کا جبرِ اضطراب کے سبب بھیج چکا تھا۔ ”اور کس کی اجازت سے؟“ انگاروں میں بجھی آواز، غصے کی زیادتی سے سرخ ہوتے کان۔

”تمہاری۔“ وہ ضبط کی انتہا پر پہنچ کر اس کی بات سنتے ہی یکدم ہنسا چہرہ تاہنوز لٹھے کی مانند تھا۔ ”تم کرواؤ گے میری شادی کیونکہ میرے بڑے تم ہو۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی بہن کو جھڑکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس سے ناراض ہوا تھا۔

”تم مجھے کہہ رہی ہو تم کسی کو پسند کرتی ہو جبکہ میں اس بات سے لاعلم ہوں پھر بھی تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری شادی اس سے کروادوں۔ کیا میں نہیں جانتا تم یہ سب بابا کی وجہ سے کر رہی ہو تاکہ وہ تمہاری زندگی کا آخری فیصلہ بھی نہ کر سکیں۔ تم اتنی کم ظرف نکلو گی نین سوچا نہیں تھا میں نے۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا۔ پیاناہ چھلک گیا۔ وہ ناراض ہو گیا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تھا جب نین اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔

”ایسے نہیں جاؤ، ناراض ہو کر نہیں جاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام چکی تھی جسے اس کے بھائی نے جھٹکے سے چھڑوایا تھا۔

”آئی سیڈ جسٹ شٹ۔“ انگلی اٹھا کر وہ دبی غراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ نین کی آنکھیں اشک بار ہوئیں۔

”مجھے لگا تھا تم مجھے سمجھو گے لیکن میں یہ بھول گئی تھی کہ تم جہانگیر بخاری کے بیٹے ہو۔“ اس نے نین کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا۔ سرخ آسمان ہوا کے بگولے کو بڑی تیزی کے ساتھ، ساتھ لایا تھا۔ درخت کے پتے ہوا کی شدت سے جھڑ کر پورے صحن میں پھیل گئے۔ کافی کے بھرے ہوئے کپوں میں بھی پتے گر چکے تھے۔

”اگر تمہیں لگتا کہ میں صرف جہانگیر بخاری کا بیٹا ہوں تمہارا کچھ نہیں ہوں تو افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“

وہ وہاں سے ناراض ہو کر گیا تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اس کی ناراضی نین کی عدالت بنے گی اس بات کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کے بھائی نے نتائج و عواقب کا انتظار کیے بغیر سب کچھ من و عن اپنے باپ کو بتا دیا تھا۔ جن کے سامنے اسے دو دن بعد ہی لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ملک کے نامی گرامی سیاست دان کے سامنے آج اس کی جان سے عزیز بیٹی کھڑی تھی۔ وہ

سفید دراز صوفے پر بیٹھے تھے جس کی بیک پر گولڈ پلیٹڈ تاج بنا ہوا تھا۔ چہرے پر جھریاں، سر پر گرے بال اور کڑکڑاتے سفید سوٹ میں بیٹھا وہ انسان خاموش نگاہوں سے اپنی بیٹی کو تنگے جا رہا تھا جو ان کے عین سامنے کھڑی تھی جبکہ وہاں سے تھوڑی سی دور اسی طرح کے سفید صوفے پر اس کا بھائی بیٹھا تھا۔ جس نے آج رائیل بلیورنگ کا ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر شرٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

”سیٹھ صاحب نے بتایا کہ آپ کسی کو پسند کرتی ہیں۔“ کچھ دیر خاموشی رہی پھر جواب ابھرا جس پر اس کا بھائی آنکھیں میچ کر رہ گیا۔

”جی، اس کی کزن میری کلاس فیلو ہے۔“ جہانگیر نے نین کے عقب میں سے اپنے بیٹے کو دیکھا جو دونوں ہاتھ کے مٹھیوں پر ہونٹ ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کی کہنیاں اس کے گھٹنوں پر دھری تھیں۔

”نام کیا ہے اس کا؟“ اس نے نام بتایا جس پر اس کے بھائی کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ وہ یکدم سیدھا ہوا۔

”کب سے جانتے ہو آپ لوگ ایک دوسرے کو۔“ نین نے نظریں جھکائے تھوک لگلا۔ اپنے بھائی کو یہ سب بتانا آسان تھا لیکن باپ کے سامنے اعتراف اور اس طرح کے سوالات کے جوابات دینا بہت، بہت مشکل۔

”دو سال سے۔“ اب کے ایک ملا متی نظر سیٹھ صاحب پر جہانگیر نے ڈالی تھی۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

”یہ تربیت کی ہے آپ نے اپنی بہن کی، یہ انڈراستینڈنگ ہے آپ کی اپنی بہن کے ساتھ کہ دو سال سے آپ کی آنکھوں کو بند رکھا گیا ہے۔ دو سال سے آپ انجان رہے ہیں۔“

یہ ان نظروں کا مفہوم تھا جو جہانگیر نے اپنے سپوت پر ڈالی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گڑھا کھودے اور اس میں جا گرے۔ وہ اس کے ہر عمل پر نظر رکھتا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ گھنٹوں اس کی سنتا اور اپنی سناتا تھا۔ صحیح غلط کی تمیز بتاتا تھا۔ زمانے کے غلط چلن سے آگاہ کرتا تھا۔ بھیڑیوں کی پہچان بتاتا تھا۔ خود کو کیسے محفوظ رکھنا ہے سکھاتا تھا۔ وہ اس سے چھوٹا تھا مگر اس کا بڑا بن گیا تھا۔ وہ فقط اس کا بھائی نہیں اس کی ماں اور باپ دونوں تھا۔ دکھ یہی تھا۔ غم یہی تھا۔

”نام، فون نمبر معہ گھر کا پتا چٹ پر لکھ دیں۔ اگر وہ آپ کے قابل ہوا تو ہم میں سے کوئی بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں کرے گا لیکن اگر وہ ہمارے معیار پر نہیں اترتا تو میرے دوست نے جو رشتہ ہمیں سچسٹ کیا ہے ہم لوگ وہاں آپ کی شادی کر دیں گے اور یہ آخری فیصلہ ہے۔“ وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔ اپنے ساتھ ساتھ وہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کر گئے تھے۔ وہ جس وقت اندر نام، پتا اور فون نمبر لکھ رہی تھی اس وقت جہانگیر پشت پر ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔ ان کے ہم قدم ان کا بیٹا تھا۔

”جو نام اور ولدیت آپ کی بہن نے بتائی ہے اس سے آپ واقف ہیں نا؟“ ان کے بیٹے نے گردن باپ کی جانب موڑی۔

”یہی سوال میں بھی آپ سے کرتا ہوں۔“ وہ جانتا تھا اس کا باپ بڑا گھاک آدمی ہے۔ کون کیا ہے یہ وہ بہت اچھے سے جانتے تھے۔

”لڑکا ٹھیک ہے بس نظر باز ہے۔“

ان کا بیٹا ہنسا گردن کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے گویا ہوا۔

”نظر باز انسان کبھی بھی ”ٹھیک“ نہیں ہوا کرتے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں جس کی آنکھ

میں حیا نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔“ جہانگیر مسکرائے تھے۔ ان کی مسکراہٹ میں اپنے بیٹے کیلئے احترام تھا۔

”اس لڑکے کا باپ انتہائی درجے کا کرپٹ انسان ہے۔ بیٹا باپ سے دو نمبری نہ سیکھے ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ آگے لمبی راہداری تھی جس کے آخری سرے پر لان آتا تھا۔ ستونوں سے بنی وہ راہداری باپ بیٹے کے کئی رازوں سے واقف تھی۔ زندگی کا ہر چھوٹا بڑا فیصلہ و مسئلہ اسی راہداری میں چہل قدمی کے دوران حل ہوا تھا خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے بیٹے کی رائے ان کیلئے باعث عزت تھی اور باعث منافع بھی۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی نین۔“

جہانگیر نے اپنے بیٹے کی بات درمیان میں قطع کی۔ ”نہیں، ہم اس بات پر ابہام اور مفروضوں کا سہارا نہیں لے سکتے اگر کوئی اور ہوتا تو نظر ثانی کی جاسکتی تھی مگر یہ، اس پر تو بالکل بھی نہیں۔“

ان کے بیٹے نے لبوں کو سختی سے دانتوں میں جکڑا۔ وہ پریشان ہو گیا تھا بہت زیادہ پریشان۔

”بھائی کی طرح نہیں بلکہ ایک باپ بن کر سوچو، کیا تم اپنی بیٹی کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر دو گے جو منافق، جھوٹا اور کردار کا ہلکا ہو۔“ وہ اب کھل کر اس انسان کے بارے میں بتا رہے تھے۔ گویا وہ اسے واقعی میں اچھے سے جانتے تھے۔ ان کے بیٹے نے کرب سے آنکھیں میچ لیں تھیں۔ وہ ایک باپ بن کر ہی سوچ رہا تھا جسے اولاد کے درد کی فکر ہوتی ہے۔

”اسے بہت تکلیف ہوگی۔“

جہانگیر کے بدن میں ٹیس سی اٹھی۔ اپنے بیٹے کو نرم نگاہوں سے دیکھا۔
”آپ اسے سمجھانا۔“

اس کے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے۔ ”وہ نہیں مانی تو؟“

جہانگیر نے خلاء میں گھورا جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہے ہوں لیکن اس پر عمل درآمد پر ہچکچا بھی رہے ہوں۔ پھر وہ گہرا سانس بھر گئے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا جو انہیں ہی تک رہا تھا۔ نظروں کا مفہوم سمجھ کر وہ سہم گیا۔

☆.....☆.....☆

افق آج گد لے بادلوں سے ڈھکا تھا۔ گرے موسم نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ روئی کے گالے نہیں گر رہے تھے۔ ہاں مگر خشکی کی انتہا تھا۔ جو بھی گھر سے باہر جاتا چہرے اور کپڑوں پر نمی کی تہ لے کر آتا۔ دن چھوٹے تھے اور راتیں طویل۔ سورج پڑا مردہ تھا اور چاند کبھی کبھی ندارد۔

”تم نے بتایا نہیں پھر۔“ رات کی گہری تاریکی میں یہ سوال ابھرا تھا۔

”کس بارے میں؟“ سوال پر سوال کیا گیا۔

”تمہارے فریکچر کے بارے میں۔“ لبوں پر مسکان آئی، گہری رازدارانہ مسکان۔

”کچھ زخم بے زباں ہی رہیں تو بہتر ہے۔“ پیلی جلد والی نے فکر مندی سے آنکھیں

پٹپٹائیں۔

”لیکن مجھے وجہ جانتی ہے۔ تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی۔“ وہ کھسک کر اس کے قریب آ کر

بیٹھی۔ اس کا پھولا ہوا ہاتھ پیلی جلد والی کے نحیف ہاتھ میں قید ہو چکا تھا۔

”ہاں تکلیف تو ہو رہی ہے لیکن یہ باقی تکلیفوں کے آگے بالکل صفر ہے۔“ پیلی جلد والی

نے اپنی نازک انگلیاں اس کے ماتھے پر رکھیں جو بخار کی حدت سے تپ رہا تھا۔

”تمہیں تو بہت تیز بخار بھی ہے۔ تم تو بہت بیمار ہو۔“ وہ ہنس دیا پھر نرمی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نظریں چمکتے ہوئے فانوس پر تھیں اور پاؤں صوفے کے ہتھے سے باہر جا چکے تھے کیونکہ وہ صوفے کے وسط میں بیٹھے تھے۔

”تمہیں پتا ہے رتبہ، تم میری زندگی میں خدا کی طرف سے بہت بڑا انعام ہو۔ شاید میں نے کبھی کوئی اچھا کام کیا ہوگا جس کے عوض مجھے تم عطا ہوئی ہو۔ سچ میں تم میری بہت بڑی ڈھال ہو۔“ وہ اسے سراہ رہا تھا۔ اسے پچکار رہا تھا۔ اسے ٹال رہا تھا۔ وہ جان گئی۔

”بہت برے ہو تم، خود کو بہت زخم دیتے ہو۔“ وہ جیسے برا مان گئی تھی۔ لڑکے کے لبوں پر مبہم سی مسکان آن جمی۔

”اندرونی طور پر تو ہاں، میرا دل، روح واقعی بہت زخمی ہے۔ آپ کوئی علاج بتا دیں۔“ رتبہ نے اس کے شانے پر تھپڑ رسید کیا جو روئی کے پھا ہے جتنا معلوم ہوا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ سنجیدہ ہوں۔“ پھر اس نے کچھ سوچا اور کہا۔ ”بند کر دیتے ہیں یہ سب، ختم کر دیتے ہیں قصہ کو۔“ اس نے دیکھا اس کے بھائی کی آنکھوں میں سختی آئی ہے۔ آنکھوں ہی کیوں اس کا پورا منہ سختی کے ماسک سے ڈھک گیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو، ختم کر دیتے ہیں سب، قصہ ختم ہوگا تو سب خود بخود ختم ہو جائے گا۔“ وہ اس کی آواز کی پراسراریت سے زیادہ اس کی آنکھوں میں چھلکتے جنون سے گھبرائی تھی۔ جھٹ سے زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں، تم اسے کچھ نہیں کرو گے۔“ اس نے فانوس سے نگاہ ہٹا کر آئی بالز کی حرکت اپنی بہن کے چہرے کی طرف کی جس کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کا بھائی ”اس“ کے پیچھے

بے تحاشہ پاگل ہے وہ جانتی تھی۔ اس کا بھائی ”اس“ کی خاطر اپنی ”چاہت“ کو مار دے یہ وہ بالکل بھی نہیں چاہتی تھی۔ ہرگز نہیں۔

”وہ میرے ارادے ہرگز رتے دن کے ساتھ کمزور کر رہی ہے۔ وہ نہیں رہے گی تو سب آسان ہو جائے گا۔ سب مکمل ہو جائے گا۔“ رتبہ نے اپنے گھٹنے اس کے سر کے نیچے سے کھینچے تھے۔ پھر وہ کھڑی ہوئی اور اینارٹل انداز میں ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے گویا ہوئی۔ ☆
”نہیں، نہیں تم ایسا۔۔ ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“ وہ سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف آن سما یا تھا۔

”میرے دل کو مزید کمزور مت کر رتبہ۔“ اس نے گردن موڑ کر اپنی بہن کو دیکھا۔ اس کی حالت پر وہ دھک سے رہ گیا۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھا۔

”جھٹک دو اپنا ارادہ، پلیز جھٹک دو نا۔“ اس نے جلدی سے اپنی پشت کو صوفے کے سہارے سے آزاد کروایا پھر فوراً کھڑے ہوتے ہوئے اپنی بہن کو خود کے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے خاموش کروا رہا تھا۔

”ششششش، بس۔“ توقف۔“ ختم ہو گئی بحث، پرسکون ہو جاؤ۔“ رتبہ نے اس کا کالر تھام لیا۔ اس کی ہاتھوں کی کپکپاہٹ اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ بتا رہی تھی۔

”تم اسے کچھ نہیں کرو گے۔“ اسے اپنی بہن پر ٹوٹ کر پیار آیا اور خود پر بے تحاشہ ترس۔
”میں اسے ابھی کچھ نہیں کروں گا۔“ وہ اسے بہلا رہا تھا۔ وہ بہل گئی تھی۔

”پکا وعدہ؟“ لرزتی آواز میں پوچھا۔ وہ بجھے دل سے مسکرا دیا۔
”کے والا۔“ رتبہ کی سختی سے پیچی آنکھوں میں جتنا اندھیرا تھا اتنا ہی اندھیرا ظل ہما کی پیچی

ہوئی آنکھوں میں بھی تھا جواب ناراضی سے آنکھیں کھول کر کمال اور سعد کو دیکھ رہی تھی جو

بالکل بھی قیس کے ساتھ کام کر کے مطمئن نہیں تھے۔

”ہم نے انہیں رپورٹس بنا کر دیں انہوں نے اسے اپنے اپارٹمنٹ کی زینت بنا دیا۔ ہم دن رات محنت اسی لیے کر رہے ہیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے ان کا ریکارڈ خراب ہوگا اور ہماری بھی بہت سبکی ہوگی۔“ یہ سعد تھا جو برے دل کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ہمارے گہرا سانس بھرا۔

”دیکھو وہ کام کرتا رہا ہے۔ محنت بھی کر رہا ہے۔ جب کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا تو اس کا کیا قصور۔“ کمال نے اس کی بات کی مذمت کی۔ وہ تینوں اس وقت اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ قیس کی آج چھٹی تھی کیونکہ وہ آج بیمار تھا۔

”میں آپ کی بات سے متفق نہیں ہوں۔ محنت ہماری میڈم کر رہی ہیں۔ کیس کو وقت وہ دے رہی ہے جبکہ قیس سر، وہ تو بس ہاں ہوں ہی کرتے رہتے ہیں جیسے انہیں اس کیس میں دلچسپی نہ ہو یا وہ اسے سلجھانا ہی نہ چاہتے ہوں۔“ ہمارے قیس کی اس وقت کی حیثیت کا علم ہو چکا تھا۔ وہ انسان جو جہاں جاتا تھا لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا وہ آج یہاں پر بری طرح غیر مقبول ہو رہا تھا۔ اس کی کام میں عدم دلچسپی سب ہی آہستہ آہستہ نوٹ کر رہے تھے یہاں تک کہ وہ خود بھی۔

”تو پھر اس سب کا حل کیا ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“ سعد نے ہاتھ پھیلا کر شانے اچکائے۔

”یہی کہ وہ ہمیں آرڈر نہ دیں اور جو فائلز ہم نے انہیں بنا کر دی ہیں ہمیں لوٹا دیں۔“ ہمارے ابرو اچکائے پھر باری باری دونوں کو دیکھا۔

”یہ بات تو آپ لوگ خود بھی اس سے کہہ سکتے ہو۔ اس کیلئے مجھے کیوں طلب کیا۔“ اس

کی سوالیہ نظریں تھیں۔

”کیونکہ قیس سر کی دو لوگوں سے ہی شناسائی ہے۔ شیزل میم سے بات کرنے کے بارے میں تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے باقی بچی آپ، آپ بہترین آپشن ہیں ہمارے لیے۔“ وہ ہاتھوں کو سیز فار والے انداز میں کھڑا کرتی اٹھ گئی۔

”دیکھو میں آپ لوگوں کی رائے کا احترام کرتی ہوں لیکن یہ سب قیس تک پہنچانا میرے لیے تھوڑا مشکل ہے۔ اس لیے آپ سب مجھے اس سب سے دور رکھیں۔ ہم۔“ مسکراتے ہوئے کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی سعد اور کمال کا موڈ بری طرح آف ہوا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے۔ اب انہیں کیا کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

گدلی رات کی صبح نمی بھری تھی۔ بارش آج تواتر سے برس رہی تھی لیکن مکمل طور پر نہیں بلکہ پھوار کی صورت۔ اس ٹھنڈی صبح میں رحمت کچن میں مصروف نظر آ رہی تھیں۔ صوفے پر بیٹھ کر موزے پہنتے ہوئے احد کے ننھنوں نے مزیدار سوپ کی خوشبو سونگھی تھی۔ اس نے جلدی سے چمچماتے ہوئے شوز میں اپنے پاؤں ڈالے اور کمرے سے باہر آ گیا۔

”ماں صبح صبح کیا بنا رہی ہو آپ؟“ اس نے کچن میں آ کر مشروم سوپ پر نظر دوڑائی۔ اشتہا انگیز خوشبو نے اس کی بھوک کو چمکا دیا تھا۔

”شیزل کیلئے سوپ بنا رہی ہوں۔ بچی کل ہی کام سے لوٹی ہے۔ تھکن ہوگی اسے، اوپر سے سردی بھی تو بہت ہے۔“ انہوں نے فلیم کو آہستہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ احد مسکرا دیا۔

”اوکے، تو یہ بتائیں ابھی صرف اپنی بچی کی فکر ہے یا اس بچے کا بھی کوئی خیال ہے۔“ رحمت متحیر ہوئیں۔ اسی انداز میں مڑیں۔

”دیکھو تو ذرا، کتنے جیلیس ہو رہے ہو۔ ابھی وہ گھر نہیں آئی تو یہ حال ہے جب وہ گھر آئے گی تب کیا کرو گے؟“

”تب اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔ رحمت کے پلے کچھ نہیں پڑا۔
 ”کیا کہا؟“ احد نے نفی میں سر ہلایا۔ سوپ کی خوشبو تازہ نوز اس کے حواسوں پر سوار ہو رہی تھی۔
 ”ناہ، کچھ بھی نہیں، آپ ایک کام کریں سوپ کو باؤل میں ڈال کر مجھے دے دیں میں شیزل تک پہنچا دوں گا۔“ کچن کا ونٹر سے ٹیک لگائے وہ انہیں تجویز دے رہا تھا۔ رحمت کو اس کی یہ تجویز بری نہیں لگی اس لیے انہوں نے بنا کسی حیل و حجت کے سوپ کا باؤل اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”اسے میرا سلام کہنا، میں بھی چلتی لیکن اب گھٹنے جواب دے رہے ہیں۔ اب میں آرام کروں گی۔“ وہ کہنے کے بعد خراماں خراماں چلتیں اپنے کمرے میں غائب ہو گئیں۔ احد سوپ کا باؤل اور سینٹر ٹیبل پر پڑے بڑے سارے واز میں سے ایک تازہ سرخ پھول نکالتے ہوئے اس کے دروازے کے عین سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ بیل پر شیزل نے دروازہ دیا۔ نکھرا نکھرا سا احد گرمجوشی سے اسے وش کرنے کے بعد پھول اس کی سمت بڑھا رہا تھا۔ شیزل نے ابرو اچکاتے ہوئے اس پھول کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر اسے تھام لیا۔

”ماں نے تمہارے لیے سوپ بنایا ہے اور ساتھ میں سلام بھی دیا ہے۔“ وہ دونوں آگے پیچھے اندر آئے تھے۔ شیزل کا گھر تھوڑا بکھرا ہوا سا تھا۔ اس نے جلدی سے صوفے پر سے سامان ہٹا کر اس کے بیٹھنے کے جگہ بنائی پھر سلام کا جواب دینے کے بعد گویا ہوئی۔

”انہیں میرا شکریہ کہنا، وہ خود کیوں نہیں آئیں۔“ احد نے باؤل میز پر رکھا پھر کچن کی جانب چل دیا۔ وہاں سے سوپ کیلئے پیالیاں اور چمچ لے کر وہ واپس آ کر بیٹھا۔ ڈھکن ہٹایا اور

”او کے او کے، چلوں گی میں تمہارے ساتھ لیکن میں بتا رہی ہوں عام لڑکیوں کی طرح مجھے فیشن کرنا نہیں آتا اور کپڑوں کے نام پر میرے پاس سب کو آرڈیٹ ہیں۔ سب سے اہم بات میں ہیلز میں کمفرٹبل نہیں ہوتی اور میک اپ تمہیں پتا ہے میں نے زندگی میں نہیں کیا۔ تمہاری کہنی کی گید رنگ میں کیا اس طرح میں قبول ہو جاؤں گی۔“ اب ہنسنے کی باری احد کی تھی۔ وہ باؤل اور پیالیاں ٹرے میں رکھ کر کچن میں لے آیا تھا۔ بچا ہوا سوپ اس نے فریج میں رکھا۔

”تم کیوں بھول جاتی ہوں شینزل کہ تم ایک برینڈ ہو۔ میرے خیال سے یہ ایک لائن کافی ہے۔“ فریج بند کرنے کے بعد وہ ابرو اچکائے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے مکھن لگانے پر مسکرا دی۔ احد اپنی شرٹ کی آستین فولڈ کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اب کیا کرنے والا ہے۔

”احد ایک بات پوچھوں تم سے؟“ وہ گلوڑ پہنے برتنوں کو دھو رہا تھا جب اپنے عقب میں سے اسے شینزل کی آواز سنائی دی۔

”ہم۔“ شینزل نے خود کو کھڑا کیا اور چلتی ہوئی وہاں آگئی جہاں وہ برتن واش کرنے کے بعد انہیں سکھا رہا تھا۔

”مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو تم، جبکہ میں تم سے بڑی ہوں اور میرا ڈرہ چکی ہوں۔“ احد نے ابرو اچکا کر سرکوا ثبات میں جنبش دی پھر اس کے لبوں سے الفاظ چھوٹے تھے۔

”آپ نے کبھی محبت کی ہے؟“ یک لخت ہی شینزل نے اعتراف کیا تھا۔

”ہاں۔“ پھر اپنے اعتراف پر وہ خود ہی خجل سی ہو گئی۔

”پھر آپ میری حالت کو بہتر جانتی ہوں گی۔“ قبل اس کے وہ مزید کچھ کہتی اس کے اپارٹمنٹ کے کھلے دروازے پر دو انگلیوں سے دستک ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے

آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے بیچ و بیچ کھڑا ایک وجود باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑی شیزل اور اس کے عین سامنے زرد گلوں پہنے ہاتھوں میں پیالی لیے کھڑا وہ انسان جو انتہا کا جاذبِ نظر تھا اور شیزل کے بہت قریب کھڑا تھا۔

”قیس تم یہاں، کوئی کام ہے کیا؟“ وہ اس کی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے تھوڑی سی سرک کر پیچھے ہوئی۔ سپاٹ چہرے پر جڑی آنکھیں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

”یہ اس دن بھی آئے تھے نا، تمہارے سنیر ہیں؟“ شیزل نے خشک پڑتے ہونٹوں کو تر کیا۔ خواجہ خواہ ہی اس بندے کے سامنے اس کی پوزیشن آکورڈ ہو جاتی تھی۔ یہاں ابھی اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اتنی نروس نہ ہوتی جتنی ابھی ہو رہی تھی۔ کیوں؟ وہ اچھے سے جانتی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ احد خوشگوار حیرت کے ساتھ گلوں اتارتا اس کی طرف بڑھا۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر، میں احد خان ہوشیزل کا۔“ شیزل نے ہڑبڑاتے ہوئے اس کی بات درمیان میں قطع کی۔ وہ کچن کو پھلانگتے ہوئے ان کی طرف آئی۔

”یہ میرا دوست ہے۔ آپ اندر آ کر بیٹھو، آؤ۔“ اس نے احد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بری طرح اگنور کیا۔ نظریں وقت پر تھیں جو ساڑھے سات کا سندیسہ دے رہی تھی دفعتاً اس کی نظر میز پر رکھے تازہ گلاب پر پڑی پھر اس کی کنپٹی کی رگیں پھڑپھڑا اٹھیں۔

”بہت اچھا لگا آپ سے مل کر۔“ قیس کچھ نہیں بولا ٹھس وچپ کھڑا رہا۔ احد ماحول میں پھیلے تناؤ کو محسوس کر چکا تھا۔ بڑھے ہوئے ہاتھ کو اس نے پھیکے سے انداز میں واپس کھینچا قبل

اس کے وہ مزید کچھ کہتا آنے والا اندر آیا۔ ہاتھ میں پکڑی نیلی فائل کو اس نے گلاب کے پھول کے پاس پھینکنے والے انداز میں رکھا اور پھر ایک اچھلتی ہوئی نگاہ دونوں پر ڈال کر جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔ شینزل کا دل شرمندگی کی وجہ سے بری طرح ڈوب گیا۔ غوطہ جاندار قسم کا تھا۔

”یہ کیا انسان ہے؟“ احد کو اس انسان کا یہ ایٹی ٹیوڈ بہت برا لگا تھا جس کا اس نے برملا اظہار کر بھی دیا۔

”ایم سوری۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ حلق میں آپ ہی آپ گولا آن پھنسا۔
 ”تم کیوں سوری کر رہی ہو۔ تمہارا کیا قصور۔ مس بی ہیو اس نے کیا ہے تم نے نہیں جسٹ ریلیکس۔“ وہ اسے تسلی دینے کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا تا کہ شینزل مزید شرمندہ نہ ہو سکے۔
 شینزل نے ایک اداس نظر نیلی فائل پر ڈالی پھر کسی بوجھ کے سبب سر جھکا لیا۔

☆.....☆.....☆

کبھی جو تم آؤ
 تو محبت سنگ لانا
 ہمیں اپنا کر کے
 کہیں پھر نہیں جانا
 کبھی جو تم آؤ
 تو وعدے سنگ لانا
 بہاریں سنگ لانا
 نظارے سنگ لانا

کبھی جو تم آؤ
کبھی جو تم آؤ

اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ سکن کلر کا کورڈ اس پر بچ رہا تھا۔ ٹخنوں کو چھوتی قمیص تھی اور کھلا ٹراؤزر، بال فرینچ ناٹ میں بندھے تھے۔ چہرے پر حسب عادت ہلکا سا بچ اپ تھا۔ اس نے ڈریسنگ کی سفید سطح پر رکھی اپنی ریسٹ وائچ اٹھا کر کلائی میں باندھی۔ ریسٹ وائچ باندھے سے قبل اس کی کلائی میں بریسٹ موجود تھا۔ فقط سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں امریلڈ گولڈ کی انگوٹھی تھی۔ اس نے اپنا من پسند پرفیوم اٹھا کر چھڑکا پھر ایک طائرانہ نگاہ خود پر ڈالنے لگی۔ وہ ایک بزنس گید رنگ میں جا رہی تھی۔ وہاں احد کے بہت سے کلگیز موجود ہوں گے جن سے آج وہ اس کا تعارف کروائے گا۔ اسی مناسبت سے اس نے یہ جوڑا پہنا تھا۔ یہ اسے قیس نے خرید کر دیا تھا۔ وہ اسے بہت مہنگی مہنگی چیزیں خرید کر دیتا تھا۔ اس کے پاس جتنا بھی زیور تھا۔ جتنے بھی برانڈڈ کپڑے، جوتے، ریسٹ وائچز اور بیگز تھے سب قیس کی دین تھے۔ ابھی وہ جو اپنے خالی کان اور گردن کو دیکھ کر ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتے ہوئے جیولری پہن رہی تھی۔ وہ بھی قیس کے پیسوں کی ہی تھی۔ اس نے زمر کا ایک شیٹمنٹ نیکلس اٹھا کر پہنا، کوٹ کا لروالی قمیص پر یہ نیکلس بچ رہا تھا۔ کانوں میں باریک سے اسٹڈز پہننے پھر گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد وہ بیگز والے پورشن کی طرف بڑھی۔ شیشے کی الماری میں اس کے بیگز ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے شیشے کو سرکایا اور نیکلس کے رنگ کا بیگ اٹھا لیا۔ وہ جب جوتے پہن رہی تھی تب اس کے دروازے کی بیل بجی تھی۔ خود کو ایک اور بار آئینے میں دیکھنے کے بعد وہ چھوٹی مگر چوڑی اسٹریپ والے بیگ کو شانے پر ڈالے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس کے بیگ کی اسٹریپ اتنی چھوٹی تھی کہ جونہی اس نے اسے شانے پر

چڑھایا بیگ اس کی بغل سے جا لگا۔ دروازہ کھولنے پر ظاہری بات ہے احد اس کے سامنے تھا۔ وہ پہلی ہی نگاہ میں اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا اتنا زیادہ کہ اسے اپنے گہرے ارتکاز اور سرکتے ہوئے وقت کا بھی احساس نہیں ہوا۔ چونکا تو تب جب شیزل نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجاتی۔

”کدھر چلے گئے بھئی؟“ وہ اسے حال میں کھینچ لائی تھی۔ اپنے پیچھے دروازے کو لاک کر کے وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ کھلی راہداری ان کے قدموں کو اپنے کیلئے بے چین تھی۔

”تم بہت گریس فل لگ رہی ہو۔“ قدم اٹھ گئے تھے۔ ایک ساتھ مگر فاصلے سے۔ شیزل نے مسکرا کر اس کی تعریف قبول کی۔ اسے یک لخت ہی قیس یاد آیا تھا۔ اگر وہ اس کے سامنے یوں تیار ہوتی تو وہ ہزار نقص نکال چکا ہوتا۔ فیشن اور اس کے سینس کے بارے میں لمبا لیکچر دیتا اور بتاتا کہ کس فنکشن کے حساب سے آپ کو کس طرح کا گیٹ اپ اختیار کرنا چاہیے۔ آہ۔۔۔

پروہ ہوتا تب نا۔

”بہت شکریہ، تم بھی کچھ کم نہیں لگ رہے ہو۔“ وہ اس وقت رائیل بلیو کلر کے ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا۔ بالوں کو جیل سے سیٹ کیا گیا تھا۔ ہاتھ میں رولڈ گولڈ کی گھڑی تھی اور مہنگے پرفیوم کی خوشبو اس میں سے اٹھ رہی تھی۔

”تمہارے آگے تو کم ہی لگ رہا ہوں گا۔“ پھر وہ اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہوا۔ وہ ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر آئے تھے۔ احد نے اس کیلئے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ گھوم کر واپس آیا اور سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بیلٹ باندھنے لگا۔ شیزل تب تک اپنا سیٹ بیلٹ باندھ چکی تھی۔ اور اب وہ موبائل میں کچھ سرچ کرنے میں مصروف تھی۔

”مجھے لگا تھا بارش نہیں رے گی مگر صد شکر کہ رک گئی۔“ گاڑی کو روڈ پر ڈالنے کے بعد وہ

میوزک آن کر چکا تھا۔ کن انکیوں سے اس نے شیزل کو دیکھا جو اسے ٹوکنے کی بجائے اس کی بات کی تائید کر رہی تھی۔

”بالکل ٹھیک کہا، مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔“ اس نے والیوم تھوڑا سا مزید بڑھایا۔ مدھم سی آواز ہلکی سی تیز ہوئی۔ شیزل اس کی حرکت سمجھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اس گانے سے وہ اسے کیا سمجھانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ان لمحات سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ اسے اب یہ چیزیں مرعوب نہیں کرتیں۔

”میں آج آپ کو اپنی فیانے کی حیثیت سے متعارف کروانا چاہتا ہوں۔“ وہ مدھے پر آگیا تھا۔ اس کی تمہید ختم ہو چکی تھی۔ شیزل نے اس کی بات کو نظر انداز کیا کہ وہ ان سب میں ماہر تھی۔ فون کی جانب انہماک ایسا تھا جیسے اس سے ضروری کام اور کوئی ہو ہی نا۔

”یعنی کہ میں کہوں گا ہم دونوں جلد شادی کرنے والے ہیں۔“ اس نے پھر بات دہرائی۔ شیزل نے اسکرین پر موجود تصویر کو زوم کیا پھر اس کے ماتھے پر دوہل پڑ گئے۔ اسے وہ تصویر کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی۔

”ہم کیل کی حیثیت سے ہی وہاں جا رہے ہیں۔“ وہ اس کی عدم دلچسپی پر خائف ہوا۔ یہ عدم دلچسپی جان بوجھ کر تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

”شیزل آپ مجھے سن رہی ہیں۔ میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ اس بار شیزل نے اس کی طرف دیکھا پھر سیل فون کا رخ اس کی طرف کیا جہاں تین خانوں میں تین تصاویر تھیں۔ ایک لڑکے کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ ایک کا چہرہ بری طرح مسخ تھا اور تیسرے کا دو ٹکڑوں میں۔ احد کے چہرے پر یہ تصویر دیکھ کر ناراضگی چھا گئی۔ تو یعنی وہ اسے نہیں سن رہی تھی۔ اس نے سرد سانس خارج کی۔

”یونوان تینوں کو مارنے والا ایک ہی بندہ ہے۔ ان کے جسموں سے پلاسٹک کے ذرات ملے ہیں۔ اور یقین کرو گے یہ پلاسٹک باہر ملک سے منگوایا گیا ہے۔ اب کیا ہم باہر ملک جائیں گے چھان بین کرنے، کیا نان سینس ہے یہ۔“ گریس فل سی شیزل، ہینڈسم ساوہ، خوبصورت ساموسم، رومانٹک ساگانا، دل والی باتیں اور شیزل کی مصروفیات اُف۔

”تو یعنی اس وقت تم میرے ساتھ ہونے کے باوجود میرے ساتھ نہیں ہو۔ کتنی بری بات ہے نا یہ۔“ وہ پہلی بار اس سے روٹھا تھا۔ شیزل کی آنکھوں کے ساتھ منہ بھی کھل گیا۔ احد کے ماتھے پر آئے دو بل، آنکھوں سے پھوٹی ناراضی، خفا خفا سے گال اور ناک کی چونچ پر موجود گلابی پن، وہ متحیر سی اس کو ناراض دیکھ رہی تھی۔

”میری جاب کی ریکوارمنٹس ہیں یہ۔“ اس نے یاد دلایا تھا۔ احد کا چہرہ مزید اتر گیا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کی ترجیحات ہیں۔ آپ بہتر سمجھتی ہیں۔“ خفا خفا سا لہجہ، روٹھا روٹھا سا انداز، شیزل کے لبوں پر مسکان آن دوڑی۔

”تم ناراض بھی ہوتے ہو؟“ حیرت بھرا سوال۔

”میں بھی انسان ہوں۔“ صدے سے بھرا جواب۔

”دلچسپ۔۔۔۔۔ تم ناراض ہو کر کتنے اچھے لگتے ہو احد۔“ دنیا کی پہلی تعریف تھی جو بہت ہی عجیب تھی۔ حیرت سے برآمد ہوئی تھی اور اس کے ماتھے پر ایک بل کا مزید اضافہ کر گئی تھی۔

”یہ بے عزتی ہیں۔“ سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہنے کے بعد وہ واپس ونڈا سکرین پر نظر ڈال گیا تھا۔

”تم اسے ایک اچھا کامپلیمنٹ سمجھ سکتے ہو سچ میں بہت اچھے لگ رہے ہو۔“ اس کے مسکراہٹ، بھینے لپ اور آنکھوں کی چمک کم از کم آج کی تاریخ میں تو احد کو بالکل بھی پسند نہیں آ

رہی تھی۔ جس کا اس نے برملا اظہار کر بھی دیا۔

”مجھے ابھی تم بہت بری لگ رہی ہو۔“ وہ ہنس دی سر کو پیچھے گرا کر، ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر، احد کو اس کی ہنسی پسند تھی اس لیے اس کی ناراضی بھی بھاپ کی طرح اڑ گئی۔ وہ مسمرائزڈ سا اسے دیکھے گیا پھر اس نے کار کو پارکنگ میں روکتے ہوئے اجازت طلب کی تھی۔

”کیا میں تمہیں انگوٹھی پہنا سکتا ہوں۔“ وہ نہیں جانتی تھی اس نے کیا سوچ کر اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کیوں وہ اسے جگر جگر کرتی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنانے دے رہی ہے۔ وہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ کیوں اسے احد کے ہر ایک کلیگز کے ساتھ اس کی منگیتر کے حوالے سے ملنا اچھا لگ رہا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔

وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جب شیزل کے فون پر میسج باکس میں ایک تصویر آئی تھی۔ وہ شیزل اور احد کی تھی۔ اسی پوز میں جس میں وہ ابھی بیٹھے تھے۔ پرائیوٹ نمبر سے آئے اس میسج کو دیکھ کر اس کا ٹھٹھکنا بنتا تھا۔ اس نے جھٹ سے نگاہ احد پر ڈالی جو اسے دیکھ کر خیر مقدمی والے انداز میں مسکرایا تھا۔

”میں ریٹ روم سے ہو کر آتی ہوں۔“ اس نے کھڑے ہو کر اطلاع دی جسے سن کر احد نے سرائیبات میں ہلانے کے بعد ”اوکے“ کہا تھا۔ وہ ریٹ روم جانے کی بجائے پارکنگ لاٹ کی اور بڑھی۔ نمبر پرائیوٹ تھا اس لیے وہ اسے کال یا میسج نہیں کر سکتی تھی۔ فون کو مسلسل ہتھیلی پر مارتے ہوئے وہ جونہی کاروں کے قریب پہنچی وہاں کی لائیٹ چلی گئی۔ قدموں کو روکنے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر مسکان دوڑ گئی۔ اسے اپنے عقب میں آہٹ کے ساتھ ہی سیٹی کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ گھپ اندھیرے پارکنگ لاٹ میں سیٹی کی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ شیزل نے خود کو دوبارہ چلنے دیا۔ چھوٹی سی بلاک ہیل کی ٹک ٹک سیٹی

کی آواز کے ساتھ کسی ساز کی طرح فضا میں منتشر ہونے لگی تھی۔

”میں جانتی تھی تم آؤ گے۔“ اس نے دو آوازوں کے درمیان اپنی آواز ملائی۔ فون کو وہ چوتھی بار آن کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ تھا کہ آن ہو کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جان گئی اس کے فون کو بگ کر لیا گیا ہے۔ اس کے سنگلز ضبط کرنے کے بعد اسے تاریکی کی نظر کر دیا گیا ہے۔

”اتنا یقین ہے۔“ سیٹی کی آواز کی اور ساتھ میں شیزل نے بھی خود کو روک دیا۔ ”مجھ پر۔“ وہ عین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی سانسیں شیزل کے سر سے ٹکر رہی تھیں۔ ”کم آن مین، گچٹ کو نکالو اور اپنی اصلی آواز میں بات کرو۔“ ہنسی تھی مردانہ ہنسی۔ ”تمہیں میں بے وقوف لگتا ہوں۔۔۔ مادام۔“ شیزل کو لگ رہا تھا اس نے آنکھیں سختی سے میچی ہوئی ہیں۔ اندھیرا اتنا ہی تھا جتنا سختی سے آنکھیں میچنے پر ہوتا ہے۔ ”مرد کو اتنا ڈرنا نہیں چاہیے۔“ مسکراہٹ بھری ہنسی ایک بار پھر سے اس کے عقب سے ابھری۔

”وارا چھا ہے مگر میں گھائل نہیں ہوا۔“ وہ تھوڑا اور اس کے قریب آ گیا تھا۔ شیزل نے گہری سانس بھری۔ ہا کی بات اس کے دماغ میں تھی۔ مگر افسوس اس میں سے عود کی خوشبو نہیں آرہی تھی۔ اسے مایوسی ہوئی۔

”انسان دو صورتوں میں ہی خود کو چھپاتا ہے۔ ایک تب جب وہ چور ہو اور ایک تب جب وہ قاتل ہو اور تم یہ دونوں ہو۔“ اس کے شانوں پر دو ہاتھ آئے تھے جنہیں اس نے بری طرح جھٹک دیا تھا۔ غلط کیا۔ اس جرم کی سزا میں ایک بازو اس کی گردن پر سختی سے جمایا گیا تھا جبکہ دوسرے سے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اس کی پشت سے لگا لیا گیا تھا۔ شیزل نے

مزاحمت کی، ناکام گئی۔ اس کی گرفت میں آشنائی کی کوئی رمت نہیں تھی۔ اس کا سراپا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

”بتانے کا شکر یہ، تمہاری معلومات کافی دلچسپ ہوتی ہیں۔“ وہ اس کے کان میں پھسپھسا رہا تھا۔ شیزل نے سختی سے دانت پر دانت جما لیے۔ اس کی مزاحمت قابل دید تھی۔

”اتنے مرد کے بچے ہو تو مجھے چھوڑ کر روشنی میں مجھ سے بات کرو، یوں اندھیرے میں چھپ کر مجھے جکڑ کر کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو۔ میں تم سے پھر بھی بہر حال نہیں ڈروں گی۔“ گردن کے گرد بازو کی سختی تھوڑی مزید بڑھی۔ شیمنٹ نیپکلیس اسے بری طرح چھنے لگا تھا۔

”ڈرنے کی امید کی بھی نہیں ہے تم سے شیزل بی بی۔“ ماسک میں چھپے اس کے لب شیزل کے کان کے بالکل قریب تھے۔ یہ طرزِ مخاطب۔۔۔ اس کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا جس نے اس کے پورے بدن میں سنسناہٹ پیدا کر دی۔ اس نے بہت سوچ کر لفظوں کا چناؤ کیا تھا۔ چیختے ہوئے اس سے کہا۔

”چھوڑو مجھے، گھن آرہی ہے مجھے تمہاری گرفت سے۔“ اگر یہ ”وہ“ ہوا تو ضرور بھڑکے گا۔ یا خدا یہ وہ نہ ہو بالکل بھی نہ ہو۔

”کیوں۔۔۔۔۔ میری گرفت میں کیوں گھن آتی ہے۔ کوئی اور نزدیک ہو تو آسودگی ہوتی ہے تمہیں اور میں نزدیک ہوں تو۔“ وہ روانی میں کہتے کہتے رکا تھا۔ شیزل کی دعا کو شد و مد کے ساتھ رد کیا گیا۔ اس نے مزاحمت کرنا بند کر دی وہ جم گئی۔ کچھ لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ کچھ مان ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔

”کون ہو تم؟“

اس نے لرزتا ہوا سوال کیا۔ اسی دوران اسے جھٹکے سے چھوڑ دیا گیا۔ وہ جونہی مڑی ڈھیر

ساری گاڑیوں کی لائٹس معہ آواز جل اٹھی تھیں ایسے جیسے اندھیرے میں تارے چمکتے ہیں جل بجھ۔۔۔۔۔ جل بجھ۔۔۔۔۔ اس نے اسی منظر میں ایک سیاہ ہڈ جیکٹ والے کو وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ نظروہ بہر حال پھر بھی ٹھیک سے نہیں آیا تھا کہ اندھیرے سے روشنی کے سفر نے کچھ دیر کیلئے آنکھوں کو چندھیادیا تھا۔ اس نے جاتے جاتے ہاتھ بلند کر کے تالی بجائی۔ اس کے تالی بجانے کے فوراً بعد لائیٹ آگئی تھی بالکل اسی طرح جس طرح کاروں کی روشنیاں جلی تھیں۔ وہ جاچکا تھا۔ شیزل کے وجود کو شل کر کے وہ چلا گیا تھا۔ ☆

☆.....☆.....☆

بغاوت و سرکشی جب کسی انسان کے خون میں آ جاتی ہے پھر وہ چاہے لاکھ سیشن لے لے لاکھ نصیحتیں سن لے۔ لاکھ وعدے کر لے وہ کرتا وہی ہے جو باغی روح کہتی ہے۔ نین کی روح اس وقت باغی تھی۔ اسے جہان بابا بالکل پسند نہیں تھے۔ وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز میں ان کی دخل اندازی بالکل بھی نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ ان کے صاف انکار کے باوجود وہیں شادی کرنے پر مصر تھی جہاں اس کا دل کیا تھا۔

”تم کیوں ہمیں خوار کر رہی ہو نین، کیوں مجھے ذلیل کروانے پر تلی ہوئی ہو۔ اس صورت جب تمہاری ساری ذمہ داری بابا نے میرے شانوں پر ڈال دی تھی اور یہ کہا تھا کہ آج سے میں تمہارا کفیل ہوں مجھے ہی تمہاری تربیت کرنی ہے تو تم کیوں میری اتنے سالوں کی ریاضت پر پانی پھیر رہی ہو۔ میں تم سے چھوٹا ہوں مگر بچپن سے مجھے بہت بڑا کر دیا گیا۔ کیا میرا دل نہیں کرتا تھا کہ کوئی مجھے بھی ویسے ٹریٹ کرے جیسے کہ مجھے تمہیں ٹریٹ کرنے کو کہا گیا تھا۔ میرا بھی ویسا ہی خیال رکھا جائے جیسا میں تمہارا رکھتا ہوں۔ بتاؤ مجھے۔“

آج اس کی مایوں تھی۔ کل مہندی ہونی تھی اس کے بعد بارات۔ ملک کے معروف

سیاست دان کی بیٹی کی شادی ملک کے معروف بزنس مین کے بیٹے سے طے پائی تھی مگر نین کو یہ شادی منظور نہیں تھی بالکل بھی نہیں تھی۔

”تم مجھے اموشنل بلیک میل نہیں کرو کیونکہ میں تب بھی یہ شادی نہیں کروں گی۔ میں نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔“ پیلے جوڑے میں بیٹھی اس کی بہن آج اسے اس کی بہن نہیں لگ رہی تھی۔ آج وہ کوئی اور تھی۔ وہ جو بے حس ہوتے ہیں۔ وہ جو خود غرض ہوتے ہیں۔ وہ جو فقط اپنی ذات سے پیار کرتے ہیں۔

”تمہیں لگتا ہے تم ایسا کر سکتی ہوں۔“ دور کھائی سے آتی ہوئی وہ اپنی آواز سن رہا تھا۔ اس کی سماعت آج بے جان تھی۔

”میں ایسا کروں گی اور ضرور کروں گی۔“ بیس کی دہلیز پر کھڑی وہ لڑکی، سترہ کی سیڑھی پر چڑھا وہ لڑکا، دونوں میں بہن بھائیوں والا رشتہ۔۔۔ نہیں امم ہم دونوں میں باپ بیٹی والا رشتہ تھا۔

”پھر تم سوچ لینا اس دن میری موت ہوگی۔“ ضبط کے سرخ دھاگے آنکھوں میں منڈلا رہے تھے۔ آواز دھیمی اور کنٹرولڈ تھی۔

”کوئی کسی کیلئے نہیں مرتا۔ یہاں ہر کوئی اپنی زندگی لے کر آیا ہے۔ موت بھی اسے ویسی ہی ملنی ہے جیسی اس کی تقدیر میں لکھی ہے۔“ جہانگیر مینشن دہنوں کی طرح سجا ہوا تھا۔ اداس دہنوں کی طرح، جس کی بلند و بالا دیواروں و ستونوں پر پھول تو چڑھے تھے مگر سوز زدہ سے۔ جیسے قبروں پر چڑھتے ہیں۔ حسین مگر اداس اداس۔۔۔

”یعنی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، میں مروں یا جیوں تمہاری بلا سے۔“ کرب کی اذیت آواز سے جھلک رہی تھی۔ وہ اس کے بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ زرد جوڑے میں ملبوس اس کی

بہن کسی بھی زیور سے آراستہ نہیں تھی۔ فنکشن ختم ہو چکا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔

”اموشنل کارڈ نہیں کھیلو سیٹھ صاحب اور یہاں سے چلے جاؤ مجھے سونا ہے۔“ وہ بھی بیڈ سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ وہ وہاں کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا پھر اپنے بابا کے پاس گیا جو اس کی توقع کے عین مطابق اس وقت سٹڈی روم میں تھے۔ اس نے دوا انگلیوں سے دروازے کو ناک کیا۔ ان کے متوجہ ہونے پر اندر آ کر سامنے بیٹھ گیا۔

”وہ راضی نہیں ہے اس شادی پر، مجھے لگتا ہے ہم نے جلدی کر دی۔“ اس نے بلا کسی تمہید کے کہا تھا۔ آدھی رات ہونے کو تھی۔ حویلی کی سجاوٹی لائٹس تاہنوز جل رہی تھیں۔

”میں نے آپ کو اس لڑکے کا سارا بائیوڈیٹا لا کر دے دیا تھا۔ ایسا نہیں ہے وہ نین کیلئے سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ ہے لیکن شادی کیلئے یہ ایک چیز کافی نہیں ہوتی۔ لڑکے کا بیک گراؤنڈ اس کا کردار دیکھا جاتا ہے جبکہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بیٹا باپ پر ہوتا ہے اور آپ اس کے باپ کو اچھے سے جانتے ہیں۔“ ان کے بیٹے نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”اگر ہم اسے الگ گھر لے دیں۔ اسٹرانگ بینک بیلنس دیں۔ میں اپنے پلاس اس کے نام کر دوں گا تو کیا تب بھی وہ ویسا ہی رہے گا۔ اس کے کردار میں لچک مفقود ہونے کے چانس ہوں گے کیا؟“ جہانگیر نے کتاب کو میز پر رکھا۔ بک مارک مطلوبہ صفحے پر رکھنے کے بعد وہ اسے بند کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے آنکھوں پر لگی عینک کے دونوں حصوں کو جدائی بخشتے ہوئے علیحدہ کیا اور انہیں گردن پر جھولنے کیلئے چھوڑ دیا۔ آنکھیں مسلتے ہوئے وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہے تھے۔

”سب کچھ پیسے سے نہیں خریدا جاسکتا۔ مانا کہ یہ قول غلط ثابت ہو گیا ہے آج کل کے دور میں لیکن پھر بھی پیسے اور اسٹیٹس سے آپ کسی کی فطرت نہیں بدل سکتے۔ میں اگر آپ کو کہوں سیٹھ صاحب میں اربوں روپے آپ کے قدموں میں نچھاور کرتا ہوں بد فطرت بن جاؤ، بن جاؤ گے؟ نہیں کیونکہ فطرت نہیں بدلتی۔ آپ کے اندر کی پازٹیوٹی آپ کو ملامت کرتی رہے گی جس کے تحت کچھ دن بعد آپ واپس پلٹ جاؤ گے۔ اسی طرح وہ بھی نہیں بدلے گا۔“

وہ ان کے لمبے چوڑے بیان کے دوران لب بستہ رہا تھا۔ ہاں یا نا، اگر یا مگر کی کشتی تھی جس میں وہ اس وقت ڈول رہا تھا۔ پھر جھنجھلاتے ہوئے گویا ہوا۔ ”فطرت بدل جاتی ہے بابا، کوشش سے سب ممکن ہے۔“ جہانگیر نے ضبط بھری سانس بھری۔

”شادی پوری زندگی کا معاملہ ہے بیٹا، ہم ابہام و مفروضوں پر تو رشتہ قائم نہیں کر سکتے نا۔ نین کی اب جس سے شادی ہو رہی ہے وہ ہمارے ہاتھوں کا ہے۔ کردار کا بے حد مضبوط ہے وہ، مرد کا کردار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بد کردار کے ساتھ زندگی نہیں گزرتی۔“ وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ جو سمجھ نہیں رہا تھا۔

”بابا میں اسے بہت چاہتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے جب میں بہت چھوٹا تھا تو وہ چپکے چپکے میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ میں نے ہوش سنبھالنے تک اسی ہی اپنی بہن، اپنی دوست کے روپ میں پایا ہے۔ میں نہیں جانتا میرے دل میں اس کیلئے اتنی محبت کیسے آئی لیکن میں اسے یوں دیکھ کر بے چین ہو گیا ہوں۔ پلیز کچھ کریں بابا۔“ وہ روہانسا ہو رہا تھا بہت روہانسا۔

”تم اس کے بھائی ہو اور وہ میری اولاد، میری محبوب بیوی سے ہوئی محبوب اولاد، تم میری پوزیشن سمجھو کہ میں اس وقت کیسا محسوس کر رہا ہوں گا۔ لیکن اس کے بہتر مستقبل کیلئے مجھے یہ کرنا ہے اور میں دل پر پتھر رکھ کر کر رہا ہوں۔“

وہ جب گیارہویں سال میں چڑھا تھا تب اس کے باپ نے اسے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں ایک ایک لفظ بغیر کسی ملاوٹ کے بتا دیا تھا اور تب انہوں نے کہا تھا۔
 ”بتاؤ کیا اب بھی میں تمہارا رول ماڈل ہوں۔ کیا اب بھی تمہیں دادا اتنے ہی عزیز ہیں اور کیا اب بھی تم نین سے منسلک رہنا چاہو گے۔“ اور اس نے ان کے سوال کا بڑی سہولت کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا خونی رشتے قتل بھی کر دیں پھر بھی برے نہیں لگتے، رہی نین کی بات تو اب وہ میرے دل کے مزید اونچے مقام پر فائز ہو گئی ہے اور میں اس پر خوش ہوں۔“
 وہ سٹڈی میں بیٹھے اپنی اپنی پریشانیوں میں گھل رہے تھے اس بات سے یکسر انجان کے ان کے گھر میں کس قدر طوفان برپا ہونے والا ہے۔ ان کی عزت ان کی عزت کو کس طرح ملیا میٹ کرنے والی ہے۔ بارات کی صبح جب مصباح نین کے کمرے میں گئی تھیں تب وہاں بیڈ کے درمیان فقط ایک کاغذ کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پورے گھر میں زلزلہ آ گیا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آیا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ عزت نیلام ہو گئی ہے۔ یقین ملیا میٹ ہو گیا ہے۔ دل ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ سب فتا ہو گیا ہے۔ تب پہلی بار سترہ سال کی عمر میں اس لڑکے کو برین ہیمیرتج ہوا تھا جو کبھی بڑے فخریہ انداز میں کہا کرتا تھا کہ وہ اور اس کی بہن کی آپس میں ایسی بانڈنگ ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ شاک اتنا زیادہ تھا کہ لمبے عرصے کیلئے جہانگیر کمرہ نشین ہو گئے تھے۔ ان کے سیاسی کریئر کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ انسان دنوں میں بوڑھا ہوا تھا جس نے اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کے کھیل میں خود کے حصے میں عمر بھر کی سیاہی لے لی تھی۔

بیٹی ہو تو تابعدار ہو، فرمانبردار ہو۔ بیٹی ہو تو اچھی ہو ورنہ نہ ہو۔ ایسی اولاد کا کیا فائدہ جسے خون

سے سینچنے کے بعد اس سے بغاوت حاصل کریں۔ اس کی خود غرضی اور ہٹ دھرمیاں سہیں۔ ایسی اولاد واقعی اولاد کہلانے کے قابل نہیں ہوتی۔ نین اولاد کہلانے کے قابل نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

موسم خاصا خوشگوار تھا۔ سوندھی سوندھی سی ہوا مسلسل چل رہی تھی۔ سردیوں کی ہوائیں ٹھٹھرا دینے والی ہوتی ہیں مگر دل کش ہوتی ہیں۔ ہلکی سی پھوار برس رہی تھی ساتھ ساتھ بادل بھی وقفے وقفے سے گرج رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اب سے کچھ دیر بعد زوروں کی بارش ہو۔ ایسی بارش جو صبح تک ہی تھے۔ ایسے موسم میں ایک گھر میں سے مزید رکھانے کی خوشبو آ رہی تھی۔ گھر کے اندر اوپن ایئر کچن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پاس پاس کھڑے مستیوں میں کچھ بنانے میں مگن تھے۔ کبھی لڑکا سر پر بو باندھے لڑکی کی ناک کی چونچ پر بیٹر لگا دیتا تو کبھی لڑکی میدے کا بھرا باؤل اس کے سر پر انڈیل دیتی جس کے سبب وہ لڑکا انسان کم بھوت زیادہ لگنے لگتا۔ وہ دونوں ایسے ہی مستیاں کر رہے تھے جب ان کے گھر کی ڈور بیل بجی، لڑکا الرٹ ہوا تھا۔ اس نے اپنے برابر کھڑی لڑکی پر نگاہ ڈالی جس کے ساتھ وہ آج کو الٹی ٹائم گزارنے والا تھا۔ پھر بالوں میں سے میدے کے ذرات کو جھاڑ کر وہ دروازے کی اور بڑھا۔ جونہی اس نے کی ہول پر آنکھ ٹکائی وہ دہل کر پیچھے ہٹا تھا۔

”شیزل۔“ یک لخت ہی مڑتے ہوئے اس نے لڑکی کو اطلاع دی تھی۔ وہ یہ نام سنتے ہی قیس کی ہدایت پر ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔ قیس نے برق رفتاری سے اس لڑکی کے ہونے کے شواہد وہاں سے ہٹائے پھر ایپرن کو جھاڑ کر گلا کھنکھارتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ دائیں بازو پر کوٹ ڈالے پائکس والے بھورے ٹراؤز اور گھٹنوں سے کافی اونچی مردانہ سیاہ شرٹ پہنے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے سر پر گلاسز لگے تھے اور چہرہ کسی حد تک

سپاٹ تھا۔ قیس کو اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کا ٹراؤزر، ٹی شرٹ، ایپرن، چہرہ اور قینچی چل یہاں تک بال بھی سب کے سب سفید آٹے سے اٹے تھے۔ صد شکر اس کے چہرے پر خشک میدہ لگا تھا ورنہ وہ اس کی گھبراہٹ ضرور پکڑ لیتی۔

”یہ معجزہ کیسے ہو گیا کہ آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں۔“ وہ سائیڈ پر ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دے رہا تھا۔ اس کے صوفے پر بیٹھنے تک وہ دروازہ بند کر کے اس کے سامنے صوفے کے کنارے پر ٹک گیا۔ ہاتھ میں اس کے کفگیر تھا۔

”لگتا ہے میں غلط وقت پر آ گئی۔ ہے نا؟“ وہ چاروں اطراف میں نظر دوڑا رہی تھی۔ قیس کو اس کی یہی عادت سخت ناپسند تھی کہ وہ شک کرتی تھی اور انہیں نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا کرتی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے بلکہ آپ تو بہت اچھے وقت پر آئی ہیں یعنی آج آپ میرے ساتھ ڈنر کر سکتی ہیں۔“ وہ سیٹی بجنے پر تیزی سے اوون کی سمت لپکا۔ اتنی ہی دیر میں باہر سے موسلا دھار بارش کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ہوا کے جھکڑ بارش کی بوندوں کو شیشے کی کھڑکیوں پر پٹخ کر مار رہے تھے۔ اس لیے شور واضح تھا۔

”ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا، تمہارے گھر کے تھوڑے قریب میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ میں نے بہت ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔“ اس نے لڑائیہ اوون میں سے نکال کر کاؤنٹر پر رکھا پھر کوکیز کا بیٹرڈے میں سجا کر اوون کے اندر رکھ دیا۔ اب وہ کاؤنٹر پر دھری ٹوکری میں سے اسٹائیریز نکال کر انہیں جو سر میں ڈالے دودھ کے اندر ڈال رہا تھا۔

”آپ کو ہمیشہ ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ ہر چیز فکس کر سکتی ہیں۔ کچھ چیزیں اختیار سے باہر ہوتی ہیں مادام۔“ آخری جملہ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور پھر جو سر کا بٹن پیش

کر دیا۔ مخصوص آواز وہاں پھیل چکی تھی۔ شیزل نے اس کے ”مادام“ لفظ پر آنکھوں کو مزید تھوڑا سخت کیا۔ اس کا شک انتہا کو پہنچ رہا تھا۔

”متفق ہوں لیکن ابھی میں چاہتی ہوں تم میری گاڑی ٹھیک کر دو یا پھر مکینک کو دکھا دو مجھے گھر پہنچنا ہے۔“

قیس نے اسٹائیریٹک لمبے گلاس میں ڈالا ڈالنے کے بعد گلاس کے کنارے پر وہ کٹی ہوئی اسٹائیریٹ سجا رہا تھا۔ سفید سرخ دھاریوں والا سٹرا گلاس کے اندر ڈالنے کے بعد اس نے لاؤنج میں پردہ ہٹی کھڑکی پر نگاہ دوڑائی دوڑانے کے بعد سہولت کے ساتھ بولا۔

”میں ایسا ضرور کرتا مگر باہر اب ڈالہ باری بھی شروع ہو چکی ہے۔ اور اس موسم میں میرے خیال سے کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو باہر جائے گا۔“ کاؤنٹر سے باہر آ کر گلاس اٹھائے وہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سفید سنیکرز میں قید اپنا پاؤں جھلاتے ہوئے فون میں مگن تھی۔ اسی مگن انداز میں اس نے گلاس پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھا اور جان بوجھ کر قیس کے گلاس چھوڑنے پر بھی اسے نہیں تھا ماما ہاتھ سے پھسلنے دیا ایسے جیسے یہ فوری اور اتفاقی طور پر ہوا ہوا۔

”شٹ۔“ پھر اس نے چہرا اٹھا کر قیس کو دیکھا جو دونوں ہاتھ کھڑے کرتا ہوا وضاحت دینے لگا۔ صد شکر اسے موقع مل گیا۔

”میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ آپ کیا دھیان ہی نہیں تھا حادثہ تو ہونا ہی تھا۔“ دونوں ہی چاہتے تھے یہ گلاس گر جائے۔ ایک اپنے مقصد کی خاطر اور ایک اپنے۔

”پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جو میری کار خراب ہو گئی۔ اب میں کیا کروں؟“ وہ جھنجھلا چکی تھی۔ ٹیک اس کے ٹراؤزر اور شرٹ کو بری طرح گندا کر چکا تھا۔ یہاں تک کے اس کے

سفید سنیکرز بھی گلابی شیک کی نظر ہو چکے تھے۔

”آپ میرے ڈرینگ روم میں چلی جائیں۔ وہاں کپڑوں کی وارڈروب میں ایک سیکشن ایسا ہے جن میں سے میں نے ابھی تک ٹرائے نہیں کیے ہیں۔ آپ ان میں سے کچھ دیکھ سکتی ہیں۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے گئی تھی۔ اس کے منظر عام سے ہٹتے ہی قیس نے ایک سوئس کی رفتار پکڑی۔ کمرے میں چھپی لڑکی کی کلائی تھام کر اسے مین ڈور سے باہر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

”آج رات تم انیکسی میں رکو اور پلیز محتاط رہنا کسی کی نظر میں نہیں آنا۔“ وہ اسے دھیمی آواز میں تاکید کر رہا تھا۔ لڑکی یعنی ہما اس فیصلے سے خوش نہیں تھی۔ اس کا پورا وقت برباد ہو گیا تھا۔ وہ جھلا گئی۔

”لیکن ہمارے پلان کا کیا؟“ قیس نے تقریباً آدھا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”میری جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے اور تمہیں پلان کی پڑی ہے۔ قبل اس کے بارود باہر آئے یہاں سے چلی جاؤ اور پلیز صبح تک نظر نہیں آنا۔ ہم صبح بات کریں گے۔“ اس نے جھٹ سے دروازہ بند کر کے اسے لاک کر دیا۔ ہما ہکا بکا رہ گئی۔ قیس فرش پر گرے شیک کو دیکھ کر گہری سانس بھر گیا۔ موپ سے اسے رگڑتے ہوئے اس کی نگاہ اس دروازے پر تھی جس کے پیچھے وہ گئی تھی۔ وہ جو اندر آتے ہی اس کے کپڑے ٹٹولنے لگ گئی تھی۔ اس نے ایک سیکشن کنگھالا پھر دوسرا اور پھر تیسرا وہاں کوئی بھی ویسی ہڈ جری نہیں تھی جیسی اس قاتل نے پہنی ہوئی تھی۔ مایوس ہوتے ہوئے وہ اس کے ان یوزڈ (بغیر استعمال شدہ) کپڑے نکال کر انہیں چیک کرنے لگی۔ ایسا کرنے کے دوران اس کی نظر شوریک کے قریب پڑی لائڈری باسکٹ پر پڑی تھی۔ جہاں لائڈری سے آئے کچھ کپڑے تھے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ان کپڑوں کو نکالنا شروع کیا۔

ایک دو تین۔۔۔ چوتھی بار ایک شرٹ کو ہٹاتے ہوئے اسے باسکٹ میں وہ جیکٹ نظر آئی تھی۔
 شیزل کا دل بری طرح ڈوب کر ابھرا۔ وہ دو سکیٹھ کیلئے اس ایش گرے رنگ کی جیکٹ کو دیکھتی
 رہی پھر اس کے ہاتھ اس جرسی کو باسکٹ سے باہر نکال رہے تھے۔ وہ اسے ہاتھوں میں
 دوپے شیشے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے آئینے میں پہلے خود کو دیکھا پھر ہاتھوں میں
 قید سٹری ہوئی جرسی کو۔

”مجھے تمہارے غصے سے ڈر لگتا ہے قیس، تمہارا غصہ تمہاری پرسنالٹی کو سلب کر رہا ہے اور
 مجھے اس بات کا افسوس ہے۔“ اس کے دائیں ہاتھ میں جرسی کا دائیاں شانہ تھا اور بائیں ہاتھ
 میں بائیاں۔

”میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں پتا ہے نا تمہیں یہ بات، اگر اب کوئی بھی بکو اس کی تو زندہ گاڑ
 دوں گا۔“ اسے لگا اس کے بال ابھی تک مردانہ گرفت میں قید ہیں۔ اسے اپنے جبرے پر
 اچانک سے انگلیوں کی گرفت محسوس ہوئی۔ اسے اپنی سر کی پشت کے بال اکھڑتے ہوئے
 محسوس ہوئے۔ اس کے جبرے میں اتنا درد ہوا جیسے وہ ٹوٹ جائے گا۔

”تم ایک سائیکو ہو۔ چھوڑو مجھے، چھوڑو۔“ وہ بری طرح چونکی جیسے کوئی نیند میں ہڑبڑا کر
 اٹھتا ہے۔ گال پر پڑے تھپڑ کی شدت اور گونج اتنی تھی کہ اسے لگا آج بھی اس کے کان میں
 سیٹیاں بج گئی ہیں۔ آج بھی اس کا گال پھٹ چکا ہے۔ آج بھی اس میں سے خون رس رہا
 ہے۔ اس نے نمناک نگاہوں کے ساتھ دائیں بائیں ہاتھ کو پھیلاتے ہوئے جرسی کو کھولا۔ اس
 کی پاکٹس پر چار چھوٹی بڑی کھروچیں لگی ہوئی تھیں۔ اوپر نیچے۔۔۔ جرسی کے دھاگے نکل رہے
 تھے۔ ایش گرے رنگ کی جرسی اور سفید دھاگے۔ اسے یاد آیا وہ وقت جب اسے اپنی اور احد
 کی تصویر موصول ہوئی تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ قاتل اس سے ملاقات کا خواہ ہے اس لیے اس

نے جلدی سے کانچ کوئڈ نیل پینٹ کا کوٹ اپنے ناخنوں پر چڑھایا اور کیمرہ لینز آنکھوں پر لگا لیے۔ وہ جانتی تھی ان سب چیزوں سے کوئی نہ کوئی فائدہ تو ضرور ہوگا اور اسے فائدہ ہو گیا۔ اسے ”قاتل“ مل گیا۔

”شینزل، کتنی دیر ہے یار۔“ اس نے دستک پر مڑ کر دیکھا پھر جلدی سے جرسی کی تصاویر اتاریں۔ دو تین گہرے گہرے سانس بھر کر خود کو نارمل کیا اور باہر آ گئی۔ وہ جب باہر آ رہی تھی قیس ڈنر ٹیبل پر کھانا چن رہا تھا۔ وہ اسے خود کی آف وائٹ شرٹ اور فان رنگ کے ٹراؤزر میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹراؤزر کھلا اور لمبا تھا لیکن شینزل نے اسے ایسے ایڈجیسٹ کیا تھا کہ وہ بالکل اس کے سائز کا لگ رہا تھا۔ اس نے باہر آتے ہی اپنا لانگ کوٹ پہن لیا۔ وہ گردن کے پیچھے دونوں ہاتھ کر کے اپنے بال کوٹ سے باہر نکال رہی تھی ساتھ ساتھ قیس کو بھی سنے جا رہی تھی جو اس سے کہہ رہا تھا۔

”عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ عمر چور ہوتی جا رہی ہیں اور میرے خیال سے یہ نا انصافی ہے۔“ اس نے سفید پلیٹ کے دائیں بائیں کانٹا اور چیچ سیٹ کیا پھر ایک نظر اس پر ڈالی جس نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا بلکہ وہ اس سے کھر درے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”تمہاری کار اگر میسر ہے تو میں لے کر جانا چاہتی ہوں صبح لوٹا دوں گی۔“ وہ انجان بنتے ہوئے اس سے سوال کر رہا تھا۔

”میری کار کی کیوں ضرورت ہے آپ کو؟“ اس نے گلاس اور جگ میز پر رکھے۔ شینزل نے چباتے ہوئے جواب دیا۔

”کیونکہ مجھے گھر جانا ہے؟“ ایک گلدان رکھا۔ اس میں پھول سجائے۔

”تو کیا یہ گھر نہیں ہے۔ یہ بھی گھر ہے۔ آپ کا گھر۔“ وہ سینے پر بازو باندھ کر کھڑی

ہو گئی۔ ابرو تن چکی تھی۔

”کم از کم یہ گھر میرا نہیں ہے۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ قیس موم بتی اسٹینڈ پر دو گہرے نیلے رنگ کی موم بتیاں رکھ رہا تھا۔ تیسری پہلے ہی اس پر رکھی تھی۔

”جس طرح میں ہوں آپ کا۔“ وہ اس کی بات مکھی کی طرح اڑا گیا تھا۔ اس نے ایک موم بتی جلائی، پھر دوسری پھر تیسری جیسے ہی اس نے تیسری موم بتی کو شعلہ دکھایا بادلوں کی زبردست گرج کے ساتھ لائٹ چلی گئی۔ قیس کے لبوں پر مبہم سی مسکان دوڑی تھی۔ پتہ نہیں اسے آج بھی اندھیرے سے ڈر لگتا ہے یا نہیں۔۔۔ پاگل۔

”تم بہت ڈھیٹ ہو۔“ اس کی ملامت پر وہ اپنی جگہ سے سرکا۔

”بلا کا۔“ قیس نے اضافہ کیا اور قدم قدم چلتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ یونہی سینے پر بازو باندھے سراٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

”پیسے اور چیزیں کیوں بھیجتے ہو؟“ اس نے موضوع بدلا۔ قیس نے شانے اچکا دیے۔

”کیونکہ یہ میرا فرض ہے۔“ وہ مان گیا۔ شینزل کا گلا بھاری ہونے لگا تھا۔ وہاں کچھ بن سا رہا تھا۔

”میں تمہارے فرض کی لسٹ سے بہت پہلے نکل چکی ہوں اس لیے آئیندہ تم مجھے چیکس اور پیسے نہیں بھیجو گے اور نہ ہی چوروں کی طرح میرے اپارٹمنٹ میں آکر چیزیں رکھ کر جاؤ گے۔“ وہ ہنس دیا۔ ہنسنے کے سبب اس کے شانے ہل رہے تھے۔ ہاتھ جینز کی جیبوں میں تھے اور گردن پیچھے کو جھک چکی تھی۔ پھر وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوا۔

”تمہارے پڑوسی نے بتایا ہے نا تمہیں، بہت تنگ ہوا تھا اس شام میں اس کی وجہ سے۔“

شینزل تم گھر پر ہو۔ شینزل تم گھر پر ہو ایک ہی رٹ لگالی تھی اس بے وقوف نے۔“ وہ اس کے ہنسنے سے خائف ہوئی تھی۔ انگلی اٹھاتے ہوئے اسے وارن کرنے ہی والی تھی کہ قیس نے اس کی وہی انگلی پکڑ کر اس کے لبوں سے لگادی۔

”شششش، بہت باتیں ہو گئیں بس اب چپ، اب کھانا کھاتے ہیں ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے ڈائننگ ٹیبل پر لے آیا۔ اس کیلئے کرسی کھینچی جس پر وہ بیٹھ گئی خود عین اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔

”ویسے بہت زہر لگتا ہے مجھے وہ آدمی، اس سے دور رہا کرو۔“ نیکپن جھاڑ کر اس نے اپنے گھٹنوں پر پھیلائی۔ اس کا حلیہ ابھی بھی ویسا ہی تھا۔ آٹے سے بھرا ہوا۔

”تمہارے بارے میں بھی اس کی رائے یہی ہے۔“ اس نے بھی نیکپن گھٹنوں پر بچھائی پھر کرسی کو تھوڑا مزید آگے کھسکا لیا۔

”اس کی ایسی کی تیسی۔“ سر جھٹک کر اس نے ڈشز پر سے ڈھکن ہٹائے۔ شینزل ابرو چڑھائے اسے دیکھتی رہی۔ پھر نفی میں سر ہلا لیا کہ اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔

کھانے کی شروعات اس نے شینزل کی پلیٹ سے کی تھی۔ اس کیلئے کھانا نکالنے کے بعد وہ اپنی پلیٹ بھی بھر چکا تھا مگر وقفے وقفے سے اس کی پلیٹ میں سے ہی چیزیں اٹھا کر کھا رہا تھا۔ شینزل کو شروع سے اس کی یہ عادت شدید نا پسند تھی۔ اور وہ شروع سے ہی اس عادت کا بری طرح سے عادی تھا۔ وہ کھانا شروع ہونے سے ختم ہونے تک بولتا گیا تھا۔ وہ بہت بولتا تھا۔ اپنی من پسند ہستی سامنے ہو تو اس کی چابی کبھی ختم ہی نہیں ہوتی تھی اور شینزل اس کی من پسند ہستی کی فہرست میں نمبر ون پر آتی تھی۔

”یہ لیں جی آپ کے ٹیسٹ کے حساب سے گرما گرم چائے۔“ شینزل نے اس کے ہاتھ

سگ تھا ماخود وہ بالکل اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

”یوپی ایس نہیں ہے تمہارے گھر۔“

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے قیس نے سرد آہ بھری۔

”نہیں جناب غریب بندے ہیں ہم، یہ تو امیروں کے چونچلے ہیں۔ ہم کہاں افورڈ کر سکتے ہیں اس طرح کے خرچے۔“

شینزل نے آنکھوں کو گھمایا۔ وہ اور اس کی ڈرامہ بازیاں۔ ”اکیلے رہتے ہو۔“ خاموشی اور اندھیرے سے گھبرا کر اب اس نے بھی بولنا شروع کیا تھا۔

”نہیں جی، چار پانچ بیویاں ہیں انہیں کے ساتھ رہتا ہوں۔“ وہ اسے کڑوی نظروں سے دیکھ کر سیدھی ہوئی۔

”تم سے امید بھی یہی کی جاسکتی ہے۔“ وہ جوں جوں چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی توں توں قیس کن آنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”دیکھ لیں آپ کی امیدوں کا کتنا خیال رکھتا ہوں میں۔“ وہ چڑانے والے انداز میں مسکرا دیا۔

”اب میں چلوں گی، کافی دیر ہو گئی ہے۔“ کلائی موڑ کر وہ وقت دیکھ رہی تھی۔ بس آخری گھونٹ اور۔۔۔

”رک جائیں، یقین کریں جن بھوت نہیں بستے یہاں۔“ پاؤں جھلاتے ہوئے اس کی نظر پتھلتی موم بتیوں پر گئی۔ بارش تاہنوز جاری و ساری تھی۔

”تمہارے ہوتے ہوئے ان کی ضرورت بھی نہیں۔“ چائے ختم ہوئے دو منٹ گزر چکے تھے۔ ہاتھوں کے درمیان قید کپ کی گرماہٹ بھی ختم ہو گئی۔ اس نے جھک کر کپ میز پر رکھا

جیسے ہی وہ سیدھی ہوئی اس کا سر بری طرح چکرا گیا تھا۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا پھر اپنے بھاری ہوتے دماغ کو محسوس کر کے آنکھیں پھاڑے وہ بے یقینی سے قیس کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دیکھنے پر شانے اچکا گیا۔

”تم نے۔“ اس کی آواز بھی بھاری ہونے لگی۔ ”تم نے چائے میں کچھ ملایا ہے؟“ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”میں مجبور تھا۔“ ناقابل یقین سا اعتراف۔

”تم۔۔۔۔۔“ اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں ہاتھ پاؤں بے جان، قیس نے احتیاط سے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے کی جانب لے جانے لگا۔

”ہاں ہاں میں جانتا ہوں بہت برا ہوں۔ لیکن۔۔۔۔۔ اب کیا کر سکتے ہیں جب ہوں تو۔“

☆.....☆.....☆

”خاندان میں شادی ہے۔ تمہارے تائے ابو نے بلوایا ہے چلو گے؟“

رات بھر ڈالہ باری ہونے کے بعد اب جو صبح نکلی تھی وہ اچھی خاصی اجلی اجلی اور روشن تھی۔ سورج بھی آج چمکدار تھا اور کافی پرندے بھی آسمان پر پر مارتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں ماں بیٹے واک پر آئے تھے۔ سنڈے تھا اس لیے آج احد گھر پر موجود تھا۔

”خاندان کی شادی کو کون مس کرے گا لیکن آپ جانتی ہیں میری ابھی ابھی پروموشن ہوئی ہے۔ کام پر بھی تو توجہ دینی ہے نا۔“ اس نے رحمت کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے تھاما ہوا تھا۔ وہ زیادہ دیر چل نہیں سکتی تھیں۔ انہیں گھٹنوں کی بیماری تھی۔

”یہ بھی ٹھیک کہا تم نے، چلو ٹھیک ہے میں منع کر دیتی ہوں۔“ وہ فوراً نتیجے پر پہنچ کر فیصلہ کر بیٹھیں۔ احد نے ادب سے انہیں ٹوکا۔

”ارے نہیں ماں، ایسا نہیں کریں میں وقت نکال لوں گا۔“ رحمت کچھ دیر سستانے کو بیٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ گویا ہوئیں۔

”فری بہت خفا ہے تم سے، وہ اب بھی چاہتی ہے تم گل کے ساتھ شادی کرو۔“ احد نے ماں کی جانب پانی بڑھایا پھر سر جھٹکتے ہوئے گویا ہوا۔

”چاچی کا بھی کوئی حال نہیں انہیں پتہ ہے میری عمر اور گل کی عمر کا، پورے تیرہ سال مجھ سے چھوٹی ہے۔ بالکل بچی ہے پھر بھی ان کی وہی رٹ ہے۔ اسی سسٹم سے تو خائف ہو کر میں یہاں آ بسا ہوں۔ نہ وہاں ہوں گا نہ دل جلے گا۔“ وہ یکدم سے معصوم ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی یکدم سے سرخ پڑتی ناک، ماتھے کی تیوریاں اور پھولا ہوا چہرہ بہت پیارا لگا کرتا تھا۔ رحمت نظروں ہی نظروں میں اپنے بیٹے کے صدقے داری گئیں۔

”اچھا بس تم اب اپنا موڈ نہیں خراب کرو یہ بتاؤ بچی سے کوئی بات ہوئی۔“ احد نے نفی میں گردن کو ہلایا۔ وہ جس پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے وہ ان کی بلڈنگ کے بالکل سامنے تھا۔ اتوار ہونے کی وجہ سے آج وہاں کافی بھیڑ تھی۔

”نہیں، لگتا ہے پھر کوئی اہم کام ہے جس کی وجہ سے فون بند ہے اور اب تک نہیں آئی۔“ ریسٹ وائچ پر نظر گئی۔ سہ پہر کے سوا تین بج رہے تھے۔ رحمت کو برا لگا۔

”حالانکہ اس نے کہا تھا۔ آج وہ پورا دن ہمارے ساتھ رہے گی۔ اس کا کام کوئی اچھا نہیں ہے۔ اتنی مصروف عورت گھر نہیں سنبھال سکتی۔“ بچے اور بچیاں کچھ فاصلے پر بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ ان کی شٹل احد کے قدموں میں آ کر گری جسے اٹھا کر وہ ان کی طرف اچھال رہا تھا۔

”ماں آپ ساس بن رہی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔ رحمت حیران ہوئیں۔

”تمہت نہیں لگاؤ لڑکے، میں اس وقت ماں بن کر کہہ رہی ہوں۔“ انہوں نے اس کے بچ کرنے کے نظریے کو سیدھا کیا۔ اچھا چھ بچوں کی طرح مان گیا۔

”تمہت نہیں ہے تجزیہ ہے جو غلط ہے۔ جو آپ کہہ رہی ہیں وہ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کہہ سکتی تھیں کہ اسے دل رکھنا آتا ہے۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ شیزل کو بھی لے کر چلو گے شادی میں۔“ وہ ماں کی بات پر خوشگوار حیرت میں بولا۔

”یہ خیال کیسے آیا آپ کو اور یوں بھی کیا ہماری برادری اسے قبول کر لے گی۔“ رحمت نے ہاتھ کو جھٹکا پھر نخوت سے گویا ہوئیں۔

”برادری کو تو تمہارا پڑھنا بھی قبول نہیں تھا پھر بھی تم موجود ہونا اس میں، اسی طرح وہ شیزل کو بھی مان لیں گے۔ نہیں بھی مانا تو ہمیں کون سا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی جینی ہے ان کی نہیں۔“ وہ اپنی ماں کی بات سے محظوظ ہوا تھا۔ لبوں سے جو الفاظ جھڑے تھے وہ بھی خوبصورت سی تحریر میں ڈوبے تھے۔

”ویسے ماں، میں نوٹ کر رہا ہوں شہر کی ہوا آپ کو اچھی خاصی لگ چکی ہے۔ کچھ زیادہ ہی رنگ چڑھا لیا ہے آپ نے یہاں کا۔“ رحمت نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کے ہاتھ پر چپت لگائی۔ جب بول رہی تھیں تب بھی ان کے لبوں پر شرماہٹ تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جہاں کا طرز اچھا تو بس وہ اچھا اور یوں بھی ہمیں اچھائی کو پکڑنے اور برائی کو چھوڑنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ظالم ہے وہ شخص جو برائی کے درمیان رہنے کے باوجود برائی کو برائی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔“ اس نے رحمت کے

گردشانے پھیلا کر انہیں خود سے لگالیا۔ باتوں کا لامتناہی سلسلہ تھا جو ان ماں بیٹے کے درمیان شروع ہو چکا تھا۔ ان کا ہر سنڈے اسی طرح گزرتا تھا۔ پورے ہفتے کی ان کہی باتیں آج کے دن باہر آتی تھیں۔ ان کی بلڈنگ کے پاس موجود یہ پارک اور درخت تلے بچھا یہ سنگی بیچ اس بات کا گواہ تھا کہ ایک بیٹا اس دن اپنی ماں سے ڈھیر ساری باتیں کیا کرتا تھا۔ اور ایک ماں گھنٹوں تک اپنے بیٹے کو صحیح غلط کا تفرق سمجھاتی رہتی تھی۔ پارک میں موجود درخت اور بیچ شدت سے اتوار کے دن کا انتظار کرتے تھے۔ انہیں شدت سے تین بجے کا وقت ستاتا تھا۔



مصبح کے ہاتھ میں سفید کاغذ تھا جس پر دو سطر لکھی ہوئی تھیں۔ ان کے بیٹے نے لٹھے کی طرح سفید چہرے کے ساتھ کاغذ کو ان کے ہاتھ سے لیا جس پر تحریر تھا۔
 ”چونکہ مجھے یہ شادی نہیں کرنی تھی اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ تحریر پرنٹ صورت میں تھی۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین کی بورڈ سے جدا تھی اور اس کے ساتھ پرنٹر اٹیچڈ تھا۔ ایسا مصباح نے سب کو بتایا تھا۔ یہ بہت بڑا جھٹکا تھا جو جہانگیر سے زیادہ اس کے بیٹے کو لگا تھا۔ برین ہیمر تاج اتنا شدید ہوا تھا کہ شادی کو کچھ وقت کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔ عزت تار تار ہونے سے بچ گئی۔ ان کے بیٹے کی حالت ایک اچھی کورسٹوری کے طور پر کام آئی تھی۔ لیکن چہ مگوئیاں پھر بھی جاری و ساری رہیں۔ شکوک دل میں رہے۔ پورے ایک ہفتہ بعد وہ ٹھیک ہوا تھا۔ پورے ایک ہفتہ بعد وہ اپنے باپ کے سامنے ان کی سٹڈی میں موجود تھا اور فقط وہ ہی نہیں تھا بلکہ نین کے ہونے والے سر اور اس کا ہونے والا شوہر بھی موجود تھا۔

”دیکھیں جہان صاحب، آپ نے ہم سے سیٹھ صاحب کے ٹھیک ہونے تک کا وقت مانگا تھا اور اب وہ ماشاء اللہ سے بالکل تندرست ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں ہماری دوستی اب

مستقل رشتہ میں بندھ جائے اور یہ اس چیز کیلئے بالکل صحیح وقت ہے۔“ جہانگیر نے سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھے اپنے بیٹے کو دیکھا جو دو دن سے ٹھیک تھا اور دو دن سے ہی خطرناک حد تک خاموش۔

”آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن۔۔۔“ ان کا لیکن مدہم اور شرمندگی سے پر تھا۔
 ”لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ نین کچھ عرصے کیلئے۔“ ان کے بیٹے نے بڑے ہی غلط وقت پر بڑے ہی کڑوے انداز میں بڑا ہی دل دہلانے والا انکشاف کیا تھا جو کہ یہ تھا۔
 ”انہیں سچ بتادیں بابا۔“ پھر اس کی پتھری آنکھیں دونوں باپ بیٹے پر جا ٹکیں۔“ کہ وہ مر چکی ہے۔“ اس کی آواز سرد اور زہر میں بجھی تھی۔ جہانگیر کو گہرا صدمہ لگا۔
 ”سیٹھ صاحب۔“ وہ پھر ان کی بات قطع کر گیا۔

”چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بابا، ہمیں کل ہی نیوز کانفرنس کرنی چاہیے کہ۔“ اس نے ایک بار پھر شا کڈ سے باپ بیٹے پر نظر ڈالی اور بات مکمل کی۔“ مخالف پارٹی کے بندوں نے سیلون سے آتے ہوئے آپ کی بیٹی پر فائرنگ کر دی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“ جہانگیر کے شانے ڈھلک چکے تھے۔ آنکھوں میں سوال تھے۔ بے تحاشہ سوال۔

”یہ سب کیا ہے جہانگیر، حقیقت کیا ہے؟“ ان کا دوست، ان کا سب سے بہترین دوست اس روح فرساں خبر پر بوکھلا گیا تھا۔ بھلا یہ ممکن تھا ان کا دوست ان سے کچھ چھپا جائے۔ ناممکن۔

”ابھی جو آپ نے سنی ہے وہی حقیقت ہے۔ آپ ہمارے آبائی قبرستان جا کر چیک کر سکتے ہیں۔ وہاں آپ کو ایک کتبہ پر سید جہانگیر بخاری کی بیٹی کا نام نظر آ جائے گا۔“ وہ دو دن بعد بولا تھا اور اس طرح بولا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا یہ وہی ان کا سمجھدار، بااخلاق اور تمیزدار بیٹا

ہے۔ لگتا ہی نہیں تھا یہ وہی ہے جسے اپنی بہن سے پاگلوں کی حد تک پیار ہے۔ جو اپنی بہن کا نام لیتے نہیں تھکتا تھا آج اسے ”جہانگیر کی بیٹی“ اور ”وہ“ کہہ کر بلارہا تھا۔ وہ اس سے نفرت کا برملا اظہار کر رہا تھا۔

”جہان تم نے اتنی بڑی بات کیونکر چھپائی، تم نے اینٹ سے اینٹ کیوں نہیں بجا دی۔ تم نے دشمنوں کو اتنے دن کا وقت کیوں دیا۔ ہماری بچی گئی ہے یا یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔“ ان کے دوست کو جہانگیر کے گرتے وزن اور آنکھوں کے حلقوں کی وجہ اب سمجھ آئی تھی۔ سیٹھ صاحب کی خاموشی، اس کی طویل بیماری اور اس گھر میں موجود سوگ سا عالم اب بول اٹھا تھا کہ یہاں کیا قیامت آ کر گزر چکی ہے۔ ان کا دوست اب سمجھا تھا۔ غلط سمجھا تھا۔

”مجھے تو یقین نہیں آتا نین اتنی جلدی جاسکتی ہے۔ میں نے کیا کچھ نہیں سوچ رکھا تھا اس کے اور اپنے لیے۔“ جہانگیر کے دوست کا بیٹا آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا واقعی بہت بڑا نقصان ہوا تھا۔

”کچھ لوگوں کو خوشیاں اس نہیں ہوتیں اس لیے وہ چلے جاتے ہیں۔“ جہانگیر کو اپنے بیٹے کے لفظوں سے زیادہ اس کے بدلے ہوئے انداز سے خوف آ رہا تھا۔ سترہ سال کا وہ خوب روڑکا جو ہنستا تھا تو بہاریں کھلا دیتا تھا۔ جس کی پرسنالٹی میں گھلا رعب و دبدبہ خود بخود اسے ”سیٹھ صاحب“ کا خطاب دے دیتا تھا۔ جس کے چلنے کا انداز شاہانہ تھا اور بولنے کا دلدارانہ، جو بلا کا نرم دل اور دوست فطرت کا مالک تھا۔ وہ اب کہیں نہیں تھا۔ وہ اب وہاں نہیں تھا۔ ان کے سامنے جو بیٹھا تھا۔ وہ کوئی اور ہی تھا۔ کچھ اور ہی تھا۔ انہیں ڈر لگا بہت زیادہ ڈر۔

اور ان کا ڈر بجا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کے بیٹے کی پوری شخصیت بدل چکی تھی۔ وہ کچھ سے کچھ بن گیا تھا۔ جس نے کبھی نوکروں سے اونچی آواز سے بات نہیں کی تھی اب وہ

ان کے ساتھ ساتھ اپنی ماں سے بھی بدکلامی کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے لفظوں سے تہذیب ہٹ گئی تھی۔ اس کے دل سے لحاظ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہ میں عورت کی وقعت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی اخلاقیات پتہ نہیں کہاں جا سوئی تھی۔

”وہ ایک بچہ ہے۔ آپ کس طرح اس پر ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔“ جہانگیر کی بات کو نظر انداز کیے وہ ہونٹوں میں پکڑی سگریٹ کو شعلہ دکھا رہا تھا۔ ایک عرصہ سے وہ سگریٹ اور دوسری منشیات کا استعمال کر رہا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے جہانگیر جان گئے کہ یہ کوئی عام سگریٹ بالکل بھی نہیں ہے۔

”جب میں نے اسے منع کیا مجھے جوس کی طلب نہیں ہے پھر وہ کیوں اسے رکھ کر جا رہا تھا۔ اور آپ نے انہیں حویلی میں کیوں اکٹھا کیا ہوا ہے نکالیں انہیں یہاں سے باہر۔“ اس نے تحقیر سے گلاس کے ٹکڑے چنتے روتے ہوئے بچے کو دیکھ کر کہا۔ جہانگیر کا ضبط اب جواب دے رہا تھا۔

”آپ چھوٹی چھوٹی بات پر ہانپہر ہونے لگ گئے ہیں اور یہ یہاں کا ملازم نہیں ہے۔ ملازم کا بیٹا ہے۔ آپ کی محبت میں کھنچا چلا آتا ہے۔ آپ تو سب کو بھول گئے ہیں لیکن کوئی آپ کو نہیں بھولا ہے۔“ وہ زچ سے انداز میں بیڈ کی پانکتی سے منسلک کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ انگلیوں میں سگریٹ دبی تھی اور کمرے میں دھواں۔

”میں لیکچر سننے یہاں پر نہیں آتا اگر ایسا ہی چلتا رہا تو میرا یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔“ اس نے بھی اعلان کیا تھا۔ بغاوت کا اعلان۔

”کل ایک لڑکی آئی تھی۔“ اس نے ٹھاہ کی صورت میں اپنے ہاتھ جوڑے، جڑے ہوئے ہاتھوں کا پیغام تھا وہ مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔ مگر جہانگیر نے پہلے والی بات کی طرح ان جڑے

ہوئے ہاتھوں کو بھی اگنور کیا۔ وہ کہہ رہے تھے جو یہ تھا۔

”آپ کا پوچھ رہی تھی۔ وہ کون تھی؟“ بچہ سارے کانچ چن کر ٹرے تھامے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ ان کے بیٹے نے سگریٹ کا گہرا کش بھرا جو ختم ہو چکی تھی۔ آخری کش تھا اس لیے طویل تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور بچے ہوئے ٹکڑے کو میز پر رکھی ایش ٹرے میں پھینکے لگا۔ سگریٹ پینے کے دوران جتنی بھی راکھ تھی وہ کارپٹ پر اس کے قدموں میں گری گئی تھی۔ ایش ٹرے میں بڈ کو پھینکنے کے بعد اس نے انگلیوں کو جھاڑا پھر حتمی انداز میں گویا ہوا۔

”وہ طوائف تھی۔“ اس کے جملے کی دیر تھی۔ جہانگیر کا ضبط ٹوٹ گیا۔ اسے شانے سے تھام کر جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب کیا پھر پوری قوت سے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس کے چہرے پر چھاپ دیں۔ تھپڑ اتنی شدت کا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ تحیر کی انتہا پر پہنچ کر اس نے جھکا ہوا چہرہ اٹھا کر پھٹی ہوئی آنکھوں سے باپ کو دیکھا۔ اس کی زندگی کا پہلا تھپڑ تھا جو اسے اپنے باپ سے پڑا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا تھپڑ تھا اور شدید تھا۔

”اس گونج کو یاد رکھو آپ، یہ دوبارہ بھی سنائی دے سکتی ہے اگر مجھے دوبارہ ایسی کوئی حرکت نظر آئی تو۔“ گال پر ہاتھ رکھے رکھے وہ سیدھا ہوا تھا۔ اس کی روح تارتا تھی۔ آنکھوں میں لہو اتر آیا۔ چند ثانیے کیلئے ایک سکوت سا طاری رہا تھا۔ وہ لب بھینچے اپنے باپ کو سن رہا تھا جو مزید کہہ رہا تھا۔

”بدعا ہو تم۔۔۔۔۔ میرے لیے۔ تم جیسی اولاد پیدا ہوتے ہی مر جائے تو بہتر ہے۔ یہ مجھے حلیمہ کا صبر لگا ہے جو میں آپ اپنی اولاد کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہوں۔ ایک گھر چھوڑ گئی اور ایک۔“ وہ کچھ بہت برا کہتے کہتے رکے تھے۔ وہ بیٹا جس پر کبھی انہیں فخر تھا آج انہیں بری

جسمانی طور پر اذیت دے رہا ہے۔ وہ جانور بن رہا ہے۔ اس کے لبوں میں قید سگریٹ سے جھڑتی راکھ اس کے پاؤں کی انگلیوں پر گر کر انہیں جلا رہی ہے اور وہ پھر بھی ٹھس سا بیٹھالا میٹر کو جلا بجھا رہا ہے۔

”نہیں کرو۔“ اس نے بندھے ہوئے ہاتھوں اور بھیگے چہرے کے ساتھ التجا کی، التجا رد کر دی گئی۔ راکھ ایک بار پھر سے پیروں کی انگلیوں پر گری تھی۔ درد کی شدت ایک بار پھر سے پوری قوت کے ساتھ بدن میں دوڑ گئی۔

”رحم، رحم۔“ وہ رو رہی تھی۔ گڑ گڑا رہی تھی۔ کون تھا جو اس کی سنتا۔ کون تھا جو اسے سمجھتا۔ کون تھا جو اس کیلئے تڑپتا۔ اس کی تڑپ بھی خود کیلئے تھی اور بھیک بھی خود کیلئے۔

”میرے ساتھ ایسا مت کرو، کسی اور کی نفرت مجھ پر مت نکالو۔“ اس نے باقاعدہ گڑ گڑانا شروع کیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کی سٹی تب گم ہوئی جب اس شخص نے سگریٹ کو منہ سے نکال کر انگلیوں میں دبایا پھر آنکھوں میں عجیب سا تاثر در کر وہ سگریٹ اس کے پاؤں پر سیدھی رکھ دی۔ چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ دو تین گہرے گہرے سانس بھرے پھر برق رفتاری سے اپنے پاؤں کو ٹٹولا وہاں مندمل سے نشان تھے۔ اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔ یہ خواب، یہ حقیقت میں ڈوبا خواب اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا، کبھی بھی نہیں۔ دونوں ہاتھوں میں سر کو گرا کر بیٹھ گئی پھر کچھ یاد آنے پر یلخت چہرہ اٹھایا اور آنکھیں پھاڑ کر اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ آرام دہ بستر میں تھی۔ سفید مخملی کمفرٹر اس پر ڈالا تھا۔ سائیڈ لیمپ کی زرد پھمکی روشنی کمرے کو منور کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس نے بھاری کرٹز کی طرف گردن گھمائی جو کھڑکیوں پر اچھے سے ڈالے تھے۔ اس کے کمرے کے پردے گرے رنگ کے تو بالکل بھی نہیں تھے۔ اسے یہ بات یاد آئی تھی۔ ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ اس

نے مزید اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ اس کے کمرے میں دیوار گیر ایل ای ڈی بھی نہیں تھی۔ وہاں گٹار بھی نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے کمرے کا رنگ فورسٹ گرین بالکل بھی نہیں تھا نا ہی وہاں ایل ای ڈی کی ساتھ والی دیوار پر جنگل بنا ہوا تھا۔ بنانے والے نے پینٹنگ اتنی مہارت سے کی تھی کہ وہ حقیقی جنگل کا تاثر دے رہا تھا۔ جہاں بڑے بڑے درخت تھے۔ گرے ہوئے ٹہنے اور سوکھی ہوئی پتیاں۔ وہ کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھی۔ جونہی کمفر ٹراس پر سے سرکا وہ اپنے کپڑوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ یہ کپڑے اس کے نہیں تھے۔ یہ کپڑے توقیس کے تھے۔ جھماکے کے ساتھ کل رات کے سارے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر سر گرایا تھا۔ غصے کی تیز لہر اس کے دماغ میں اٹھی تھی جس کے تحت اس نے کمفر ٹر کو جھٹکے سے خود پر سے ہٹایا اس طرح کے وہ آدھا بیڈ پر اور آدھا زمین میں جا گرا۔ سلیپر ز پہننے کی زحمت کیے بنا وہ دروازہ دھاڑ سے کھول کر باہر آئی تھی۔ غلطی کی اسے تھوڑا صبر کرنا چاہیے تھا یہی کوئی پانچ منٹ تک کیونکہ سامنے کا جو منظر تھا وہ شدید شرمندگی والا تھا۔ میں نے کہا انتہا کی شرمندگی والا۔

قیس، کمال، ماریہ، سعد اور نشاء کو دروازے کی جانب لے کر بڑھ رہا تھا جب یکدم دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ سب بیک وقت مڑے تھے اور مڑتے ہی اپنا منہ حیرت کے غوطوں کے سبب کھول گئے تھے سوائے ایک کے۔ جھٹکا شدید تھا اس لیے اثر بھی شدید ہوا۔ تینوں کے تاثرات ناقابل بیان سے تھے۔ نیند کے خمار سے پر آنکھیں، بکھرے ہوئے بال اور مردانہ کپڑوں میں کھڑی وہ انہیں اپنی میڈم نہیں لگی تھی۔ وہ کوئی اور تھی جو ان کے سامنے تھی۔ کون پتہ نہیں؟ ان تینوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے سے ہمکلام ہونے کے بعد پھر سے نظریں شرمندگی کے مجسم پر ڈال لیں جس سے ان کے ”سر“ مخاطب تھے۔

”شیزل، آپ اندر جائیں، آپ لوگ آئیں۔“ آنکھوں میں تنبیہ لیے وہ اس پر نظر ڈالتا ہوا مڑ گیا۔ اس کی تقلید میں وہ تینوں بھی مڑے تھے۔ مڑنے سے پہلے ان کی نظریں پھر سے شیزل پر تھیں جو کہہ رہی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے۔ کس قسم کا منظر ہے یہ؟“

قیس نے مین ڈور بند کیا پھر آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیتا ہوا مڑا، اس نے دیکھا شیزل کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے کان بھی سرخ ہو چکے تھے۔ اس کا دل ڈوب مرنے کو چاہ رہا تھا یہ وہ جان گیا۔ کیونکہ ان دونوں کا رشتہ ان دونوں کو معلوم تھا۔ ان چاروں کو نہیں۔

”آپ کو اس طرح باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ کم از کم کوئی شال ہی لے لیتی۔“ صوفے کی طرف بڑھ کر اس نے جھک کر گرم مفلرا اٹھایا پھر اس کے قریب آ کر اس کے شانوں کے پیچھے سے ہاتھ گزار کر اسے اوڑھا دیا۔

”یعنی تمہیں اس بات سے قطعی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے جبکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔“ قیس نے شانے اچکائے پھر جتانے والے لہجے میں گویا ہوا۔

”اور مجھے فرق کیوں پڑے گا۔ کون ہیں وہ لوگ۔“ شرمندگی ختم ہو رہی تھی۔ غصہ پھر سے عود کر آیا۔ اسے کل رات کے سارے مناظر من و عن یاد تھے۔ وہ اس بات پر آج قیس سے جھگڑنا چاہتی تھی اور وہ جھگڑ رہی تھی۔

”میں ان لوگوں کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ مجھے انہیں فیس کرنا ہے جو کہ اب مجھے مشکل لگ رہا ہے۔ ان کی نظریں ان کی سوچوں کی غمازی تھیں۔ تم مرد ہو تمہیں واقعی کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میں، میں بد قسمت سے اس معاشرے کی پیداوار ہوں جو ایک مرد اور عورت کو تنہا دیکھ کر اپنے ذہنیت کے حساب سے مفروضے قائم کر لیتے ہیں۔“ قیس نے ٹراؤزر کی جیبوں

میں ہاتھ اڑسائے۔ اس کے چہرے کی طرح اس کی نظریں بھی سپاٹ ہو چکی تھیں۔

”آپ کا یہاں ہونا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ یہ آپ کا گھر ہے، میں آپ کا ہوں۔ بات ختم۔“ شیزل کے لبوں پر تضحیکی مسکان آ کر غائب ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی بھری تھی۔

”تم میرے کوئی نہیں ہو، میں تم سے اپنا ہر رشتہ ختم کر چکی ہوں اور مجھے ایک بات بتاؤ تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے نیند آور دوا دینے کی، کیا سوچ کر تم نے یہ حرکت کی ہاں؟“ قیس نے ایک نظر اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا جن میں تھوڑی تھوڑی نیند تو اب بھی موجود تھی۔ پھر اس نے گہرا سانس بھرا بھر کر کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوا۔

”پہلی بات کا جواب دوں یا دوسری کا۔“ اس کے لبوں پر شرارتی مسکان تھی۔ شیزل کا خون خوا مخواہ کھول اٹھا۔ اس نے مزید کچھ کہنے کی بجائے قدم دروازے کی طرف بڑھا لیے۔ قیس اس کا ارادہ بھانپ گیا دوڑتے ہوئے اس کے راستے میں حائل ہوا اور اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”اچھا ایم سوری، میری غلطی ہے میں مانتا ہوں۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ کئی بار میں نے آپ کو کام کے دوران اونگھتے دیکھا ہے۔ آپ جمائیاں روک رہی ہوتی ہو۔ دن رات کام میں مصروف رہتی ہو۔ آپ کی آنکھوں کے گرد حلقے مجھے بتا گئے کہ آپ میں نیند کی کمی ہے۔ مجھے حیدر انکل نے بھی اس بارے میں بتایا تھا بس تب سے میں موقع کی گھات میں تھا۔ اور کل مجھے موقع مل گیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً آپ نے چلے جانا تھا۔ اب دیکھو کم از کم تھوڑی بہت تو نیند پوری ہو گئی۔“

وہ یکدم مڑ کر مین ڈور کھولنے لگی تھی۔ قیس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ

مضبوطی سے دروازے پر جما لیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ یہاں سے فرار چاہتی ہے۔ اس سے فرار چاہتی ہے۔ اسے دکھ ہوا، ناقابلِ بیاں دکھ۔

”تم اور تمہاری فضول کی تاویل میں، ہٹور سے۔“ وہ غصے سے غرائی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کو جانا ہے تو چینیج کر کے جائیں۔ میں نے آپ کے کپڑے ڈرائے کلیں کروا دیے ہیں۔“ دکھ سے بجھی آواز میں کہنے کے بعد وہ کچن میں چلا گیا وہاں سے اس نے ایک روسٹڈ ایگ اٹھایا، اس کے بائٹ لیتا ہوا وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ موبائل کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ کر اس کے نقوش کو مزید واضح کر رہی تھی۔ شیزل نے وقت دیکھا شام کے پانچ بج رہے تھے۔ پھر اس نے خود کو کہتے سنا۔

”میں تم سے نفرت کرنا چاہتی ہوں پر کر نہیں پاتی کاش میں ایسا کر سکتی۔“ سیل فون یوز کرتے کرتے وہ دبی مسکان لبوں پر لانے کے بعد دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کھڑی انتظار کرتی رہی کہ اب وہ کچھ کہے اب کہے لیکن اس نے کچھ بھی نہیں کہا یونہی ٹھس بیٹھا رہا۔

”قاتل کون ہے قیس؟“ طویل وقفے کے بعد اس نے سوال کیا تھا۔ قیس نے پلکیں اٹھائیں اس کے چہرے کو کھوجا پھر لا پرواہ سا گویا ہوا۔

”ظاہر ہے میرے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔“ شیزل کا دل بھر رہا تھا مگر وہ کنٹرول کر رہی تھی۔ اس کا اشارہ کس طرف تھا وہ اچھے سے جانتی تھی۔

”اگر تم نکلے تو میں تمہارے ان کاؤنٹر کا آرڈر دے دوں گی۔“ وہ جھٹکے سے مسکرایا پھر نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے فون پر نظریں جمائے گویا ہوا۔

”مجھے یقین ہے اس بات کا آپ ایسا کر لیں گی۔ مگر اگر آپ قاتل کے ساتھ کسی بھی طرح سے ملوث ہوئیں تو میں آپ پر ایک آنچ بھی نہیں آنے دوں گا ٹرسٹ می۔“ شیزل کا وہاں

کھڑے کھڑے ماتھا ٹھنکا، وہ آخری جملے پر اس کے آنکھ مارنے کی وجہ سے ششدر تھی۔
 ”کیا مطلب ہے اس بات کا؟“ قیس نے فون کو کان سے لگایا۔ وہ کسی کا وائس میسج متبسم لبوں کے ساتھ سننے کے بعد کہہ رہا تھا۔

”خط عشق آپ کو آتے ہیں مجھے نہیں۔“ شینزل نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔
 دروازے کے پاس دیوار سے منسلک اسٹینڈ پر ایک سٹیل کا پرندہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے پرندہ اسٹینڈ سے ہٹایا اور کھینچ کر اس کا نشانہ لگایا۔ وہ سٹیل کا پرندہ قیس کے بازو سے مس ہو کر صوفے پر گر رہا تھا۔

”آہ۔۔۔ سس۔۔۔ جنگلی عورت۔ یہ کیا حرکت ہے۔“ وہ اپنا بازو مسل رہا تھا۔ اسے واقعی چوٹ لگ چکی تھی۔ ایسا اس کے چہرے پر پھیلا درد دیتا رہا تھا۔
 ”اگلی بار شوٹ کروں گی اگر اس طرح کی بکو اس کی تو۔“ وہ دروازے کے ساتھ پڑے اسٹینڈ سے اپنا کوٹ اٹھا کر ہاتھ پر ڈالتی وہاں سے گئی تھی۔ مین ڈور کو اس نے جارحیت سے بند کیا تھا۔ قیس نے اپنے بازو پر نظر ڈالی۔ وہاں منہی منہی خون کی بوندیں اکھٹی ہو چکی تھیں۔
 ”ایک اور زخم۔۔۔ آہ، میری قسمت۔“

☆.....☆.....☆

”سر کہاں جا رہے ہو؟“

آنکھوں پر سوئمنگ گگلز اور پرنٹڈ شارٹس میں ملبوس وہ لڑکا گارڈ کی آواز پر مڑا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے ہی اس نے سوئمنگ کی تھی اور اب پھر وہ پول میں اترنے کی تیاریوں میں تھا۔
 وہ اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ فارم ہاؤس پر تھا اور جوان کا سوئمنگ پول تھا وہ سوئمنگ پول کم ایک دریا زیادہ لگتا تھا۔ کیونکہ پانچ ایکڑ کی زمین پر پھیلے اس فارم ہاؤس میں چار ایکڑ کا

ان کا سوئمنگ پول تھا۔ جو بہت بہت گہرا تھا۔ اس کے پانی کی لہروں کے سائے ہر وقت فارم ہاؤس کی درودیوار پر پڑتے رہتے تھے۔ وہ لڑکا انہی سایوں میں کھڑا کہہ رہا تھا۔

”میرے گیٹ اپ سے تم کیا اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔“ تنی ہوئی ابرو کے ساتھ اس نے ایک پریٹڈ کپڑا اپنے سر پر باندھا اور گارڈ کی پرواہ کیے بنا پانی میں ڈبکی لگا دی۔ اس کی شارٹس کے ساتھ چھوٹی سی ڈبیا بندھی تھی جو اس کا واٹر پروف میوزک سسٹم تھا۔ کانوں میں ایربڈز تھے اور پاؤں میں بطخ کی طرز کے پلاسٹک، وہ پرفیشنل انداز میں سوئمنگ کرتے ہوئے گہرائی میں اتر رہا تھا جب اسے اپنی دائیں طرف ایک سیاہ وجود نظر آیا۔ اس نے اپنی آئی بالز کو اس جانب حرکت دی۔

منہ میں آکسیجن پائپ کو پکڑے وہ شک کی تصدیق کیلئے پورا مڑ گیا۔ وہ سیاہ ہیولا کوئی اور نہیں ایک انسان تھا جو ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے چمیر کر رہا تھا۔ لڑکے نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ریموٹ ہے جس سے پانی کا ٹمپرچر کم یا زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ سردیاں تھیں۔ اسے سوئمنگ کی کرویونگ ہو رہی تھی۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ آخر کو ان کے فارم ہاؤس میں بنایا گیا سوئمنگ پول اسی کرویونگ کیلئے ہی تو ہے۔ سردی ہے تو کیا ہوا، پانی کو نیم گرم کر دیا جائے گا تاکہ ایک بیورو کریٹ کا بیٹا اپنی خواہش کو پورا کر سکے۔ وہ خواہش اس کی آخری خواہش ہوگی اسے اندازہ نہیں تھا۔ پانی میں موجود وجود ریموٹ کے ”کولڈ“ بٹن کی طرف دائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے گلوں میں چھپے ہاتھ، آنکھوں پر چشمہ اور منہ پر ماسک اس کی پہچان مشکل بنا رہا تھا۔ وہ لڑکا اس انسان کا ارادہ بھانپ کر اوپر کی طرف جانے کیلئے پاؤں مار رہی رہا تھا کہ ایک مضبوط شکنجے میں اس کے پاؤں کو جکڑ دیا گیا۔ ایک جھٹکڑی اس لڑکے کے پاؤں میں تھی اور ایک اس انسان کے ہاتھ میں۔

”چھوڑ مجھے، کون ہوتا ہے؟“ لہروں کی صورت اس کی آواز پانی میں گونجی تھی۔ سوئمنگ پول کے باہر بیٹھا گارڈ طویل ڈبکی کے سبب تھوڑا سا لرٹ ہوا۔

”اب بھی نہیں سمجھے، تمہاری موت ہوں یا۔“ پانی کا ٹمپر پچر ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بخ برف کی طرح ہونے لگا۔

”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ اس پر جھپٹ پڑا تھا۔

قبل اس کے لڑکے کے ہاتھ اس کے منہ سے آکسیجن ماسک ہٹاتے اس نے ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پر جڑ دیا تھا۔ وہ بلبلا اٹھا۔

”یہ تو میں تمہیں کہنے والا ہوں۔“

اس انسان نے لڑکے کے منہ سے پائپ کھینچ لیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔ اوپر سے نیلا دکھتا پانی اندر سے سیاہ دکھ رہا تھا۔ گہری خطرناک سیاہ لہریں تھیں جس کے اوپر کچھ بھی نہیں تھا۔ لڑکے کو اپنا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے ہاتھ مار کر اس سے پائپ کھینچنا چاہا مگر بے سود۔ پانی کا رسیا پانی سے خوف کھانے لگا۔

”سر، آپ نیچے ہیں۔۔۔ سر۔“ گارڈ نے پانی پر آتی برف کی پتلی سی تہہ کو چونک کر دیکھا۔ اس کے دماغ نے فوری طور پر کام کیا تھا۔ وہ ایک پولیس اہلکار کو اشارہ دیتا اسے پانی میں اترنے کو کہہ رہا تھا۔ پانی پر موجود باریک سی برف کی تہہ بتا گئی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے بھی وہ دونوں پانی میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔

”چھوڑ دو مجھے، میں۔۔۔ میرا سانس۔“ دن تھا۔ سورج ندارد تھا تبھی اتنی گہرائی میں رات کا گماں ہو رہا تھا۔ وہ مچل رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ اس انسان نے اسے جھٹکے سے کھینچ کر اپنے قریب کیا پھر اس کی گردن کو گرفت میں لے کر کچھ کہنے ہی والا تھا جب لہروں کے تلاطم

نے اس پر واضح کر دیا کہ پانی میں کوئی اور بھی اتر رہا ہے۔ اترنے والوں کی تعداد ایک نہیں زیادہ ہے۔ تبھی اس نے جلدی سے اپنی جیب سے تیز دھار چھری نکالی اور یکے بعد دیگرے تین وار اس لڑکے پر کر دیے۔ سیاہ پانی میں سرخ خون پھیل چکا تھا۔ آنے والے برق رفتاری سے نیچے آ رہے تھے۔ اس نے ریموٹ کو پانی میں چھوڑا پھر اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے چابی نکالی۔ اس کے سر کے اوپر خون پھیل چکا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا اس خون سے کچھ ہی فاصلے پر وہ لوگ موجود ہیں۔ برق رفتاری سے ہتھکڑی اس لڑکے کے پاؤں سے کھول کر وہ پھیلے ہوئے خون کے نیچے سے دائیں جانب بڑھنے لگا۔ اس دوران ایک آدمی اس لڑکے کو تھام چکا تھا اور دوسرا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے سوئمنگ آتی تھی بہت اچھی آتی تھی اس لیے وہ تیز تھا۔ وہ آگے نکل گیا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ کیوں آگے نکلا ہے اور وہ آدمی کیوں پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اس کا ہاتھ پھولا ہوا تھا۔ ہاتھ کی چار انگلیاں تو سیاہ گلوں میں چھپی تھیں مگر انگوٹھا کپڑے میں نہیں آیا تھا تبھی وہ ننگا تھا۔ اس پر موجود سوجن اور پٹی بتا گئی وہ کون تھا۔ وہ کرائم ونگ سے تعلق رکھتا قیس الہی تھا۔ پکڑنے والے نے نہیں پکڑا۔ صدمے والا صدمے میں ہی رہا۔

”اس ہاسپٹل میں مجھے ہائی الرٹ فورس چاہیے۔ اس لڑکے کو کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ لڑکا مر گیا تو سمجھو تمہاری وردی گئی شینرل قیس الہی۔“ حیدر نے وارن کرنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے پنچوں کے بل جھٹکے سے اٹھ کر بولی۔

”یس سر۔“ حیدر نے چاروں طرف موجود پولیس اہلکاروں کو دیکھا پھر نظر یونیفارم میں موجود اس لڑکی پر پڑی جس کیلئے ان کے دل میں کچھ لحاظ تھا مگر اب وہ لحاظ ختم ہو رہا تھا۔ اب وقت مشکل ہو رہا تھا۔

”اور ہاں اس کے بعد تم پر انکوائری بٹھائی جائے گی۔ ہم دیکھیں گے ان خطوط کا کس حد

تک تم سے تعلق ہے۔ اگر یہ پرسنل ایک کی بنا پر ہوا تو معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں تمہیں خود کو بے گناہ ثابت کرنا ہوگا اگر تم ایسا نہ کر سکی تو عدالت تمہیں سزا دے گی۔“ اس نے پھر مخصوص انداز میں انہیں سیلوٹ مار کر ”لیس سر“ کہا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر تھا۔ وہ جانتے تھے۔ ان کے چہرے پر فکر تھی۔ وہ جانتی تھی۔

”ابھی آپریشن چل رہا ہے۔ چانس ہے اس لڑکے کے بچنے کا لیکن میں پھر کہہ رہا ہوں شینزل اسے کچھ ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ اس کا باپ امریکہ میں ہے۔ اس نے طوفان مچایا ہوا ہے۔ دعا کرو اور نظر رکھو۔ ہم۔“ اس بار وہ اس کے شانے پر تھکی دے کر آگے بڑھ گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی شینزل نے گہرا سانس چھوڑا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے سر سے کیپ اتار رہی تھی۔ وہ ہلال پر نظریں ڈال کر سوچنے لگی۔ وہ کب بھلا اس فیلڈ میں آنا چاہتی تھی؟ دماغ نے زیادہ تر دہ نہیں کیا جواب فٹ سے آیا تھا۔

”کبھی بھی نہیں۔“ ہاں وہ کبھی بھی اس فیلڈ میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ اسے اس کی ضرورت اور مجبوریاں یہاں تک لے آئی تھیں۔ پہلے پہل یہ جاب ایک بوجھ تھی۔ پھر وہ پشیم بن گئی اور اب عرصے بعد وہ پھر سے بوجھ کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ لڑکے کی جیب سے برآمد ہوا پلاسٹک پیپر اور اس پر لکھی تحریر اس کی سیاہ آنکھوں میں آن سائی۔

”خط عشق بہت ہی محبت کے ساتھ اس اپرا کیلئے جسے قدرت نے بڑی فرصت سے تراشا ہے۔ جس کا حسن مبہوت کر دینے کیلئے کافی ہے۔ جو دل میں بستی ہے اور بس وہیں بستی ہے۔ اس حسن صورت کیلئے اس ناچیز کی طرف سے ایک مردہ مورت کا نذرانہ، امید ہے آپ کو یہ تحفہ دل سے بھائے گا۔“ اس خط میں اینڈ میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ پورا پورا نام۔ واضح نشانی، کھلا اشارہ۔

”کون ہو تم اور کیوں کر رہے ہو یہ سب۔“ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب ایک پولیس اہلکار اس کے قریب آیا۔

”میڈم مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ شیزل نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تھکن تھی۔ وہ اسی تھکن زدگی کے ساتھ گویا ہوئی۔

”ہم، بولوسن رہی ہوں۔“ وہ پولیس اہلکار ہچکچایا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

”نہیں میڈم، یہاں نہیں آپ ادھر کونے میں آ سکتی ہیں۔“ وہ چونک گئی۔ چند لمحے اسے دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ستون کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر اہلکار اپنی جیب سے واچ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ شیزل ٹھٹھکی۔

”میڈم، میں نے کل جو منظر دیکھا ہے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ میں نے نہ صرف قاتل کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ اسے پہچان بھی گیا ہوں۔ میری نظروں پر شاید کسی کو اعتبار نہ ہو اس لیے میں نے اس کیمرہ واچ میں سب ریکارڈ کر لیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں آپ کی وردی نہیں جائے گی۔“ وہ اس کے ہاتھ سے سلور گھڑی پکڑ رہی تھی۔ پھر اس نے سوال کیا۔ اہم سوال۔

”کون ہے قاتل؟“ اس اہلکار نے گردن موڑ کر دور کھڑے قیس کو دیکھا جو وا کی ٹاکی میں کسی کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔ وہ اس کی نظروں کا پیغام سمجھ گئی تھی۔ دل بری طرح سے ڈوب کر ابھرا۔ اس نے ضبط سے لبوں کو دانتوں میں جکڑا۔

”ایک بار سر کے ساتھ سوئمنگ کی ہے میں نے، میں ان کے انداز جانتا ہوں۔“ شیزل کے دماغ میں بہت کچھ چلنے لگا تھا۔ بہت کچھ۔ اس نے خود کو تھپکی دی۔ شانوں پر بوجھ آن سما یا تھا۔ اس بوجھ کو سر کا نا ضروری تھا۔ بے حد ضروری۔

”ٹھیک ہے بیان کے وقت تمہاری ضرورت پڑے گی۔ تم اس کیلئے تیار رہنا۔“ گھڑی کو

اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے وہ اس سے کہہ رہی تھی۔ اس اہلکار نے اسے سیلوٹ مارا۔ ”جی میڈم۔“

وہ واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ فون نکال کر قیس کی ڈیجیٹل جیکٹ کی تصاویر کو زوم کر کے دیکھ رہی تھی۔ وہ بلاشبہ اسی کی لائسنس تھیں۔ وہ بلاشبہ قیس ہی تھا۔ اسے یقین ہو چلا پختہ یقین۔ ڈاکٹر نے دو گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر سے باہر آ کر مریض کے معجزاتی طور پر بچ جانے کی اطلاع دی تھی۔ جس پر شینزل نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ اسے آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تا وقتیکہ وہ لوگ باہر ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر کے مطابق یا تو چوبیس گھنٹوں میں اسے ہوش آئے گا یا بہتر گھنٹوں میں۔ چوبیس گھنٹوں میں اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس کی نیند کا دورانیہ بہتر گھنٹوں پر مشتمل ہو گیا۔ کنٹرول روم میں سعد، کمال، نشاء، ماریہ اور شینزل موجود تھے۔ ان کے ساتھ وہی پولیس اہلکار بھی تھا۔ سسٹم کو آن کرنے کے بعد وہ کیمرہ وائچ کو اس کے ساتھ جوڑ چکے تھے۔ جوڑنے کے بعد اب وہ ویڈیو چلا رہے تھے۔ گہرے پانی میں ایک سیاہ وجود تھا جو بڑے پروفیشنل انداز میں سوئمنگ کر رہا تھا۔

”سوئمنگ کرنے کا انداز تو قیس سر کی طرح ہی ہے۔“ ماریہ کے اعلان پر سب نے بیک وقت اسے دیکھا۔ وہ کھسیا گئی۔ ”بس ایک ہی بار سوئمنگ کی ہے میں نے ان کے ساتھ۔“ اس کی تاویل پر کسی کو یقین نہیں تھا۔ شینزل نے واپس اپنی نظر اسکرین پر ڈالی وہاں کا ایک واضح منظر دیکھ کر سب بری طرح ششدر ہوئے تھے۔ سو جا ہوا انگوٹھا، چوٹ کا نشان، فریکچر کے آثار، شینزل کو یاد آیا جس رات وہ اس کے ساتھ رکی تھی۔ اس کی چوٹ کے بارے میں دریافت کر رہی تھی۔ اور اس رات اس نے خود اس کو پٹی کی تھی۔ اس کی گردن کی رگیں کھینچ گئیں۔

”اسے بند کرو، جنگل والے کیمرے آن کرو، وہاں کی ریکارڈنگ نکالو جلدی۔“

نشاء نے برق رفتاری سے وہاں کی ریکارڈنگ نکالی۔ پوری اسکرین کے بارہ حصوں میں جنگل کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ پورے ہفتہ کی ریکارڈنگ میں کچھ نہیں تھا سوائے ایک کے، جمعہ کی شام پانچ بجے کے قریب وہاں وہی نقاب پوش موجود تھا۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ وہاں چل رہا تھا جیسے اسے ہر کونے میں بچھائے گئے جال کا اندازہ ہو۔ ایک جگہ پر وہ پاؤں اوپر اٹھا کر درخت کے ٹہنے کو کراس کر رہا تھا جب شیزل نے نشاء کو ٹوک دیا۔

”رکو، زوم کرو۔“ اس نے زوم کیا، پوری اسکرین پر ایک منظر تھا جو ناقابل یقین تھا۔ ”تو یعنی قاتل قیس سر ہی ہیں۔“ کمال نے کمال حیرت کے ساتھ کہا۔ سیاہ چوٹے سے اوپر اٹھتے پاؤں میں جو جوتا تھا وہ قیس الہی کا پسندیدہ جوتا تھا۔ اس کا خود کا ڈیزائن کیا ہوا۔ وہ اس جوتے کو بڑے شوق سے ہر فنکشن میں پہنتا تھا۔ اس جوتے پر اس نے سمندر کی لہریں بنوائی ہوئی تھیں۔ سفید جو گرز، نیلی لہریں، سو جا ہوا ہاتھ اور اس کی چھوٹی انگلی میں قید پلائیم کی انگوٹھی جس پر قیو آئی کنندہ تھا۔ زوم ہوئی ویڈیو میں اس کی بیک تھی۔ اس کی پشت اس کی پوری شخصیت کو ظاہر کر رہی تھی۔

”اے گرفتار کرو۔“ شیزل کا آرڈر تھا اور ان سب کی چپ۔ ”اے ابھی اسی وقت گرفتار کرو لیکن ہما تک یہ بات نہیں پہنچنی چاہیے مجھے لگتا ہے وہ اس کے ساتھ ہے۔“ وہ سیدھی ہوئی اور حیدر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”لیکن میم۔“ یہ سعد تھا جسے اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ کر دیا۔ ”سر، اگر ہمیں قاتل مل جائے تو ہم کیا کریں۔“ ان کے آرڈرز سن کر اس نے سرکوا ثبات میں ہلایا۔ وہ اپنی پستل کو لوڈ کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں میں نے منع کیا تھا تا کچھ دن رک جاؤ مگر نہیں تمہیں تو ہر چیز کی جلدی ہوتی ہے۔“ وہ سس کر کے اپنے زخم پر سے گیلی پٹی اتار رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ وہ جان گیا۔

”مجھے کیا معلوم تھا اتنی سی چوٹ اتنی طوالت اختیار کر لے گی۔ آج ہی پلاسٹر چڑھواتا ہوں اس پر۔“ اس کی بہن نے شکر کا سانس لیا اور اسے قہوہ پیش کیا۔

”آہ، بہت طلب ہو رہی تھی اس کی، تمہارے ہاتھ سلامت رہیں۔“ وہ گھونٹ بھرنے لگا اور اس کی بہن اس کے بال سکھانے لگی۔

”ویسے تمہارا کام ہو گیا؟“ اس کا اشارہ کس طرف ہے وہ جان گیا۔ امید بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”امید تو ہے باقی دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔“ اس کی بہن اس کے بال سکھانے کے بعد اب اس کے ہاتھ پر ٹکڑ کر رہی تھی۔ اسے تکلیف محسوس ہوئی۔

”اگر نہ ہوا تو؟“ وہ قہوے کے سپ بھرتا ہوا مسکرا دیا۔

”پلان اے کی ناکامی کے بعد ایلفا بیٹس ختم نہیں ہو جاتے، کم آن ہمارے پاس پوری اے بی سی پڑی ہے۔“ وہ اس کے چل انداز پر تھوڑی متذہب ہوئی۔ کوئی انسان اتنا بڑا کانڈ کرنے کے بعد اتنا کول کیسے رہ سکتا ہے۔ اس نے سوچا پھر اپنے نحیف ہاتھوں پر غور کیا جواب دن بہ دن بہتری کی طرف آرہے تھے۔ اس کا بھائی اس کی سوچ پڑھ رہا ہے وہ جان گئی تبھی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ دریافت کر رہا تھا۔ رتبہ نے اپنی نظریں اس اپارٹمنٹ کی درودیوار پر ڈالیں جہاں بہت سارے کیمرے لگے ہوئے تھے پھر اس نے آزاد سانس خارج کی۔

”کچھ نہیں بس اندیشے سے آرہے ہیں۔“ وہ چونک گیا۔

”کس طرح کے اندیشے۔“ سوال بے ساختہ تھا جواب برجستہ۔

”اگر تم پھنس گئے تو، پکڑے گئے تو، میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ ہم، ہم بند کر دیتے ہیں یہ سب۔“ بڑی آنکھوں میں ان دیکھی سی نمی تھی۔ اس نے نگ کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا پھر اس کے گال پر ہاتھ رکھتا گویا ہوا۔

”پریشان نہیں ہوتے بیٹا، جب تک میں ہوں تب تک تو بالکل بھی نہیں۔ بس دو ٹارگٹ رہ گئے ہیں اس کے بعد تو ویسے بھی سب ختم ہو جائے گا تب تک کیلئے آپ زیادہ سوچو مت۔“ رتبہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ماتھے پر بل لیے وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”میرے حساب کے حساب سے صرف ایک ٹارگٹ بچتا ہے۔ بھائی، کیا تم اسے بھی مار دو گے، کیا سچ میں؟“ وہ کھویا کھویا اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ آنکھوں کی جھلکیاں کچھ الگ ہی پیغام دے رہی تھیں۔ زباں سے جو نکل رہا تھا وہی حرف آخر تھا۔

”یہ ضروری ہے۔“

”لیکن، لیکن کس طرح۔“ وہ ٹکڑ کرنا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”اسٹیم روم بہتر آپشن ہے۔“ وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ انداز غیر معمولی سا تھا۔

”لیکن تم اس سے محبت کرتے ہو، تم اسے چاہتے ہو۔“ وہ اسے اس چیز سے باور کروا رہی تھی جو ڈے ون سے اس کے دماغ میں تھی۔ ہر وقت رہتی تھی۔ اس نے واپس مگ اٹھایا اور قدرے ٹھنڈے قہوے کو حلق میں انڈیلنے لگا۔ رتبہ اسے یہ بات نظر انداز کرتے دیکھ جھنجھلا گئی۔ اسی جھنجھلاہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

”میں کچھ کہہ رہی ہوں۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“ وہ تاہنوز قہوہ پیتا گیا۔ گھڑی میں

وقت دیکھا پھر ایک لمبا سپ لیا اور کھڑا ہو گیا۔

”مجھے چلنا چاہیے کافی دیر ہو چکی ہے۔“ وہ اسے کراس کر کے جانے لگا تھا جب رتبہ نے اس کا بازو تھام کر اسے جانے سے روک دیا۔

”تم ایسے نہیں جاسکتے، مجھے وضاحت چاہیے۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو کنٹرول کیا پھر ضبط بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

”گلا کاٹنا، گاڑی کے نیچے کچلنا، جلانا یا پھر اسٹیم روم کون سا آپشن بہتر ہے اس کیلئے اب یہ تم پر منحصر ہے۔ جب منتخب کر لو تو بتا دینا کیونکہ مرنا تو بہر حال اس نے ہے ہی۔“ اپنا ہاتھ چھڑوا کر وہ رتبہ کو بت بنا چھوڑ وہاں سے چلا گیا تھا۔

شام کے سایوں میں قیس ہاسپٹل کے آئی سی یو روم کے باہر کھڑا ایک پولیس اہلکار کو کچھ ہدایت دے رہا تھا جب یک لخت ہی کسی نے اس کے گریبان کو تھاما تھا۔ وہ، اس کے ساتھ کھڑا پولیس اہلکار، دائیں جانب موجود ڈاکٹر اور چند اور پولیس اہلکار اس منظر سے آشنا ہونے کے بعد چونکے تھے۔ قیس کی سیاہ شرٹ کے دو بٹن گریبان سے کھلے ہوئے تھے۔ تیسرا جھٹکے سے گریبان پکڑنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔

”یہ کیا حرکت ہے شینزل؟“ اس نے درشتی سے اسے ٹوکا تھا۔ قبل اس کے وہ مزید کچھ کہتا شینزل اسے خود کے ساتھ گھسیٹتی ہوئی باہر لا رہی تھی۔ کمال اور سعد اس کے ساتھ ہی تھے۔ قیس کا خون کھولنے لگا۔ آس پاس کے لوگ، ہاسپٹل میں موجود عام عوام بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ایک لڑکی اپنے سے اونچے لڑکے کو گریبان سے کھینچتے ہوئے لیے جا رہی ہے۔ اچھا منظر ہے۔

”شینزل، انف از انف میں آپ کا ہاتھ جھٹک دوں گا۔ آپ کو چوٹ لگ جائے گی۔ مجھے

اب غصہ آرہا ہے۔“ اس کے چہرے کے ساتھ کان کی لونیں تک سرخ ہو چکی تھیں۔ سبکی کی انتہا تھی جس پر وہ اس وقت چڑھا ہوا تھا۔ ہسپتال کی سیڑھیوں سے اترنے کے بعد پولیس موبائل کے قریب پہنچ کر اس نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا تھا۔ وہ اس کے یوں چھوڑنے پر اپنے قدم مضبوطی سے جمائے وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو چکی تھیں اور دانت بری طرح سے ایک دوسرے پر جمتے تھے۔

”میں نے کہا تھا تمہیں قیس الہی۔“ کمال اس کے ہاتھ پیچھے کر کے ان میں ہتھکڑی ڈال رہا تھا۔ قیس نے نہایت متعجب انداز میں اپنے ہاتھ اور ان میں موجود سلور ہتھکڑی کو دیکھا۔ اس کا سانس غیر متوازن ہو چکا تھا۔ وہ شیزل کو سن رہا تھا جو کہہ رہی تھی۔

”اگر تمہارا کردار تھوڑا سا بھی اس کیس میں ہوا تو تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالوں گی اور اگر یہ سب تم پر ثابت ہو گیا تو تمہارا ان کاؤنٹر کرواؤ گی۔ یاد ہیں نا میرے الفاظ۔“ اسے جھٹکا لگا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اپنے سامنے کھڑی اس ہستی کو دیکھتا رہا جس سے اس نے شاید پوری دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی تھی۔ وہ اس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا جس سے وہ اس چیز کی سب سے آخر میں توقع کر رہا تھا۔ شاید اسے کہیں تھوڑا بہت اس کیلئے گمان تھا۔ تھوڑا سا مان تھا۔ اسے لگا اس کی سماعت دھوکا کھا رہی ہے۔ اس کی بصارت غلط دیکھ رہی ہے۔ لیکن ویسا نہیں تھا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔ وہ سن بھی ٹھیک رہا تھا اور دیکھ بھی درست رہا تھا۔

”مارک مائی ورڈز قیس الہی اگین، کیونکہ میں ایسا کر دوں گی۔“

اس کی گردن کی ہڈی اوپر نیچے ہوئی۔ آنکھوں پر اچانک سے دھند چھائی تھی جسے اس نے بری طرح سر کو جھٹک کر پیچھے کی جانب دھکیلا۔ شاک کا اثر ختم ہوا۔ بے یقین آنکھوں میں خود کیلئے تضحیک کے رنگ ابھرے۔ پہلے اس نے سر جھکایا، پھر شانے ہلے اس کے بعد وہ قہقہہ لگا

کر ہنس دیا۔ زور زور سے پاگلوں کی طرح، شیزل سعد اور کمال اس کے یوں ہنسنے کی وجہ سے نظروں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ وہ سر پیچھے گرائے ہنستا ہوا پولیس کار کی بونٹ سے ٹیک لگا گیا۔ ہاتھ سامنے بندھے تھے اور شانے ہل رہے تھے۔ وہ ہنستے ہنستے آہستہ آہستہ رکنے لگا، تھوڑا کم، تھوڑا اور کم پھر وہ بالکل چپ ہو گیا۔ اس کی گردن کی ہڈی تواتر سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ وہ ہنسی کنٹرول کر رہا تھا یا آنسو پی رہا تھا وہ تینوں سمجھ نہیں پائے۔ اس کی ناک سرخ ہو چکی تھی۔ اس کی شرٹ کھینچنے کی وجہ سے بے ڈھنگے انداز میں سامنے سے کھلی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جو بونٹ پر جمے تھے جھٹکڑیوں میں قید تھے۔ قیس الہی کرائم ونگ کا ہونہار جانباڑ جس کے سر پر ہنڈرڈ پرسنٹ اچیومنٹس کا سہرا سجا تھا۔ آج قتل کے الزام میں ایک دنیا کے سامنے ذلیل ہو کر یہاں کھڑا تھا۔ کیا کمال تھا۔

”اسے گاڑی میں ڈالو۔“ وہ اس کے کہتے ہی ایک وارن والی نگاہ سب پر ڈال کر ڈالے میں مجرموں کی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ سعد شیزل کے قریب آیا تھا۔

”میڈم، کیا یہ سب ٹھیک ہے؟“ شیزل کوئی بھی جواب دیے بنا کار میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تین گاڑیاں ایک ساتھ وہاں سے نکل کر پولیس اسٹیشن پہنچی تھیں۔ قیس کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی ہمارے پتے ہوئے وہاں پہنچی تھی۔ قیس بیچ پر بیٹھا اپنا پاؤں جھلا رہا تھا۔ اس کا سر جھکا تھا۔ اور آنکھیں خطرناک منصوبے کی پیامبر تھیں۔ وہ سلاخوں کے پیچھے سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ سلاخیں کبھی بھی اس کیلئے نہیں تھیں نا ہی وہ ان کیلئے۔ ہمارے جو منظر دیکھا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ یہ منظر اس کی آنکھوں کو نہیں بھایا تھا بالکل بھی نہیں۔

”چابی کس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا چابی کس کے پاس ہے۔“ شور کرتی ہوئی ہمارے بالکل بھی ایک پڑھی لکھی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی ٹیکسٹل حرکتوں پر شیزل نے میز پر پین

بجا کر اسے خود کی جانب متوجہ کیا۔ ہمارے دیکھنے پر وہ گویا ہوئی تھی۔

”میرے پاس ہے تم نے کیا کرنا ہے؟“ وہ اس کے قریب پہنچی اور میز پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے جھک کر کھڑی ہوئی۔ ابرو اچکاتے ہوئے، آنکھیں نکالتے ہوئے۔

”مجھے میرے شوہر کو سلاخوں کے پیچھے سے نکالنا ہے۔ یہ جگہ اور یہ مقام اس کیلئے نہیں ہے۔ یوگاٹ دیٹ۔“ سناٹا۔۔۔ بے حد سناٹا۔۔۔ شیزل ایک ٹک اسے دیکھتی رہی، لب سیسے، رکے ہوئے دل کے ساتھ، تھمی ہوئی سانس کے ساتھ۔۔۔ خاموش بالکل خاموش، قیس پتھر ملی آنکھوں سے اپنے جوتوں کو گھور رہا تھا۔ اس کا گریبان تاہنوز بے ڈھنگے انداز میں کھلا تھا۔

”اور تم نے کس بیس پر اسے اندر ڈالا ہے۔ صرف اس لیے کہ شوز، سوئمنگ کا سٹائل اور چوٹ بالکل قیس کی طرح کی ہے۔ یہ کیوں نہیں سوچا کوئی اسے پھنسا بھی سکتا ہے۔ تمہارا دماغ ہے شیزل۔“ وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس کا دماغ بس ایک ہی بات پر اٹکا تھا۔ ایک ہی پوائنٹ پر ٹکا تھا۔ اس کی سانس تاہنوز اٹکی تھی۔

”میرا شوہر قصور وار نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ آج سے ایک ہفتہ بعد ہماری بیٹی کی پہلی سالگرہ ہے اور میں چاہتی ہوں اس کا باپ اس وقت اس کے ساتھ ہو۔ تم سن رہی ہونا میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ شیزل کو لگا اس کی سماعت واقعی غائب ہو گئی ہے۔ اس کا دل مکمل طور پر بند ہو گیا ہے۔ اس کی نظریں قیس پر گئیں۔ وہ سر جھکائے بیچ کے کنارے تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کی رگیں بہت واضح نظر آرہی تھیں۔ پھر اسے سب دھندلا لگنے لگا۔ ہمارا اس کی کیفیت جان رہی تھی لیکن اسے قطعی فکر نہیں تھی بالکل ویسے جیسے وہ نہیں کرتی تھی۔ تو وہ میسجز، وہ میسجز حقیقت تھے۔ وہ تصاویر سچ تھیں۔

”میں شادی کر رہا ہوں۔“ سیاہ شیروانی میں مسکراتا ہوا وہ۔

”ہنی مون پر بھی مجھے آپ یاد آ گئیں۔ کیا مضحکہ خیز بات ہے یہ۔“ ایفل ٹاور کے سامنے بیچ پرٹانگ پرٹانگ جمائے بیٹھا وہ اور اس کے ہاتھ میں موجود کافی کا ڈسپوز ایبل مگ۔

”میں باپ بننے والا ہوں۔“ نم آنکھیں، خوشی سے ستا چہرہ۔

”یہ دیکھیں، اللہ نے مجھے رحمت سے نوازا دیا۔“ پھولے پھولے گالوں والی نو مولود بچی کی ناک سے ناک ٹکائے تصویر۔

سب سچ تھا۔ سب آئینے کی طرح سچ تھا۔ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ کسی اور کی شادی نہیں تھی۔ وہ اسی کی شادی تھی۔ وہ اسے چڑا نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے ہی ہنی مون پر تھا۔ دوستوں کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ واقعی باپ بننے والا تھا۔ آنکھوں کی نمی جھوٹی نہیں تھی۔ کوئی ایکٹنگ نہیں تھی۔ وہ تصویر، وہ بچی کی تصویر سب سچ تھا۔ اے آئی نہیں تھا یا کسی اور کی بچی نہیں تھی۔ وہ اسی کی بیٹی تھی۔ وہ قیس الہی کی بیٹی تھی۔ وہ زندگی میں آگے نکل چکا تھا۔ وہ واقعی زندگی میں بہت آگے نکل گیا تھا۔ شیزل کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سینے میں نا معلوم سا درد اٹھا۔ آنکھوں میں اتنی زیادہ نمی بھری کہ اس نے اسے چھپانے کی غرض سے اس نے زور زور سے پلکیں جھپکیں اور لب بری طرح سے دانتوں میں کچل ڈالے۔

”اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں سچ کہہ رہی ہوں بہت برا کروں گی۔“ وہ اس وقت ایک آفیسر کی حیثیت سے بات نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک بیوی اور ایک ماں تھی۔ جسے اپنی ڈیوٹی اپنے فرض کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ پرواہ تھی تو اپنے جیون ساتھی اور اپنی بیٹی کے باپ کی۔ شیزل نے ایک گہرا سانس بھرا، آزاد سانس جس نے اس کی زندگی بحال کی تھی۔ پھر اس نے شیشے کے گلاس سے ڈھکن ہٹایا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا بالکل ویسے جیسے سو سال کے بوڑھے انسان کا کانپتا ہے یا پھر ریشہ کے مریض کا، اس نے گلاس اٹھانے کی کوشش کی اس

سے نہیں اٹھایا گیا۔ پانی چھلک رہا تھا۔ اس کی تھوڑی میں کپکپاہٹ شروع ہوئی۔ وہ ہما کی کسی بھی بات کا جواب دیے بنا وہاں سے جھٹکے سے اٹھ کر گئی تھی۔ قیس اب بھی خاموش تھا۔ ہمانے ترحم بھری نگاہ اپنے شوہر پر ڈالی پھر وہ وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

ٹینزل پلکوں کو جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سر جھکائے خود کو سیلوٹ مارتے اہلکاروں کو پیچھے چھوڑ واش روم میں آئی۔ دروازے کو لاک کیا۔ ایک نگاہ خود کو شیشے میں دیکھا۔ آنسو آبشار کی صورت چھلک پڑے تھے اس کی آنکھوں سے۔ اس بار اس نے خود کو نہیں روکا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے دیا۔ وہ زندگی میں دوسری بار ایسے رو رہی تھی۔ اتنی گریہ وزاری کر رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سر گرا تھا۔ دروازے سے ٹیک لگی تھی۔ درد کی شدت انتہا پر تھی۔ اسے پرواہ نہیں تھی کہ اس کی آوازیں باہر جا رہی ہوگی۔ وہ بس اپنا غبار نکال رہی تھی۔ گھٹے گھٹے انداز میں روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ دروازے سے لگی وہ سختی سے منہ پر ہاتھ جمائے کھڑی ہو گئی تھی۔ دیوار پر لگے آئینے میں وہ خود کو دیکھ رہی تھی۔ سرخ آنکھیں، آنسوؤں سے بھیگا چہرہ و سکارف اور ہچکی کے سبب ہلتے شانے۔ وہ پانچ منٹ کھڑی وہاں خود کو دیکھتی رہی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد اس نے اپنے گالوں پر سے آنسوؤں کو جھٹکا تھا۔

عورت پر آنسو صرف اس لیے نہیں جتے کہ وہ ایک کمزور وجود ہے۔ عورت پر آنسو اس لیے بھی نہیں جتے کیونکہ آنسو اس کیلئے بنے ہی نہیں ہیں۔ وہ آنکھیں کیوں روئیں جن کیلئے مسکراہٹ بنائی گئی۔ وہ آنکھیں کیوں روئیں جن کیلئے خوشیاں بنائی گئیں۔ وہ آنکھیں کیوں روئیں جو بہادر ہیں۔ نڈر ہے۔ بے خوف ہیں۔ عورت اب تک کی تخلیق میں سب سے مضبوط ترین وجود ہے۔ یہ مضبوط ترین وجود ٹوٹنے کیلئے نہیں بنا ہے بالکل بھی نہیں۔

اس نے نل کے آگے کا نپتے ہاتھ کسی فقیر کی طرح پھیلائے کہ کیا پتہ اس پر رحم کیا جائے۔

اسے نوازاجائے۔ اسے نواز دیا گیا تھا تبھی پانی گرم دھار کی صورت میں اس کے ہاتھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی اوک میں پانی اکھٹا کیا پھر اسے اپنے چہرے پر پھینک دیا۔ وہ چہرہ جھکائے پانی کے چھپکے مار رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پھسلتا ہر قطرہ اس کا حزن، تکلیف، کدورت، برات سب بہا کر لے جا رہا تھا۔ جھکے چہرے کے ساتھ جس نے پانی کے چھٹنے چہرے پر مارنا شروع کیے تھے وہ ایک کمزور ترین لڑکی تھی۔ اب جو چہرہ اٹھا کر تو لیے سے اسے تھپک رہی تھی۔ وہ اس دنیا کی مضبوط ترین لڑکی تھی۔ اس نے سپاٹ انداز میں اپنے چہرے کو اچھے سے تھپکا یہاں تک کہ وہ بالکل خشک ہو گیا۔ اس کے بعد ڈرائیئر مشین سے وہ اپنا اسکارف اور بازو سکھا رہی تھی۔ جب تک یہ سب سوکھا تھا تب تک اس کی آنکھوں کی سوجن قدرے کم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی پینٹ کی جب سے آئی ڈراپ نکالا۔ یہ وہ اپنے ساتھ دراز میں سے اس وقت اٹھالائی تھی جب اسے ادراک ہو گیا تھا وہ بہت زیادہ رونے والی ہے۔ سر اونچا کر کے اس نے آنکھوں میں دو دو قطرے ڈالے۔ پورے ایک منٹ بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو نہ وہاں سوجن و سرخی تھی اور نہ ہی مرچیں لگ رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور لبوں کو پھیلا دیا۔

”میں ایک وائر ہوں ہر لڑکی ہوتی ہے۔ میں ایک فائبر ہوں ہر لڑکی ہوتی ہے۔ میں خود کیلئے ہیلر ہوں ہر لڑکی کو ہونا چاہیے۔ میں مضبوط ہوں۔ سب لڑکیاں ہیں۔ میں شینزل قیس الہی ہوں۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہوئی۔

”کاش کوئی لڑکی نہ ہو۔“

اس نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں۔ پرانی شینزل مر کرنی پیدا ہوئی تھی۔



”یہ پاکستان کا نمبر ہے؟“

”جی جی پاکستان کا ہی ہے۔“

”آپ جیری کے والد جہانگیر بات کر رہے ہیں؟“

”جی بول رہا ہوں، خیریت سے کال کی آپ نے۔“ ان کے دل کو دھڑکا ہوا تھا۔ یہ دھڑکا غلط ثابت نہیں ہوا۔

”آپ کے بیٹے نے دو لڑکیوں کے ساتھ تشدد کیا ہے۔ اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہے۔ آپ کو یہاں ہونا چاہیے، آپ کا یہاں ہونا ضروری ہے۔“

جہانگیر نے فون بند کر کے سر کو پکڑ لیا۔ گزشتہ دو سالوں سے اس لڑکے نے ان کی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ کبھی وہ کسی کا ایکسیڈنٹ کر دیتا تھا۔ کبھی ہائی وے کے بیچ و بیچ کار کھڑی کر کے شور کرتا تھا۔ کبھی بار کاؤنٹر کو توڑ دیتا تھا تو کبھی کسی پادری کسی بدھا کی سنگت میں پایا جاتا تھا۔ ان کا ہونہار بیٹا مسخ نہیں ہو رہا تھا وہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مصباح نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دریافت کیا۔ جہانگیر نے یونہی پریشانی کے عالم میں انہیں سب کچھ بتا دیا۔

”یہ سب نین کی وجہ سے ہو رہا ہے خود تو وہ چلی گئی ساتھ میں میرے بیٹے کی شخصیت بھی لے گئی۔“ جہانگیر نے افسوس سے اپنی شریک حیات کو دیکھا۔ ان کے لفظوں میں اس سے زیادہ دکھ تھا۔

”مصباح، بخش دو اسے آپ، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ خدا کیلئے ہر وقت اسے درمیان میں نہ لایا کرو۔“ مصباح نے پہلو بدلا۔

”وہ مری بھی تو اپنی وجہ سے ہی ہے۔ نہ غنڈے کے ساتھ بھاگتی نا تشدد ہونے پر مرتی۔“

خود تو اس دنیا سے چلی گئی ساتھ میں میرے بیٹے کو بھی لے گئی۔ بتائیں مجھے آپ، کہاں سے لاؤں میں اپنے پرانے سیٹھ صاحب کو، ہے کوئی جواب آپ کے پاس۔“

جہانگیر جھٹکے سے وہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔ امریکہ جانے سے پہلے انہوں نے نین کی قبر پر حاضری لگائی تھی۔ یہ اس بد نصیب لڑکی کی قبر تھی جس نے بے تحاشہ دائمی محبتوں کو چھوڑ کر وقتی فرضی محبت کا ہاتھ تھامنا تھا جو بعد از اتنی بری طرح سے جھٹک دیا گیا کہ اسے پھر موت کی آغوش نے آلیا۔ جو لڑکیاں گھر چھوڑ دیتی ہیں۔ جو محفوظ دہلیز کو بے حس ہو کر پھلانگ دیتی ہیں۔ انہیں پھر تخت نہیں ملتا۔ انہیں فرش بھی نہیں ملتا۔ کچی زمین ملتی ہے۔ ذرات و کنکر ملتے ہیں۔ ٹھوکریں، ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے جڑ جاتے ہیں۔ رسوائی و تنہائی انہیں جکڑ لیتی ہے۔ وہ پھر عورت نہیں رہتی، کچرے کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ جس پر ہر طرح کی غلاظت ڈالی جاتی ہے اور پھر غلیظ و کراہیت بھری نظروں سے بھی انہیں ہی دیکھا جاتا ہے۔ عزت چاہیے تو دو باتیں ذہین نشین کر لو، ماں باپ کو رسوا نہیں کرو اور اپنے دل و نظر کو آلودہ نہیں کرو کیونکہ وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ آپ کی دوڑ، پانے کی ہوس اور آپ کی حکمت عملی سراسر بے وقوفی ہوتی ہے۔ سراسر نادانی ہوتی ہے۔ اور یہی جلد بازی، یہی حکمت عملی آپ کو گھر کی ملکہ کے عہدے سے ہٹا کر رکھیل کے درجے پر فائز کر دیتی ہے۔ اس درجے پر جو ایک عورت کیلئے ایک گالی ہے، ایک ننگی گالی۔

”آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ ضعیف ہوتے جہانگیر کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ ”بیٹے۔“ انہوں نے اسے صاف کرنے کی زحمت نہیں کی۔“ آپ نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا۔ آپ کی خاطر وہ خود کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ کیا سے کیا بن گیا ہے۔ اس کی مسکراہٹ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔“

گھٹنوں کے بل کچی زمین پر بیٹھ کر وہ رو دیے تھے۔ ☆

”میں نے پوری زندگی صبر اور عذاب میں کاٹی ہے۔ پہلے حلیمہ کی جدائی نصیب ہوئی پھر سوچا اولاد سے سکون حاصل کروں گا پر وہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہوگا کوئی مجھ ایسا بد نصیب، ہوگا؟“ کم عمر بیٹی کی قبر پر ہاتھ رکھے وہ بلک بلک کر رو دیے تھے۔ ان کے گارڈ زان سے بہت دور کھڑے تھے۔ قریب ہوتے بھی تو کیا فرق پڑتا تھا۔ آنسو پونچھتے وہ ایئر پورٹ کیلئے روانہ ہو چکے تھے۔ وہ جب امریکہ پہنچے تو رات ہو رہی تھی۔ انہیں جیٹ لیگ ہوتا تھا پھر بھی وہ فلائٹ سے سیدھا پولیس اسٹیشن آئے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی ان کا وکیل وہاں پہنچ چکا تھا۔ تمام معاملات نبٹا کر وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لیے اپنے فلیٹ میں آئے کیونکہ اس کا فلیٹ رہنے کی جگہ ہرگز نہیں تھا۔ فلیٹ پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک اچھلتی نگاہ اپنے بیٹے کے نئے حلیے پر ڈالی۔ شانوں تک گرتے بال، سرخ پیلے پھولوں والی شرٹ، کان میں جھولتا کراس کا نشان، گلے میں صلیب، شارٹس اور بڑھے ہوئے ناخن جس کی چھوٹی انگلی پر سرخ نیل پینٹ لگا ہوا تھا۔ سینے اور بازوؤں کے ٹیٹو پرانے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے سے گھن آئی بے تحاشہ گھن۔

”یہ کیا ہے حلیمہ ہے اب؟“ ان کے لہجے میں سختی تھی۔

”یہ فیشن ہے پوپس۔“ جہانگیر کا خون کھول اٹھا۔

”اللہ کی لعنت ہوتی ہے ایسے فیشن پر اور کالمی بابا انڈرسٹوڈ؟“ وہ انگلی اٹھائے نکلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے وارن کر رہے تھے۔ اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

”اوکے پوپس۔“ اس کی آواز میں زنانہ پن تھا۔ جہانگیر کا خون دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

”تم نے ان لڑکیوں کو کیوں مارا۔“ انہوں نے خود کو کول ڈاؤن کرتے ہوئے سوال کیا۔

ان کا بیٹا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ نزاکت سے ہاتھ جھلاتے ہوئے بولا۔

”وہ مجھے چھیڑ رہی تھیں دفاع تو بنتا تھا نا۔“ جہانگیر کو اس کی آواز، اس کا انداز کراہیت میں مبتلا کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہیں اپنے بیٹے سے گھن آئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہیں اس کی آواز سے چڑھور ہی تھی۔

”بس بہت ہو گیا اب، انسان بنو اس کی طرح ہی بات کرو، خود کو دیکھو آئینے میں عورت لگ رہے ہو پوری۔“ ان کے لفظ، لفظ نہیں نشتر تھے جو سیدھا اس کے دل پر لگ کر اسے گھائل کر گئے۔ اسے عورت لفظ سے نفرت ہے۔ اسے عورت لفظ سے چڑھ ہے یہ بات وہ بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ان کے یقین نے اس کے انداز کو بدلاتھا۔ نامحسوس انداز میں اس نے ٹانگ پر سے ٹانگ ہٹائی اور اپنی تیسری انگلی کے ان دیکھے میل کو صاف کرنا ترک کیا۔

”آپ مجھے گالی نہیں دے سکتے۔“ اس نے وارن کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ اس بار جو آواز نکلی تھی وہ کسی ”شی میل“ کی نہیں تھی بلکہ ان کے سیٹھ صاحب کی تھی۔

”تو گالی والی حرکتیں مت کرو۔ میں بھی نہیں کہوں گا، ابھی تو صرف میں نے کہا جب پوری دنیا کہنا شروع کرے گی پھر کیا کرو گے تم؟“ اس نے درشتی سے چباتے ہوئے کہا۔

”مجھے دنیا کی پرواہ نہیں ہے۔“ جہانگیر مسکرا دیے۔

واقعی نہیں ہوگی لیکن اسلام، کیا اس کی پرواہ ہے، میں نے تمہیں کہا تھا۔ ٹیٹو کی ہمارے مذہب میں کوئی جگہ نہیں، اس مرد اور عورت کا جنازہ قبول نہیں ہوتا جس کے جسم کے کسی بھی حصہ پر کھدائی ہوئی ہو اور تم، تم نے خود کو کیا بنا لیا۔ قوم لوط کا ایک فرد، جن پر اللہ کا قہر و عذاب نازل ہوا تھا۔ یاد ہے نا ان کا قصہ تمہیں، قرآن پاک تفسیر سے پڑھا ہے تم نے، یاد تو ہوگا تمہیں۔ نہیں؟“ اس لڑکے کا دل کسی نے مٹھی میں سختی سے پکڑ کر چھوڑا تھا۔ وہ سرخ چہرے

کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھے گیا۔

”ایک سیاستدان جو دھوکہ دہی کرتا ہو، اپنے مفاد کی خاطر جھوٹے عہد کر چکا ہو، کرپشن ہی جس کا پیشہ ہو۔ اس کے منہ سے دین کی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔“ دفاع کرنا تھا مضبوط دفاع اس لیے بہتان کا سہارا لیا۔ غلط کیا بہت غلط۔

”اگر تمہیں لگتا ہے میں کرپٹ ہوں، دھوکا دہی کرتا ہوں اور اپنی مفاد کی خاطر جھوٹے عہد کر چکا ہوں تو لاکھ تفت ہے تمہاری سوچ پر، میری اولاد میرے کردار کو نچ کرے گی یہ آخری واقعہ تھا جس کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں، میں نے سوچا تھا۔ لیکن تمہاری معلومات کو ریفریش کر دیتا ہوں۔ اگر میں یہ سب ہوتا تو ابھی تک صرف صدر ہی نہیں بلکہ وزیراعظم کی پوسٹ پر فائز ہوتا۔ سال دو سال صدر کے عہدے پر بٹھا کر یوں نا اہل نہ کر دیا جاتا لیکن چونکہ تم مجھے ویسا سمجھتے ہو تو ہو سکتا ہے، میں ویسا ہوں۔“ جہانگیر نے اب خود کو اس کے سامنے بٹھایا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے تھک چکے تھے۔ ضعیف ہو رہے تھے یا اولاد کے غم میں گھل رہے تھے تبھی دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے نیچے حلقے ان کے جگ رتوں کے گواہ تھے۔

”بہر حال اب جو بھی ہے۔ یہ۔“ انہوں نے شہادت کی انگلی گول گول کر کے اس کے وجود کی طرف اشارہ کیا۔ ”حلیہ بدلو اور انسان لگو، خاص کر اس رنگ کو اتارو اپنے ناخن سے۔“ وہ ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے انہیں انکار کر رہا تھا۔

”یہ میں نہیں کر سکتا، میں یہاں کی سوسائٹی میں رہ رہا ہوں۔ یہ نیل پینٹ۔“ اس نے اپنی انگلی کھڑی کر کے اس کے رنگے ہوئے ناخن کو دیکھا اور پھر جہانگیر کی آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوا۔ ”یہاں کے متاثر لڑکوں کو سپورٹ کرنے کیلئے ہے۔ ہالی ووڈ، بالی ووڈ کے بڑے بڑے

میل سٹار جو اپنی زندگی میں ایک بار کسی بھی طرح سے ہراس ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ناخن کو رنکتے ہیں۔ اور اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اس چیز کے سخت خلاف ہیں۔ آج کل یہی ویک چل رہا ہے اس لیے ان کو سپورٹ کرنے کیلئے مجھے اسے لگے رہنا دینا ہوگا۔“

جہاں گئیر چند ثانیے اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے ٹھاہ کی آواز میں اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔

”یہ دیکھ لو میرے جڑے ہوئے ہاتھ، تھک چکا ہوں میں تمہیں سنبھالتے سنبھالتے نہیں ہے ہمت مزید، جس کی خاطر تم بھٹک رہے ہو وہ تو کب کی قبر میں جاسوئی اس لیے خدا کیلئے بخش دو ہم سب کو، راہ راست پر آ جاؤ۔“ چند ساعت شاک میں گزارنے کے بعد وہ یکدم وہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ وہ جانتے تھے انہوں نے اس کی شہ رگ چھیڑ دی ہے۔ اب وہ بلک جائے گا لیکن وہ بھی کیا کرتے۔ وہ بھی مجبور تھے۔ بے تحاشہ مجبور۔

☆.....☆.....☆

ہسپتال کے کاریڈور میں رات کے اس پہر گھور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایمر جنسی وارڈ میں گہما گہمی تھی لیکن آئی سی یو کے پورشن میں خاموشی کا راج تھا۔ اس انتہا سے زیادہ خاموشی میں ایک کمرے میں کوئی ڈاکٹر کا کوٹ پہننے کے بعد اسے شانے جھٹکتے ہوئے درست کر رہا تھا۔ کوٹ پہننے کے بعد اس نے ڈاکٹری ماسک منہ پر لگایا۔ اس کی ڈوریاں کانوں کے پیچھے سے گزارنے کے بعد وہ جھک کر بے ہوش ڈاکٹر کے وجود پر انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کی انگلی اٹھتھو اسکوپ پر آ کر رکی۔ اس نے ڈاکٹر کی گردن سے اسے کھینچ کر اپنی گردن میں جھولنے کیلئے چھوڑ دیا۔ ہاتھوں پر گلوں چڑھانے کے بعد وہ کمرے کو لاک کرتا باہر آ رہا تھا۔ اور آل کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑے پر اعتماد انداز میں کاریڈور سے گزر کر آئی سی یو

وارڈ میں آیا۔ وہاں ہائی الرٹ سیکورٹی تھی۔ مطلوبہ کمرے کے باہر آ کر وہ لمحہ بھر کور کا۔ آنکھوں پر گلاسز چڑھائے ایک نگاہ اس نے وہاں کھڑے گارڈز اور پولیس اہلکاروں پر ڈالی۔ ستون سے ٹیک لگائے فون میں گم اسے راحیل بھی نظر آیا تھا۔ لبوں پر مسکان سجا کر وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا اور ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک نرس حواس باختہ سی بھاگتی ہوئی مریض کے کمرے سے نکلی اور اس کے ایکس پائر ہونے کا اعلان کر گئی۔ ایک اور جان چلی گئی تھی۔ چار لوگ مر چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

”کسی کو مرنے کیلئے اس کا مر جانا ضروری نہیں ہے۔“

اس نے تر گیلی آنکھیں کھولیں۔ آکسیجن ماسک نم آلود تھا۔ دل سے جڑی مشین کی آواز، کمرے میں پھیلی دوا کی سمیل اور روم سپرے، سوتی جاگتی کیفیت میں اس کی سماعت میں سیٹی کی آواز گونجی تھی۔ لے، سر، بھرپور، ساز سے پر، سینے کا ارتعاش اس کے سانس کے متوازن چلنے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ متورم آنکھوں میں دھند لکا سا تھا۔ اس دھندلے منظر میں سفید کوٹ میں موجود شخص سیٹی بجاتے ہوئے انجکشن کی سوئی سے نکلتے قطرے دیکھ رہا تھا۔ مریض کے جاگنے پر اس نے مسکرا کر خود کارخ اس کی طرف کیا۔

”سنا ہے موت کے بعد جب انسان جاگتا ہے تب اسے وہ جاگنا بے یقینی جیسا لگتا ہے۔“ سوال ہوتا ہے۔“ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔ اس پر جھکا۔

”بتا تیرا رب کون ہے؟“ آکسیجن ماسک پر نمی مزید بڑھی، سوال پھر سے آیا۔

”تیرا نبی کون ہے؟“ لڑکے کی آنکھیں پھٹیں، آنکھوں کے کناروں سے پانی پھوٹ پڑا۔

”کتاب کون سی ہے؟“ وہ انسان اس پر جھکا تھا۔ وہ لڑکا اسے اچھے سے جانتا تھا بہت

اچھے سے، اس نے آئی وی لگی انگلی کو ہلایا۔ سفید بیڈ کی چادر پر سلوٹیں دے کر وہ کوئی حروف لکھنے لگا تھا۔

”جب جواب نہیں آتا تو پتا ہے کیا ہوتا ہے۔“ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ اطراف میں نظریں گھمائیں۔ کمرہ پرسکون اور خاموش تھا۔

”کوڑے پڑتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ بلند کر کے جھٹکے سے انجکشن اس کے سینے میں کھبایا اور ایک جھٹکے سے ہی مانع اس کے دل میں اتار دیا۔

”تکلیف ہوتی ہے۔ درد ہوتا ہے بہت سارا درد جیسا ابھی، تمہیں ہونے والا ہے۔ لیکن مردہ بے بس ہوتا ہے جیسے ابھی تم ہونے والے ہو، ہونا تم بے بس۔“ لڑکے کے جسم میں ارتعاش برپا ہو رہا تھا۔ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ وہ انسان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ آسودگی اس کے رگ و پے میں بھری تھی۔ سکون اس کی نس نس میں اتر رہا تھا۔

”جہنم تمہیں خوش آمدید کہتی ہے۔“ وہ لڑکا لرزنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف کے زیر اثر پھٹ چکی تھیں۔ ماتھے پر تکلیف کے سبب پسینہ وبل پڑ چکے تھے۔ وہ انسان انجکشن اور باقی چیزیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا سفید کوٹ کی جیب میں ڈال کر سیٹی بجاتا باہر آ گیا۔ جہاں سکون بھری خاموشی تھی۔ اس نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر جھٹکے سے مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔

”ڈاکٹر زکو کوئی نہیں روکتا۔“ جانے والے کا دماغ سوچ رہا تھا۔

”سکیورٹی بھی الرٹ ہے اور کیمرے بھی فکس ہیں بس صبح تک کا انتظار ہے۔ صبح وہ ہوش میں آ کر اپنا بیان دے دے گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ کمال کے ساتھ ہاسپٹل کے کاریڈور میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس نے آج رات یہیں رہنے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ صبح تک

سب ٹھیک رہے۔

”بیان دینے کی کنڈیشن میں، میرے خیال سے ابھی وہ نہیں ہے۔ ہمیں کسی ایکسپریٹ کو بلوانا ہوگا جو اس کے آنکھوں کے اشارے سے سارا بیان نوٹ کر لے۔“ شینزل نے ستون سے ٹیک لگائی۔ اس کی گردن آئی سی یو کے کمرے کی طرف تھی جس کے باہر دو گارڈز کھڑے تھے اور ویٹنگ چیرز پر باقی کے پولیس کے اہلکار بیٹھے تھے۔

”ہاں اچھا مشورہ دیا تم نے، ایسا ہی کرتے ہیں۔“ کمال نے گلا کھنکھارا۔ وہ شینزل کو شش و پنج میں مبتلا لگا۔

”کوئی بات کرنی ہے تم نے؟“ دور کھڑا راحیل اور ماریہ بھی ان کی طرف آگئے تھے۔ کمال نے راحیل کی طرف دیکھا جس نے نامحسوس انداز میں سرکواشات میں جنبش دی تھی۔

”ہاں کرنی تو ہے۔ مگر میں جانتا نہیں ہوں یہ سن کر تم کس طرح کاری ایکٹ کرو گی۔“ وہ تضحیکی انداز میں مسکرا دی۔

”ری ایکٹ کرنا چھوڑ دیا ہے میں نے، اب تو بس باتوں پر چوکتی ہوں اور پھر اسے جھٹک دیتی ہوں۔“ خاموشی میں ان کی آواز سرگوشی سے کم نہیں تھی۔ ماریہ ہولے سے پھسپھسائی۔

”یہ بات جھٹکنے والی نہیں ہے۔“

”جس کیوں پیدا کر رہی ہو، کمال، راحیل کچھ غیر متوقع ہوا ہے کیا؟“ اس نے ستون سے ٹیک چھوڑ دی تھی۔ تینوں کا آپس میں نظروں کا تبادلہ، معمولی سے اچکتے شانے اور کان کی لو کھجاتے ہاتھ، اسے یقین نہیں آیا۔ بالکل بھی نہیں آیا۔

”نہیں، کیا واقعی؟“ اشاروں کنایوں کا مطلب سمجھا۔ تصدیق کی اور پھر مہر لگ گئی۔ وہ

سیخ پاسی ان سے دور کاریڈور میں گئی۔ فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے وہ جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں وہاں منڈلا رہی تھی۔ اس کی کال اٹھالی گئی۔ وہ چھوٹے ہی بولی۔

”آپ نے قیس کو آزاد کر دیا؟“ کوئی سلام دعا نہیں، کوئی احترام نہیں۔

”رات کے اڑھائی بجے یہ جاننے کیلئے تم نے مجھے فون کیا ہے۔“ حیدر کی خفا سی آواز گونجی۔ شیزل کے قدم تھم گئے۔

”انکل، آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں جبکہ اس کے خلاف سارے ثبوت ہیں۔“ وہ احتجاج کر رہی تھی اور اس کا دل دھک دھک۔

”شیزل، اول تو وہ قاتل ہے نہیں اور اگر جرم کرتے ہوئے اس کا پورا چہرہ بھی نظر آ جائے تب بھی تین یا سات ماہ سے اوپر کی سزا ہم نہیں دے سکتے۔ تم اس کے رسوخ سے اچھے سے واقف ہو۔“ شیزل کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اس نے ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔

”پھر تو سمجھو کیس ختم، جان کے بدلے مال لیں گے اور۔۔“ وہ تضحیکی مسکرائی، حزن اس کے پورے وجود پر چھا چکا تھا۔

”کیس ختم نہیں ہوا ہے بچے، ابھی قیس قاتل ثابت نہیں ہوا اور معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ دھاک مرنے والوں کے ہے تو دھاک تمہارے۔“ اس نے کال منقطع کر دی۔ گستاخی کی۔ وہ بے بسی سے کرسی کے کنارے ٹک گئی تھی۔ صرف دو گھنٹوں میں اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ فقط دو گھنٹوں میں۔ یہ اوقات تھی اس کی محنت کی۔ اس کی ریاضت کی۔ اس کی لگن کی۔ اسے بہت کچھ سمجھ آنے لگا۔ وہ بہت کچھ جان گئی۔ اسے اپنے شانے پر ایک گرم سا لمس محسوس ہوا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ آنکھ بند کر کے پہچان سکتی تھی۔ اس نے جھٹکے سے نظریں اٹھائیں۔ وہ دراز قد والا گھنٹوں کے بل اس کے سامنے زمین پر بیٹھ رہا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سرخ دھاگوں سے اٹی آنکھوں میں اس کا عکس پڑتے ہی غصہ چھا گیا۔ قیس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھرے۔ شیزل نے مزاحمت کی، ناکام گئی۔

”ہا مجھے چاہتی تھی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنا شروع ہوا تھا۔ شیزل نے اپنے ہاتھوں کو زور سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ قیس کی گرفت مضبوط ہوئی۔

”مجھے دلچسپی نہیں ہے تمہاری رام کہانی میں، مجھے بتاؤ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

قیس نے اسے ایسے نظر انداز کیا جیسے ایک بچے کی ضد کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔

”اس نے مجھے پرپوز کیا تھا۔ میں نے اس بارے میں پورے ایک ماہ سوچا۔ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔“ وہ مسلسل اپنے ہاتھ اس سے چھڑوانے کی سعی کر رہی تھی۔ دور کھڑے کمال، راحیل اور ماریہ کی آنکھوں سے یہ منظر گزر رہا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پارہے تھے۔ وہ کچھ سوچ، سمجھ نہیں پارہے تھے۔

”بکو اس بند کرو قیس اور مجھے بتاؤ تم یہاں کیا کر رہے ہو، کہیں تم نے۔۔۔“ اس نے بات درمیان میں چھوڑ دی کیونکہ اس کا دماغ کام کرنا شروع ہو چکا تھا۔

”پر تم نہیں ملی۔ روپوش ہوتی رہی بلا آخر مجھے اپنی زندگی کے بارے میں کوئی تو فیصلہ کرنا تھا۔ اس لیے میں نے ہمارے نکاح کر لیا۔ میں نے شادی کی خبر تمہیں دی تھی شاید تم نے پڑھی نہیں۔“ شیزل کے ہاتھ میں قید فون میں کال آرہی تھی۔ فون کرنے والا اور کوئی نہیں اُحد تھا۔

”تم نے اس لڑکے کو تو نہیں مار دیا۔ تم نے ایسا کیا ہے نا؟“ ماتھے پر بل ڈالے اس کی بات سنی ان سنی کرتی وہ سوال کر رہی تھی۔ قیس کے سانولے سے چہرے پر خفگی کی سرخی دوڑی۔ وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ قاتل۔۔۔ نہیں ہوں۔“ اتنی ہی دیر میں ایک نرس دوڑتی ہوئی وہاں سے ڈاکٹر کو بلانے گئی تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم آئی سی یو میں گئی اور باہر آ کر لڑکے کے مرنے کا اعلان کر گئی۔ شیزل قیس کو تکے جا رہی تھی۔ جیسے وہ اسے پڑھنا چاہ رہی ہو۔ جیسے وہ اسے کھوجنا چاہ رہی ہو۔

”ایسا کیوں کیا؟“ اس نے سرگوشی کے عالم میں پوچھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ ماتھے پر بل ڈال کر آنکھیں نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کمال، راحیل اور ماریہ تینوں وہیں آ گئے۔ صورتحال ہی ایسی ہو گئی تھی کہ انہیں آنا پڑا۔

”تم نے اسے مارا، تم۔۔۔ تم یہاں اسی لیے ہو۔“ وہ کھڑی ہو کر اس کے سینے پر انگلی ٹھونک رہی تھی۔ قیس ایک بار پھر خود کا تماشا نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ وہ پھر سے خود کو ذلیل نہیں کروانا چاہتا تھا۔

”میں نے کہا۔۔۔۔۔ میں نے اسے نہیں مارا۔“ وہ اسے وارن کر رہا تھا۔ بات اب کافی بڑھ رہی تھی۔ معاملہ اب حدود سے باہر جا رہا تھا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔“ وہ حلق کے بل چیختی تھی۔“ قاتل ہو تم۔ ایک نہیں دو نہیں پورے چار قتل کیے ہیں تم نے، خدا کا خوف نہیں ہے تمہیں۔ ظالم ہو تم، سفاک، درندے۔“ اس نے ایک بار پھر سے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا جسے قیس نے جھٹکے سے چھڑوایا۔ اب نہیں۔ اب مزید نہیں۔ وہ جان گیا۔ اس عورت سے سرکھپانا خود کو رسوا کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے وہ چند قدم اس سے دور ہوا تھا۔ ستا ہوا چہرہ، سرخ آنکھیں، گرم کان۔

”یونواٹ، یو آر آ سائیکو۔“ وہ کہہ کر مڑ گیا تھا۔ شیزل نے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔



”جیری، جیری، جیری۔“

برف پر اسکیٹنگ شوز ہوا کی اسپیڈ سے گزر کر گئے تھے۔ اتنی برق رفتاری سے کہ گزرنے کے بعد وہاں لکیریں پڑ گئی تھیں۔ سیاہ ربڑ کا چست سوٹ، سر پر سیاہی مائل نیلا ہیلمٹ، آنکھوں پر سفید فریم والے بڑے بڑے سیاہ شیشوں کے طرز کے پلاسٹک کے گلاسز اور آگے کو جھکتا تیزی سے برف پر پھسلتا وجود، یہ اس سال کا پہلا اور سب سے بڑا آئس اسکیٹنگ ٹورنامنٹ تھا۔ جس میں قریباً بارہ لوگوں نے شمولیت اختیار کی تھی۔ ان بارہ لوگوں میں وہ بھی تھا جسے لوگ اب جیری کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ نام اس کے نٹ کھٹ انداز، شرارتی موڈ اور ایٹی ٹیوڈ کی بنا پر اس کی کلاس فیلوز نے رکھا تھا بعد از ہر کوئی اسے اسی نام سے شناخت کرنے لگا۔ وہ کون تھا۔ وہ بھول چکا تھا۔ اس کی ذات و پہچان کیا تھی۔ اس نے فراموش کر دیا تھا۔

برف پر پھسلتے بارہ لوگوں میں سے دو سب سے آگے تھے۔ مگر اس طرح کہ کبھی وہ اپنے حریف کو آگے کرتے کبھی پیچھے، چوہے بلی کا کھیل تھا جو ان دونوں کے درمیان شروع ہو چکا تھا۔ وہ دونوں جیری اور ٹینا تھے۔ وہ دونوں ہی کلاس فیلوز تھے۔

”ہے جیری۔“ ہوا کی رفتار میں اس تک پہنچتی ٹینا پھیپھڑے پھلاتے ہوئے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہ اسی قسم کی پکار کا منتظر تھا۔ مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے جیتنے دو وعدہ کرتی ہوں تمہیں ڈیٹ کروں گی۔“

”کیا واقعی؟“ وہ یقین دہانی چاہ رہا تھا جو اسے مل بھی گئی۔ دو تین کینڈی ڈیٹ ہوا کو چیرتے ہوئے ان کے درمیان میں سے گزرے تھے۔

”بالکل، تم جانتے ہو میں وعدے کی پکی ہوں۔“ جیری نے ان چار لوگوں کو دیکھا جو ان سے آگے تھے پھر ماڈل فلر والی ٹینا کو۔ جس کو وہ ایک ہفتے سے جانچ رہا تھا۔ جو ایک ہفتے سے

اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔

”ٹھیک ہے پھر، جیت جاؤ۔“ اس نے رفتار پکڑی تھی۔ بات ختم کر کے وہ دوبارہ کھیل میں شامل ہو چکے تھے۔ ٹینا کے پیچھے جیری بھی لپکا تھا۔ ہاتھوں کو مخصوص انداز میں ہلاتے ہوئے ان دونوں نے باقی سب کو پیچھے چھوڑا۔ فنشنگ لائن سے تھوڑا سا پہلے جیری نے خود کو نامحسوس انداز میں آہستہ کیا تھا۔ ٹینا ربن توڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جیری کی صدائیں لگاتے اس کے دوست ”اووو۔۔۔“ کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکے۔ مقابلہ ختم ہوا تھا۔ اس سال کی آئس اسکیت چیمپئن ٹینا مار جرتھی۔ ڈریسنگ روم میں جیری اپنی بنا بازوؤں کی جیکٹ کو پہن کر ٹھیک کر رہا تھا جب اسے اپنے پیٹ پر نسوانی ہاتھ محسوس ہوئے۔ وہ ٹینا تھی جو عقب سے اسے ہگ کر رہی تھی۔

”تمہارا شکریہ، میری زندگی کا ایک خواب پورا کیا ہے تم۔“ جیری نے اپنے پیٹ پر سے اس کے ہاتھ ہٹائے اور مڑ گیا۔ وہ اس کے عین سامنے تھا۔ دراز، پرکشش اور سحر انگیز شخصیت کا حامل، جس کے کان میں سیاہ موتی تھا۔ منہ میں ہمہ وقت رہنے والی چیونگم اور کانٹوں والے بال۔ وہ یونیورسٹی کا سب سے مغرور، بدتمیز اور ہر دل عزیز لڑکا تھا۔ ہارٹ آف دا ہارٹ۔ چاکلیٹی بوائے۔

”مگر ایک قیمت کے ساتھ، تمہیں پتا ہے جیری کسی پر احسان نہیں کرتا۔“ وہ جتا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ وہ جان گئی۔

ٹینا ایک ماہ تک اسے ڈیٹ کرتی رہی تھی۔ اس دوران وہ اس لڑکے کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکی تھی۔ اور اس میں اس کا کمال نہیں تھا۔ یہ جیری کی شخصیت تھی جس نے اسے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ یوں بھی ان دونوں کے کپل کو یونیورسٹی اور انسٹا گرام پر بہت سراہا گیا

تھا۔ اس پر ٹینا نے فیصلہ کیا تھا۔ وہ جیری سے شادی کرے گی۔ ایک دن اس نے نیویارک کی سڑک کے کنارے انتظامات کروا کر اسے پرپوز کیا تھا۔ جسے جیری نے پھولوں کا گلدستہ اس کے منہ پر مار کر اسے انکار کیا تھا۔ شادی سے اسے نفرت تھی۔ عورت اس کیلئے ایک گالی تھی اور وہ اس گالی کو اپنی زندگی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بالکل بھی نہیں۔

”ٹینا کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا تو نے۔“ اس کا دوست اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس وقت مکمل طور پر ڈرنک تھا۔ کاؤچ پر لیٹا ادھ کھلی آنکھوں اور ماؤف دماغ کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔ اس نے اپنے لب ہلائے، مدھم انداز میں، لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ۔۔

”اور میرے ساتھ زندگی نے۔“ اس کے آنکھ کے کونے سے پانی ٹپک گیا تھا۔ وہ چھت کو پلکیں جھپک جھپک کر گھورتا اپنے حواسوں میں بالکل بھی نہیں تھا۔

”وہ تجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اسلام لانے والی تھی۔“ چھت اسے پانیوں میں ڈوبتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور ایک زمین میں لٹک رہا تھا۔ لٹکے ہوئے ہاتھ سے تھوڑے سے فاصلے پر شرتی رنگ کی بوتل پڑی تھی جو اس وقت بالکل خالی تھی۔

”ایک کافر کیلئے اسلام لائے گی وہ ہونہ، عجیب۔“ اس کا دوست اسے ترحم بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ جب اسے ملا تھا۔ تب وہ ایک شی میل کے روپ میں تھا اور آج، آج وہ ایک مرد تھا۔ ایک ٹوٹا بکھرا بے حس مرد، جس کی زندگی کے ان پڑھے باب کبھی بھی اس کیلئے نہیں کھلے تھے۔ جو بلا کا فلرٹی تھی۔ جس کی ان گنت گرل فرینڈز تھیں۔ اور وہ اس سب کے باوجود شادی اور بندھن سے ایسے بھاگتا تھا جیسے وہ اس کیلئے موت ہوں۔ اور وہ تھے۔ کم از کم اس کیلئے تو تھے۔ وہ سالوں سے کسی بھی شادی کے فنکشن میں نہیں گیا تھا۔ خواہ وہ اس کے کسی کزن کی شادی ہو یا پھر دوست کی، اس نے کبھی بھی خود کو اس جگہ کا حصہ نہیں بنایا تھا اور نہ ہی

کبھی وہ بنا سکتا تھا۔

”بکو اس بند کر، کون کیا ہے اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیں نہیں ہے۔ ابھی تو ہوش میں نہیں ہے۔ صبح بات کریں گے۔“ اس کا دوست چلا گیا تھا۔ مرروال رات دکھا رہی تھی اور وہ چھت کو گھور رہا تھا۔

”کیا ہی اچھا ہو جو اس وجود کی صبح نہ ہو۔“ اس نے سوچا تھا۔ وہ فقط سوچ ہی سکتا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ نتھنوں کے ارد گرد لگا سفید سفوف اس کے دماغ میں پہنچا اور کچھ دیر بعد خون کی منھی منھی بوندیں گرا گیا۔ جو پھسلتی ہوئیں اس کے ہونٹوں کے کناروں پر آ کر رک گئیں۔ وہ یونہی چھت کو گھورے ٹھس لیٹا رہا کہ اب کچھ بھی نہیں بچا تھا کرنے کو فقط بے ہوشی کے، کیونکہ اسی میں اس کیلئے نجات تھی۔ اسی میں ہی اس کی ذات تھی۔

☆.....☆.....☆

بعض الآلام جبارک تصنع منه انسانا قوی لمواجهه الحیاة

(کچھ تکلیفیں آپ کیلئے تحفہ ہوتی ہیں، جو آپ کو زندگی کا سامنا کرنے کیلئے ایک مضبوط انسان بناتی ہیں)

”آؤ، تم کر سکتی ہو۔“ اس کی آنکھوں پر تھری ڈی کیمرہ لگا تھا۔ اس کیمرے میں وہ خود کو ایک پارک میں دیکھ رہی تھی۔ اس امیوزمنٹ پارک میں لوگوں کی بہتات تھی۔ ایک جم غفیر تھا جو وہاں موجود تھا۔ ہیڈ فون سے آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس کا بھائی اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا۔

”میں یہ نہیں کر سکتی۔“ وہ اس فلم میں خود کو اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے میں دیکھ رہی تھی۔ اس دروازے کے بالکل سامنے ایک اور دروازہ تھا جس پر لکڑی کے حروف سے ”امید

کا دروازہ ”ڈور آف دی ہوپ لکھا ہوا تھا۔ اس کے بھائی نے کہا جس کی آنکھوں پر اس کی بہن جیسا ہی کیمرہ لگا تھا۔ وہ اس کے شانے سے شانہ جوڑے کھڑا تھا۔

”تم کر سکتی ہو، جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔“ مضبوط یقین دہانی، تحفظ کا احساس۔ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ پھیلا کر کہہ رہا تھا۔

”آؤ رتبہ، پلیز میرے لیے آؤ۔“ اس کی بہن نے ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں چلتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر آئے۔ یہ ایک خوش آئندہ قدم تھا جو ان دونوں نے ساتھ اٹھایا تھا۔ سفید کوٹ والے کا اور اس کے بھائی کا دل خوشی سے پر ہو گیا۔ اسکرین پر وہ دونوں اس امیوزمنٹ پارک کے دروازے کے سامنے نظر آ رہے تھے۔ پھر اس کے بھائی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ وا کر دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا تھا۔ اندر زندگی تھی۔ بوڑھی، جوان، ادھیڑ عمر اور بچگانہ، ہر قسم کی چمک وہاں نظر آ رہی تھی۔ ہر قسم کی آسودگی وہاں دکھ رہی تھی۔

”چلیں۔“ اس نے اپنی بہن کا ہاتھ کھینچا مگر وہ نہیں ہلی۔ اسے اپارٹمنٹ کی ایک ایک اینٹ کا معلوم تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اس وقت کہاں کھڑی ہے۔

”میں یہ نہیں کر سکتی، میں نہیں آ سکتی۔“ وہ اسے رد کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ اس بار جھٹکنے نہیں دیا گیا۔ اس بار رد نہیں کروایا گیا۔

”تمہیں کرنا ہوگا، میری خاطر۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے پارک کی چوکھٹ میں آن کھڑا ہوا۔ رنگ رنگ کے جھولے تھے۔ رنگ رنگ کی لائٹس تھیں۔ دروازہ بھی تو رنگ بہ رنگی بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔

”ممکن نہیں لگتا، میرا دل بند ہو جائے گا۔“ اس کے بھائی نے اسے خود کے ساتھ کھینچ لیا تھا۔ جونہی وہ عوام میں آئی اس کی چیخیں شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے بھائی نے برق رفتاری

سے کیمبرہ اپنی اور اس کی آنکھوں سے اتارا پھر اس کے سر کو شانے سے لگاتے ہوئے تھپکنے لگا۔
 ”شش، بس ٹھیک ہے۔ ہم واپس آ گئے ہیں۔ رتبہ اٹس او کے۔“ وہ گہرے گہرے سانس
 لیتی کانپتے ہاتھوں سے اس کی شرٹ تھام گئی تھی۔

”میں نہیں کر سکتی، میں، میں چاہ کر بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ رو رہی تھی۔ ہچکیوں کے
 ساتھ، دلجمعی سے۔

”ٹھیک ہے نا، ہو گیا۔ بس اب چپ کر جاؤ۔“ اس کی تسلی پدرانہ تھی۔ اس کی محبت
 مخلصانہ۔

”میں تنگ آ گئی ہوں۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ مجھے نہیں جینا مزید۔“
 لڑکے کے شانے بے بسی سے ڈھلک گئے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

”ایسے نہیں کہتے بری بات ہوتی ہے۔ مایوس نہیں ہوتے۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ ایک یہی
 چیز تھی جو وہ اس وقت کر سکتا تھا۔

”ایک بند گھر میں رہ کر میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔ وہ، وہ مجھے آزاد کیوں نہیں کرتا اس
 تکلیف سے۔“

اس نے ٹشو پیر اٹھا کر اس کے آنسو پونچھے، ترچہ خشک کیا اور تحمل سے گویا ہوا۔
 ”ہمارے دکھ اتنے گہرے نہیں ہوتے رتبہ جتنے ہمارے بزرگوں کے ہوتے تھے۔ انہوں
 نے تو پہاڑوں سے بھی بڑی آزمائشیں سہی ہیں۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارا کیا ہے۔ وہ بھی تو
 ہمارے طرح انسان ہی تھے نا۔“

رتبہ نے جھٹ سے کہا۔ ”مگر وہ بزرگ تھے اور اسی وجہ سے تھے۔ ان کے حوصلے، ان کی
 استقامت کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے، اگر ہم کر سکتے ہوتے تو ہمارا شمار بھی انہیں میں ہوتا مگر

افسوس ایسا نہیں کیونکہ ہم ویسے نہیں ہیں۔“

”تمہاری بات سے متفق ہوں لیکن کیا ہم صابرین میں سے بھی نہیں ہو سکتے، صبر بھی تو انہیں کی صفت ہے۔ صبر کریں گے تو ضرور اجر ملے گا۔ یقین کرو میری آنکھیں تمہیں کھلی فضا میں پرندے کی طرح اڑتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔“

وہ اپنے بھائی کی آنکھوں میں جلتے جوت کو نہیں بجھا سکتی تھی۔ وہ اسے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس گھر سے اس کی روح پرواز کرے گی۔ اس کا وجود کبھی بھی جیتے جی باہر نہیں جاسکتا تھا کبھی بھی نہیں۔ دروازے پر بیل ہوئی دونوں بری طرح چونکے۔ اس لڑکے کے فون پر ایک میسج آیا تھا جس پر آنے والے کا نام درج تھا۔ وہ اس نام کو پڑھ کر ساکت رہ گیا بالکل ساکت۔

”کک کون ہو سکتا ہے۔“ رتبہ کے پوچھنے پر اس کے بھائی نے لب تر کیے، چلتا ہوا مین ڈور کے قریب آیا۔ اس کے کان میں لگی بلوٹھ میں سے اس کے دوست کی آواز آرہی تھی۔

”ایزی، چلی جائے گی وہ۔“ اس کے دوست نے اس وقت کہا تھا جب وہ لڑکا کی ہول کا کور ہٹا رہا تھا۔ اس کے کہنے کے بعد اس نے کی ہول میں سے باہر جھانکا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ لڑکے نے کہا۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔“ اس اعلان پر اس کا دوست بھونچکا رہ گیا۔

”پاگل ہو۔“ وہ اسے ڈپٹ رہا تھا۔ ”وہ باہر ہی ہے ابھی اس لیے تم بے وقوفی مت کرنا۔ دروازہ مت کھولنا، میں نے کہا دروازہ مت کھولنا۔“ وہ اسے وارن کر رہا تھا۔ شدت سے کر رہا تھا۔

”وہ اندر نہیں آنا چاہتی۔ پریشان ہے۔ سگریٹ پی رہی ہے۔ اس نے چہل قدمی کرتے ہوئے ایسے ہی بیل پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ تم دروازہ مت کھولو اور تختل سے جا کرواپس بیٹھو۔“

اس نے اپنے دوست کی بات نظر انداز کی۔ اس کا دماغ ایک ہی نقطہ پر اٹک گیا تھا۔ بری

طرح اٹک گیا تھا۔

”وہ اسموکنگ کر رہی ہے۔“ بے یقینی سے پوچھا گیا۔

”اس وقت رتبہ ضروری ہے وہ نہیں، اس لیے میں نے کہا چپ چاپ جا کر بیٹھ جاؤ۔“
آنے والے خطرے سے بچاؤ کی خاطر وہ اسے ہدایت دے رہا تھا جو ہدایت سننے کا اہل نہیں
لگ رہا تھا۔

”وہ اسموکنگ کیسے کر سکتی ہے۔“ اس کے دوست نے ضبط سے اسے جھڑکا۔

”تم دوسرے دروازے سے باہر آؤ، میں نے کہا فوراً۔“

”اسموکنگ اور وہ۔“ حیرت ہی حیرت تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”یار تمہیں سمجھ آ رہی ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ وہ کچھ سوچ کر پلٹ گیا۔ صوفے کے
پچھے چھپی رتبہ کے قریب آیا۔ اسے کہنی سے پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔ بیڈ پر اسے بٹھا کر اس
کے قدموں میں بیٹھ کر اس سے کہہ رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ فوراً فلوور کے کچھ بچے ہیں جو شرارتیں کر رہے ہیں۔ میں انہیں بھگا کر
آتا ہوں تم ایزی رہو۔“ وہ اسے تسلی دے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

یکے بعد دیگرے لگے صدموں کے زیر اثر شیزل کو اپنا دماغ مفلوج ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ
اسموکر نہیں تھی مگر جب سے اس فیلڈ میں آئی تھی، پریشانی اور اور تھکنگ سے عاجز آ کر کبھی
کبھار کچھ کش لگا لیتی تھی۔ ابھی بھی رات کے اس پہر وہ ٹہلتی ہوئی تھرڈ فلوور پر آگئی جہاں اس
کی طرح کے دو اپارٹمنٹ تھے۔ ان دونوں اپارٹمنٹس میں کون کون رہتا تھا وہ ہرگز نہیں جانتی
تھی۔ بے مقصد ہی ایک اپارٹمنٹ کی بیل بجانے کے بعد اسے اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا۔
کچھ دیر کھڑی رہی کہ معذرت کر لے گئی لیکن جب کوئی نہیں آیا تو وہاں سے چلی گئی۔ وہ بلڈنگ

سے باہر آ گئی۔ رات تین بجے کا وقت تھا۔ اس وقت ہر طرف کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ فٹ پاتھ پر آ کر بیٹھی۔ ایک کش بھرا پھر دونوں ہاتھوں میں سر گرا لیا۔ چند لمحے سر کے اسے اپنے قریب کسی کے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس خوشبو کو پہچانتی تھی۔ وہ اس احساس کو پہچانتی تھی۔ اس نے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ آنے والے نے اس کی انگلیوں میں دبی سگریٹ کو کھینچا، شیزل نے آنکھیں بند کر کے خود پر کنٹرول کیا پھر دانت کچکچا کر اس نے سر اٹھایا تھا۔ وہ سپاٹ چہرے اور سکوت میں ڈوبی گہری آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اب کیا کر رہے ہو یہاں پر، سب تو ختم ہو گیا۔ اب کیا دیکھنے آئے ہو۔“ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ چہرے پر حدت کی سرخی تھی۔ انگلیوں میں شیزل کی آدھی پی ہوئی سگریٹ تھی جس کا شعلہ تاہنوز جل رہا تھا۔

”پرسوں وہ لڑکا قتل ہوا اور آج مجھے معطل کر دیا گیا۔ پٹی اتر گئی ہے میری، خوش ہو جاؤ تم۔“ قیس کے عقب میں چار پانچ کتے بھونکتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ دور، بہت دور بلڈنگ کی اندھیرے میں ڈوبے اپارٹمنٹس نظر آ رہے تھے۔ وہ کھڑے قد سے اس کے سامنے پنچوں کے بل بیٹھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں ٹولیس پھرا گئے تھے تو تھوڑی پر رکھ کر اس کے مسوڑھے جانچنے لگ گیا۔ نتیجہ حاصل ہونے پر اس کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ شیزل کے مسوڑھے گلابی پن چھوڑ کر بھورے ہونا شروع ہو چکے تھے۔ یعنی سگریٹ کا استعمال کبھی کبھی پر مشتمل نہیں رہا تھا۔ واثق امید ہے اگر وہ یونہی اسموکنگ کرتی رہی تو اس کے مسوڑھوں کے ساتھ اس کے دانت اور ہونٹ بھی سیاہ پڑ جائیں گے۔ قیس کی آنکھوں کا غصہ شیزل کی آنکھوں نے بغور دیکھا تھا۔ وہ اپنا غم بھول اس کے اشتعال سے مغلوب ہو گئی۔ یہ مرعوبیت کی انتہا تھی تبھی اس کے لب بستہ تھے۔

”کب سے شروع ہے یہ۔“ اس نے انگلیوں میں دبی سگریٹ کو بلند کر کے پوچھا جس کی راکھ قیس کے ہاتھ کی پشت پر گر کر اسے جلا رہی تھی۔ ان کے عقب میں لڑتے کتے اب اپنی جگہ بدل رہے تھے۔

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔“ ترخ کر جواب دیا گیا۔ قیس کے ماتھے کی رگ پھڑکی۔
 ”کوئی اور ڈرگ؟“ جواب ندارد، اس کی بے یقینی و غصے کے ملے جلے تاثرات والی آنکھوں میں ان دیکھی نمی کی پرت چڑھی تھی۔ قیس کو اپنی آنکھوں کے کناروں پر مرچیں محسوس ہوئیں۔
 ”میں نے کوئی سوال کیا ہے تم سے۔“ سردی غراہٹ، شیزل نے لبوں پر زبان پھیری۔
 ”ایک بار۔“ اس نے تھوک نگلا۔ قیس کی اتنے قریب موجودگی اوپر سے اس کے اندر غصے کے اٹھتے ابال کی گرمی، وہ حواس باختہ ہو گئی۔ لفظ بھول گئی۔

”ایک بار کیا؟“ سڑک پھر سے سنسان ہو چکی تھی۔ کتے ایک دوسرے سے لڑ کر، بھونک کر جانے کہاں چلے گئے تھے۔ شیزل نے اپنی آواز سنی، شرمندہ سی، بجھی بجھی۔
 ”آئس۔۔۔ لی تھی۔“ قیس کا ہاتھ پوری قوت سے فضا میں اٹھا اور اس کے گال کے قریب جا کر رک گیا۔ شیزل نے گال پر ہاتھ رکھ کر سر کو جھکایا تھا۔ اس کا دل پسلیوں میں دھڑکنا شروع ہوا تھا۔ جونہی اس نے واپس سر اٹھایا تو دیکھا وہ اپنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر اسے واپس کھینچ رہا تھا۔ ہتک سے شیزل کے کان سرخ ہو گئے۔ اگر یہ تھپڑ پڑ جاتا تو آج وہ اس کیلئے قیس الہیٰ کو معاف نہ کرتی۔ آج وہ اس کا برابر جواب دیتی۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

”غیرت بھول گئی ہونا تم، اپنی اخلاقیات گنوا دی ہیں تم نے جو اس راہ پر چل پڑی ہو۔ شرم سے ڈوب مرو۔“ وہ کہہ نہیں رہا تھا بلکہ غصے سے پھنکار رہا تھا۔ اس کے الفاظ بھاری پتھر تھے جو روح تک کو زخمی کر گئے تھے۔ شیزل نے چھوٹے ہی کہا۔

”کیوں، میں کیوں مروں، میری زندگی ہے۔ میں چاہے سگریٹ پیوں یا ڈرگز لوں تم کون ہوتے ہو دخل اندازی کرنے والے۔“ ماتھے پر بل ڈالے وہ اپنے سامنے پنچوں کے بل بیٹھے شخص کو دیکھ کر گویا ہوئی تھی۔ اسے للکار رہی تھی۔ وہ اس سے نالاں تھی۔ یہ بات اس کے روم روم سے چھلکتی تھی۔

”بار بار میری حیثیت پر انگلی مت اٹھایا کرو شیزل، جس دن مجھے دوبارہ غصہ آ گیا اس دن میں نے تمہیں قتل کر دینا ہے۔“ وہ یکدم ہنسی تھی۔ سر پیچھے گرا رہی تھی۔ گھٹنہ تھوڑا سا اوپر اٹھا رہی تھی۔ پھر وہ ہنستے ہنستے رکی، چہرہ اس کے چہرے کے عین سامنے کیا اور سرد بجھے الفاظ اس پر چھوڑ دیے۔

”ایک قاتل فقط قتل ہی کر سکتا ہے۔ ہم۔“ اس کے منہ سے سگریٹ کی بو پھوٹی۔ قیس کے ماتھے کی رگ مسلسل پھڑک رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کیا کر دے۔

”اور رہی بات مجھے ہاتھ لگانے کی تو مرگئی وہ شیزل جس پر کبھی تم جنونی کا بس چلا تھا۔ ہاتھ لگا کر دکھاؤ کاٹ کر رکھ دوں گی۔“ وہ اسے دیکھتا رہا۔ ایک لمحہ، دو لمحہ تیسرے پل اس نے شیزل کا بازو کہنی سے اوپر دو چا اور اپنے ساتھ ہی کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

”وہ شیزل آج بھی زندہ ہے اور اس کا عملی نمونہ میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں۔“ وہ اس کے مشتعل انداز پر شذر رہ گئی۔ اس کی گرفت کی سختی ایسی تھی کہ وہ ساکت ہو گئی تھی۔ اس کے خیالات منتشر ہونے لگے تھے۔ اس نے انہیں یکجا کیا پھر گرہ لگالی کہ نہیں، ابھی مغلوب نہیں ہونا۔ ابھی ہار نہیں ماننی۔ ابھی مقابلہ کرنا ہے اور ڈٹ جانا ہے۔ وہ ڈٹ گئی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم۔“ سنبھلتے ہوئے وہ چیختی تھی۔ قیس اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لے کر جا رہا تھا۔ شیزل نے بھرپور مزاحمت کی مگر بے سود۔

”سگریٹ جو چڑھ گئی ہے ناتھہارے دماغ پر اسے اتار رہا ہوں۔“ اسے جیب میں بٹھانے کے بعد وہ خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رہا تھا۔

”قیس اگر جیب چلی تو سچ کہہ رہی ہوں میں چھلانگ لگا دوں گی۔“ اگنیشن میں چابی ڈالتے ہوئے وہ اس کی بات سن رہا تھا۔ جیب کو اشارت کرنے سے پہلے اس نے ایک پل اس لڑکی کے اٹل ارادوں پر غور کیا پھر سر ہلاتا ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اتر آیا۔ بیک سیٹ سے اس نے پلاسٹک کی تار اٹھائی اور پیچھے سے ہی اس کے گرد لپیٹ کر کسے لگا۔ ارادہ مصمم تھا گویا آج چھوٹ ہر گز نہیں تھی۔

”ایکچو کلی تم ٹھیک ہو، جتنی سسکی، بدتمیز، زبان دراز اور بے حس تم ہونا، یہ کر لو گی۔“

شینزل ششدر سی اسے خود کے دونوں ہاتھ تار میں جکڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا یہ سب قیس اس کے ساتھ کر رہا ہے۔ اسے بالکل بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔“ وہ چلائی۔

”پہلے نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔ اپنی سگریٹ کا شکریہ ادا کرو۔“ وہ جیب سٹارٹ کر چکا تھا۔

راتے میں ایک ناکے پر اسے روکا گیا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھایا۔

”یہ کرمٹل ہے؟“ ناکے پر رکنے سے پہلے قیس نے اسے پی کیپ پہنا دی تھی اس طرح کہ وہ پوری کی پوری اس کے چہرے پر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ مکمل طور پر چھپ چکا تھا۔

”جی جناب، بہت بڑی کرمٹل۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے جیب اشارت کر دی۔

شینزل نے غصے سے دانت کچکچائے۔ وہ ایک دن اس شخص کا قتل کر دے گی۔ وہ جانتی تھی۔



”یہ اچھا نہیں ہوا، میم کو سسپینڈ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ نشاء اس وقت سعد کے ساتھ بیچ پر

بیٹھی تھی۔ آج سعد کے بدن پر سفید کوٹ نہیں تھا۔ وہ لیب کے باہر بچھے بیچ پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے موجود راہداری میں سے پولیس اہلکار آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔ انکو آری ٹیم نے ان کی ایک نہیں سنی، یہاں تک کہ قیس سر کی وضاحت پر بھی غور نہیں کیا گیا ورنہ میڈم لا محدود مدت کیلئے معطل ہونے سے بچ جاتیں۔“ جتنا نشاء کو شینزل کیلئے برا لگ رہا تھا۔ اتنا ہی سعد کو بھی برا لگ رہا تھا۔

”تم نے ٹھیک کہا، قیس سر پورے دو دن لڑے ہیں ان کیلئے، خط عشق میں مخاطب لڑکی صرف شینزل ہی نہیں ہو سکتی اور ”ایس، ایل“ کا مطلب شینزل ہی نہیں ہوتا۔ اس بات کو کتنے مدلل انداز میں قیس سر نے بیان کیا تھا اور یہ تک کہا تھا کہ اس کیس کو وہ لیڈ کر رہے ہیں۔ انہیں معطل کرنا چاہیے نہ کہ شینزل میم کو مگر پھر بھی آج میم نہیں ہیں یہاں۔“ سعد نے ٹھنڈی آہ بھری، تھکاوٹ سے بھرپور، بے بسی میں لپٹی ٹھنڈی آہ۔

”یہ شکر ہے نشاء کہ شکوک کی بنا پر میڈم کو سزا نہیں دی گئی۔ کیس سلجھنے تک کا وقت ملا ہے ورنہ میڈم اس وقت سلاخوں کے پیچھے ہوتیں۔“ نشاء اس کی بات پر ہنس دی، استہزائیہ مسکان۔

”معطل ہونا ایک بات ہے۔ سزا ملنا ایک بات، جب تک قیس سر ہے نا شینزل میم کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“ وہ تائیدی انداز میں سر ہلارہا تھا۔

”یہ تو ٹھیک کہا تم نے، قیس سر پاگل ہیں ان کے پیچھے، میں تو حیران ہوتا ہوں کوئی مرد ایک عورت کو اس طرح سے بھی چاہ سکتا ہے۔“ نشاء مسکرائی پھر رشک بھرے انداز میں بولی۔

”ہاں اگر وہ مرد قیس الہی ہو تو۔“ اس نے بھی ایک آہ بھری تھی۔ پھر وہ مزید کہہ رہی تھی۔

”میم نے کتنا ذلیل کیا انہیں، کس طرح گریبان سے کھینچ کر سلاخوں کے پیچھے بند کیا۔ ان پر انکو آری بٹھائی گئی۔ سوال اٹھے پھر بھی وہ اس بات کو درگزر کر گئے۔ پھر بھی وہ اپنی بساط کے

مطابق میم کیلئے لڑ گئے۔ ہائے بندہ ہو تو ایسا ہو ورنہ نہ ہو۔“ سعد نے خفگی سے اسے ٹکا۔ اس کی آنکھوں میں تاسف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

”پھر شروع ہو گئی تمہاری آپس شرم کرو لڑکی اور مت بھولو کہ تمہارے قیس سرودھ کے دھلے نہیں ہیں۔ ہمارے شادی کر کے بیٹھے ہیں اور تو اور اس سے ایک اولاد بھی ہے ان کی۔“
نشاء نے کڑوے منہ کے ساتھ اسے دیکھا۔ سارے فسوں کا بیڑا غرق کر دیا اس بندے نے۔
دل تو کیا دو چار کے رسید کر دے مگر ضبط کر گئی۔

”جو بھی ہو، دوسری شادی کریں یا تیسری یا کرکٹ ٹیم جمع کریں، محبت ان کی شینل میم ہی ہیں اور یہ دکھتا ہے۔ جو والہانہ پن شینل میم کیلئے دکھتا ہے نا ان کا کبھی ہمارے میم کیلئے بھی محسوس ہوا؟ نہیں، کیونکہ ان کا دل آج بھی شینل میم کے پاس ہے۔ میں تو اس بات پر افسوس کر رہی ہوں کہ اتنے سالوں سے ان کے ساتھ کام کرنے کے باوجود ہم یہ کیوں نہیں جان پائے کہ ان کے نام کے آگے لگا قیس الہی دراصل ان کے شوہر کا نام ہے۔ پہلے پتا ہوتا تو ہم پہلے ہی ان کو ملا دیتے۔ ہمارے میان میں ہی نہ آتی۔“ سعد نے اسے ٹھوکا دیا کیونکہ سامنے سے ہی ہمارے کچھ فائلز تھامے چلی آرہی تھی۔ مگر صد شکروہ ان تک نہیں آئی۔ وہیں سے ہی دوسری جانب مڑ گئی۔

”اب کیس کا کیا بنے گا کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ قیس سر اور شینل میم دونوں ہی اس وقت خطرے میں ہیں۔ ثبوت قیس سر کے خلاف ہیں تو خط عشق میں مخاطب شینل میم کو کیا گیا ہے۔ اور یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ قیس سر شینل میم کو کیوں کسی بھی خط میں مخاطب کریں گے۔ دوسرا وہ قتل کریں گے ہی کیوں۔ اور اگر وہ کر بھی رہے ہیں تو پاگل ہیں جو خود کو پھنسا نہیں گے۔ ڈیڈ باڈی کو ٹھکانے لگانے کے ایک سو ایک طریقے ہوتے ہیں خاص کر اس انسان کے پاس جو کرائم ونگ سے جڑا ہو۔ ضرور یہ کوئی اور ہے جو ان دونوں کو پھنسا رہا ہے۔“

نشاء شانے اچکاتی کھڑی ہو گئی۔

”پتا نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ میرے تو دماغ کی دہی بن گئی ہے بھئی۔“ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کہہ رہی تھی۔ سعد نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔

”اب تم جا کہاں رہی ہو؟“

”جاسمین میم نے بلایا تھا دیکھو کیا کہتی ہیں وہ بھی۔“ سعد نے سر ہلایا۔ وہ وہاں سے کچھ دور جاسمین کے کیمپ میں گئی۔ جہاں وہ کچھ فائلز کھولے بیٹھی تھیں۔ ہما وہیں ایک کرسی پر دراز تھی۔ نشاء کے اندر آنے سے پہلے وہ کرسی سرکا کر کھڑی ہوئی۔ جونہی مڑی تو اس کی نظر نشاء پر پڑی تھی۔ وہ اسے مسکراہٹ پاس کر کے چلی گئی۔ نشاء نے جاسمین کو سیلیوٹ مارا اور ان کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے والا ہے نا تمہارا۔“ نشاء نے ان کے سوال کا جواب دیا۔

”جی بس ایک گھنٹے تک ہی فری ہونے والی ہوں۔“ اسے جاسمین سے ڈر لگتا تھا۔ یہ بات جاسمین اور یہاں کا ہر فرد جانتا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر۔“ انہوں نے جھک کر میز کے نیچے سے کچھ سیلڈ بیگز برآمد کیے۔“ جاتے ہوئے یہ شیزل کو دے دینا۔ اس نے آرڈر کیا تھا مگر وہ نہیں تھی تو میں نے ریسو کر لیا۔“ وہ دو چھوٹے چھوٹے سیلڈ بیگز تھے جن پر کسی اسٹور کا نام درج نہیں تھا۔ اس نے وہ بیگ اٹھا لیے۔

”لیس میم۔“

”اور ہاں۔“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ چپ ہو گئیں۔“ کوئی بات نہیں، تم جاؤ۔“

کیمپ سے باہر آتے ہی اس نے آزاد سانس خارج کیا تھا۔ شیزل اور جاسمین کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ جان گئی۔ شیزل نے اپنے مزاج میں سختیاں انہی سے لی ہیں۔ اسے معلوم تھا۔ بلکہ

اسے کیا سب کو معلوم تھا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے شینزل کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا تھا۔ سیکنڈ فلور پر سیکنڈ اپارٹمنٹ کے آگے کھڑی وہ بیل بجا رہی تھی مگر اس کی بیل کا جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ لفٹ کے کھلنے کی آواز پر وہ مڑی تھی۔ ایک خوش شکل سالٹر کا ایک بازو پر کوٹ ڈالے اور دوسرے میں بریف کیس تھا مے کھڑا تھا۔ وہ لڑکا اس لڑکی کو جانتا تھا۔ اکثر دونوں کی ملاقات شینزل کے گھر پر ہی ہوتی تھی۔

”اسلام علیکم، کیا سر پرانز ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا۔

نشاء مسکراتے ہوئے اس کی طرف دو قدم بڑھا گئی۔

”وعلیکم السلام، کیسے ہیں آپ اور آنٹی کیسی ہیں؟“ احد اس کی طرف آیا۔ اس نے جھک کر اپنے دروازے کے کونے پر بریف کیس رکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہیں۔ آپ یہاں خیریت سے ہیں؟“ نشاء نے سیلڈ بیگز اوپر کواٹھائے اور کہنے لگی۔

”شینزل میم کا پارسل آیا تھا اسٹیشن، وہی دینے آئی ہوں انہیں۔“ احد اس بات پر بری

طرح چونکا۔

”ایسا کیسے ممکن ہے۔ شینزل کے آرڈرز میرے آفس کے پتے پر آتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کام کی وجہ سے اکثر اسپاٹ پر نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کا ہر آرڈر میں ہی رسیو کرتا ہوں۔“ نشاء نے شانے اچکائے۔

”ہو سکتا ہے اس بار انہوں نے اسٹیشن کا ایڈریس دے دیا ہو، بائی داوے وہ دروازہ نہیں کھول رہیں۔ گھر نہیں ہیں کیا؟“ احد ایک بار پھر سے چونکا تھا۔ ماتھے پر بل ڈالے الجھے ہوئے انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

”وہ گھر کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو کیس میں بڑی ہے نا۔“ نشاء اس کے چہرے کے تاثرات

سے جان گئی کہ وہ کافی باتوں سے انجان ہے۔ وہ اسے آشنا کروائے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔
 ”ایسا نہیں ہے۔“ پھر اس نے تمام روداد احد کے گوش گزار دی۔ وہ بت بنا اسے سن رہا تھا۔ اس کے ہر لفظ کو سمجھ رہا تھا۔ مگر بولا تو فقط اتنا ہی۔

”پھر شینزل کہاں ہے۔ اگر وہ معطل ہو گئی ہے تو اسے گھر ہونا چاہیے مگر۔“ اس نے لاک کو دیکھا جس کی سرخ ہتی چل رہی تھی۔ ”وہ گھر نہیں ہے۔ کیوں؟“

”آفلورس وہ ڈپریشنڈ ہو گئی مگر بے فکر رہو بالکل ٹھیک ہوں گی۔ وہ توپ ہیں۔“ مسکرا کر کہتی ہوئی وہ وہاں سے جا رہی تھی۔ احد نے جلدی سے اپنے کوٹ کی جیب ٹٹول کر فون نکالا۔ شینزل کا نمبر بند تھا۔ اسے مزید فکر لاحق ہوئی۔ وہ اس کا جی پی ایس دیکھ رہا تھا۔ لوکیشن مل گئی۔ اسے جلد از جلد اپنی منگیتر کے پاس پہنچنا تھا۔ وہ عجلت میں اپنے گھر کے اندر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دیل لاجال بعد دیل لاجا

(دل لگا ہی نہیں دل لگانے کے بعد)

روشن دن سردی کی شدت کو کچھ کم کر گیا تھا۔ سورج آج پورا تھا۔ آسمان نیلے پانیوں سا صاف اور نکھرا نکھرا، کہیں بھی کوئی بھی بادل کا ٹکڑا اس میں بادبانی کرتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ لان بالکل صاف اور سرما کے پودوں سے بھرا کھلا کھلا سا تھا۔ ادھ کھلے پھول کی طرز کا فوارہ اپنے حلق سے پانی کو انڈیل رہا تھا۔ سفید کین کی میز پر ایک ٹوکری میں ریلے مالٹے پڑے ہوئے تھے۔ جبکہ اس ٹوکری کے ساتھ ہی سفید چٹیل پلیٹ میں مالٹوں کو چھیل کر رکھا گیا تھا۔ دوسری جانب چھوٹی سی کالانمک کی شیشی رکھی تھی اور شیشے کے گلاس میں پانی، شینزل ان کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی کھا جانے والی نگاہوں سے گھاس کے مرے ہوئے تنکوں کو

نوپتے قیس کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی پشت اس کی جانب تھی۔ اس نے نیلی جینز کو گھٹنوں سے تھوڑا نیچے تک فولڈ کیا ہوا تھا۔ سفید بالکل سادی ٹی شرٹ کے بازو آدھے تھے۔ ننگے پاؤں کے ساتھ وہ گھاس کے بڑھے ہوئے اور مردہ تنکوں کو نوچ نوچ کر پاس رکھی بالٹی میں ڈال رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ پودوں کی کانٹ چھانٹ کر چکا تھا اس لیے وہ سفید بالٹی اوپر تک بھری تھی۔ ظہر ادا کرنے کے بعد اس نے اس کیلئے مائے چھیل کر پلیٹ میں رکھے اور خود گارڈننگ میں مصروف ہو گیا۔ اس کے سر پر سفید جالی دار نماز کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ تھوڑا سا گھاس کا ٹکڑا رہ گیا تھا۔ جسے صاف کرنے کے بعد وہ کھڑا ہوا۔ بالٹی ایک کونے میں رکھی۔ قینچی چپل پاؤں میں اڑسا کر اس نے پائپ سے ہاتھ، پاؤں اور منہ دھویا۔ یہ سب کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آیا۔ اندر جا کر تو لیے سے ہاتھ منہ سکھانے کی زحمت کیے بنا وہ اس کے دوپٹے کے پلو کو اٹھا کر اس سے اچھے سے منہ رگڑنے کے بعد ہاتھ پونچھتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ شیزل کی خاموشی اور اس کی آنکھوں کے ساکت پنے کو وہ بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔ سر پر سے ٹوپی اتار کر اس نے میز پر رکھی پھر مائے کی ایک پھانک اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔

”خیریت، موڈ ابراؤد لگ رہا ہے محترمہ کا۔“ اس نے شرارتاً کہا۔ شیزل سلگی نہ ہی پھنکاری، مدھم سر د آواز میں گویا ہوئی۔

”جو تم کل رات میرے ساتھ کر چکے ہو اس پر میں تمہیں دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں کجا کہ تم سے بات کروں۔“ وہ جانتی تھی وہ اس کی چپی پر انگلی اٹھا رہا ہے۔ وہ جانتی تھی۔ وہ جب تک چپ رہے گی وہ بے چین رہے گا۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر خاموش تھی بے حد خاموش۔

”کم از کم میں نے پوری دنیا کے سامنے گریبان پکڑ کر رسوا تو نہیں کیا جو کیا رات کیا رات کے اندھیرے میں ہی کیا۔“

سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس سے منہ پھیرے بیٹھی تھی۔ قیس اس کے چہرے کے پتھر یلے پن سے خائف ہو گیا۔ وہ صبح سے وقفے وقفے سے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بامشکل ایک دو جملوں کے بعد وہ پھر سے مکمل طور پر خاموش ہو جاتی تھی جیسے اب ہوئی تھی۔ یہی بات قیس کو بے کل کر رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے عاجز ہوا۔

”کوئی غصے میں اتنا بد صورت لگ سکتا ہے۔ میں نے سوچا نہیں تھا۔ واللہ آپ نے تو تمام ریکارڈ توڑ دیے۔“ وہ شوخ تھا سب جانتے تھے۔ وہ لوگوں کے موڈ کو بدلنے میں ماہر تھا سب کو پتا تھا۔ مگر اس کے تمام حربے شیزل کے آگے صفر تھے یہ بات فقط یہ دونوں ہی جانتے تھے۔

”ناک دیکھو ٹیڑھی ہو گئی ہے آپ کی، آنکھیں سکڑ گئی ہیں اور اسکن۔“ میز پر دونوں ہاتھ باندھ کر آگے کو جھکا۔ ”چچ، چچ، چچ جھریاں پڑ گئی ہیں اس پر، عمر کے اثرات واضح ہو رہے ہیں۔ کم آن تھوک دو غصہ یہ نا ہو وقتی بد صورتی دائمی ہو جائے۔“

شیزل نے اپنی آئی بالز اس کی طرف گھمائیں۔ چمکتے ہوئے سورج میں بیٹھا وہ تازہ تازہ سا انسان اسے زہر لگ رہا تھا۔ اس شخص کے لب مسکراہٹ کو روکنے کی وجہ سے تھر تھرا رہے تھے۔ اور آنکھوں میں تمام جہانوں کا شوق جمع تھا۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ قیس نے عقیدت سے دبی مسکان کے ساتھ دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد پھر سے پھیر رہی تھی۔ قیس کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔

”آہ، میں مان گیا عورت ایک مشکل شے ہے چاہے وہ آپ کی ماں ہو، بہن ہو، بیٹی ہو یا بیوی، آپ اسے کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ چلو پھر ٹھیک ہے۔ آپ نے چپ کا روزہ رکھ ہی لیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ آج پھر میں اپنی کروں گایوں بھی میں جو بھی کہہ رہا ہوں جو بھی کر رہا ہوں آپ کو اثر ہی نہیں دے رہا یعنی آج میں فری ہینڈ ہوں۔“

اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

قیس اس ضدی کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر اس کی طرف آیا قبل اس کے وہ اسے تھام کر کھڑا کرتا اس کا سیل فون چیخ اٹھا تھا۔ کال ہما کی تھی۔ اس نے ایک نظر روٹھی ہوئی شیزل کو دیکھا، ایک نظر فون پر چمکتے نام کو، اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا، شیزل اس کی اولین ترجیح تھی اور وہ ترجیح اس کے سامنے، اس کے ساتھ، اس کے گھر پر تھی۔ اس لیے یہاں پر کسی ”دوسرے“ کی گنجائش ہرگز نہیں بنتی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی۔ وہ ایک بار پھر سے اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ ایک بار پھر سے کال آنا شروع ہوئی۔ شیزل وہاں سے اٹھ کر گئی تھی۔ قیس نے ناچار فون اٹھایا۔

”تمہیں کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔“ قیس سیلپر پاؤں سے اتار کر گھاس پر چلنے لگا۔

”تھوڑا صبر بھی کر لیا کرو۔ جب میں کال کاٹ دیا کروں تو سمجھا کرو میں مصروف ہوں، بار بار ڈسٹرب مت کیا کرو۔“ وہ اس کے لہجے سے خائف ہو گئی تھی۔ ایسا اس کے لفظوں سے لگ رہا تھا۔

”اچھا اب میرا کال کرنا بھی تمہیں ڈسٹرب کرنے لگ گیا ہے۔ ٹھیک ہے میں آئندہ سے ایسا نہیں کروں گی۔“ قیس نے گہرا سانس خارج کیا۔ سونے کے ذروں کے درمیان چلتا وہ کوئی سونے کا دیوتا ہی لگ رہا تھا۔ جس کے پاؤں گیلی گھاس پر پڑتے ہوئے آگے کو جا رہے تھے۔ ایک طمانیت سی تھی جو اس کے پاؤں کے تلوؤں سے اس کے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔

”یعنی یہ بات طے ہو گئی کہ آج کی تاریخ میں ہر ایک نے مجھ سے ہی خفا ہونا ہے۔“ ہما کچھ دیر نہیں بولی جب بولی تو فقط اتنا ہی۔

”میرے خیال سے وہ تم ہو جو ناراض ہو رہے ہو۔ میں نے تو تم سے ضروری بات کرنی تھی۔“ قیس نے انگوٹھے کی نوک سے اپنی بھنور کو کھجایا۔ وہ شینزل کی وجہ سے پریشان تھا۔ اسے اپنی پریشانی خود تک ہی رکھنی چاہیے اس بات کا اسے ادراک ہو گیا۔

”ہاں بولو میں سن رہا ہوں۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

”میں نے تمہارے حق میں فائل بنا کر ایک کاپی جاسمین میم کو اور ایک وکیل کو دے دی ہے۔ تم پر جو الزام لگا ہے وہ جلد ہی خارج ہو جائے گا اور۔“ وہ تھوڑی ہچکچائی۔ ”مجھے پوچھنا تھا کہ تمہاری شینزل سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کوئی بات کی تمہارے اور میرے بارے میں۔ تم نے اسے بتایا کہ ہماری بیٹی اپنے دادی دادا کے پاس ہے اور میں اپنے میکے میں ہوں کچھ روز کیلئے۔“ قیس نے نفی میں سر ہلایا ایسے جیسے وہ اسے دیکھ رہی ہو۔

”نہیں ابھی کوئی بات نہیں ہوئی اور میں ضروری بھی نہیں سمجھتا کرنا۔ تم بتاؤ کب تک گھر لوٹ رہی ہو؟“ اس کی چہل قدمی جاری و ساری تھی۔ وہ بہت سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔

”تو یعنی موصوف کو احساس ہو گیا کہ میں بھی ہوں۔“

”حد ہو گئی یعنی واقعی یہ جلے کٹے جملے اور طنزیہ باتیں میرے حصے میں ہی لکھی ہیں۔“ اس نے تھوڑا توقف کیا پھر بولا۔ ”یار سب میس اپ ہوا پڑا ہے۔ گھر، چیزیں، زندگی اور۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس کے اندر کی الجھن اس کی بیوی کو اچھے سے سمجھ آ رہی تھی۔ قبل اس کے وہ کچھ کہتی ایک بار پھر سے قیس کی آواز ائیر پیس سے ابھری تھی۔

”عالیہ، عالیہ بہت یاد آ رہی ہے مجھے۔ یہ سب سمٹے تھے ہم سب ساتھ رہیں۔“ وہ اپنی بیٹی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ہما کو اس بات کا ادراک تھا۔ وہ اس وقت ذہنی الجھن کا شکار تھا وہ جان گئی۔ بات کرتے ہوئے قیس کے دل میں اس سے بھر رہی تھی۔ اتنی زیادہ کہ اسے

گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایک معصوم سا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔ جو اس کی دنیا میں آتے ہی اس دنیا سے چلا گیا تھا۔ اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ درد شدت سے ہوا تھا۔

”فکر نہیں کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں وقت نکال کر آتی ہوں تمہارے پاس۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ وہ اس کیلئے پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی جیون ساتھی جو تھی۔

”میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں ہما، مجھے لگتا ہے مین ڈور پر کوئی ہے۔“ عذر پیش کر کے وہ کال کاٹ کر گھاس پر ہی بیٹھ گیا۔ گیلی نرم گھاس اس کے ہاتھوں کو تقویت دے رہی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں میں چھوٹی بچی کی رونے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ کوئی اس کے ہاتھوں میں مخمل میں لپٹے وجود کو دے رہا تھا۔

”مبارک ہو اللہ نے رحمت سے نوازا ہے آپ کو۔“ اس نے اپنے لب اس نرم وجود کے ماتھے پر رکھے تھے۔

”میری بیٹی۔“ ماضی میں کھویا وہ مسکرا دیا۔ نم آنکھیں، خوبصورت مسکان۔

”آپ کی بچی میں آکسیجن کی کمی ہے اور اس وقت یہاں آکسیجن میسر نہیں ہے۔ ہم آپ کو ریفر کر رہے ہیں فوراً سے سٹی ہسپتال لے جائیں، جلدی کریں دیر نہیں کریں۔“ گھاس کے ٹوٹے ہوئے تنکے میں وہ اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ جس میں اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا وجود تھا۔ اور وہ اپنی سانس اس میں منتقل کرتا دوڑتا ہوا ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں جا رہا تھا۔ صبح سے دوپہر ہوئی تھی۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات، وہ رات اس کی زندگی کی سیاہ ترین رات تھی۔ جب اسے خبر دی گئی تھی کہ وہ وجود جو اس کی دنیا روشن کرنے آیا تھا۔ اس اندھیری رات میں اسے سیاہی میں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چلا گیا ہے۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم ساڈا کٹر کے الفاظ سن رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اس رحمت کو ہاتھوں میں لیے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اس

بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ ایک مرد ہے۔ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ لوگوں کے درمیان میں ہے۔ اس رات وہ اس ننھے وجود میں منہ چھپائے روتا رہا تھا۔ اور آج وہ اسے سوچ کر دلبرداشتہ ہو رہا تھا۔ وہ جب جب اسے سوچتا تھا اسی طرح تکلیف میں مبتلا ہو جاتا تھا جس طرح ابھی ہو رہا تھا۔ اس کی سوچ کا ارتکاز شیزل کی آواز سے ٹوٹا تھا۔ کافی دیر سے بیل بج رہی تھی۔ وہ اپنے استغراق میں اس قدر غرق تھا کہ اسے اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور جب ہوا تب دیر ہو چکی تھی۔ شیزل کسی سے بات کر رہی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

”جی پی ایس سے تمہاری لوکیشن کا پتا چلا، کمال ہے تم نے مجھے بتایا نہیں۔ مجھے کتنا برا لگا ہے اس بات کا جانتی بھی ہوں۔“ رسی علیک سلیک کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے گلے شکوے کر رہے تھے۔ لان کراس کر کے وہاں تک آتے قیس کیلئے یہ منظر قطعی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ دیوار کی اوٹ میں آکر رک گیا تھا۔ اسے لگا اسے ابھی شیزل کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔

”موقع نہیں ملا لیکن ابھی میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں نا، سب بتاتی ہوں۔“ احد نے شیزل کے پیچھے سے اس گھر کو دیکھا جو کافی شاندار تھا۔ پھر اس نے سوال کیا۔

”یہ کس کا گھر ہے؟“ شیزل نے مڑ کر لاؤنج کوٹکا پھر پھسکی مسکان کے ساتھ بولی۔

”بس کسی کا ہے۔“ احد کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی جس کا اس نے برملا اظہار کر بھی دیا۔

”میری شیزل“ بس کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتی اتنا اندازہ ہے مجھے، بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے۔“ قیس کے ماتھے پر یکدم بل پڑے۔ اس کے ہاتھ کی مٹھی بن چکی تھی۔

”کم آن احد، بیگ لے کر آتی ہوں میں۔“ وہ مڑنے لگی تھی جب احد نے اس کی کلائی تھام کر اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں شیزل ٹھکھی تھی وہیں قیس کے ماتھے کی رگ بھی پھڑکی تھی۔ اس کا خون کھولنا شروع ہوا۔

”انگوٹھی کیوں اتار دی؟“ وہ سوال کر رہا تھا۔ قیس بت بن گیا۔

”کافی مہنگی ہے اس لیے سنبھال کر رکھی ہے۔“ احد حیرانی سے مسکرایا۔

”شینزل، آپ کو دس ویسی لے کر دے سکتا ہوں میں۔ پہن کر آئیں ورنہ خفا ہو جاؤں گا۔“ اس کے دھونس پر مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ جونہی وہ کمرے کی اور قدم اٹھانے لگی اس کے پاؤں زمین نے جکڑ لیے۔ لٹھے کی مانند چہرہ لیے وہ وہاں کھڑا تھا۔ قیس کو یوں کھڑا دیکھ شینزل کے دل میں ٹھنڈا سا ڈراترا۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں پکڑ کر چھوڑا پھر وہ کمرے میں جا کر بیگ لے آئی۔ وہ جب واپس باہر آئی تھی تب بھی قیس ویسے ہی کھڑا تھا جیسا وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ ٹھنڈا سا ڈر شینزل کے پاؤں کے انگوٹھوں میں سے بھی نکل رہا تھا۔ وہ سر جھکا کر اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اسے چھوڑ جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

ارجمندی از شعارش می بری

من ندانم تو توئے یا دیگری

”میں نہیں جانتا کہ تو، تو ہے یا غیر ہے یعنی تیری حیثیت،

غیر کی نقالی میں گم ہو گئی ہے اور یقیناً تو، تو نہیں رہا۔“

سمندروں سے پار، آسمان سے پرے، دھرتی پر کہیں کچھ لوگ سیاہ چوغوں میں لال رنگ میں رنگے چہروں کے ساتھ دونوں ہاتھ آسمان کی جانب کیے ہل رہے تھے۔ ان کا رقص مخصوص تھا۔ گھٹنے کچی زمین پر دھرے تھے۔ آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر سرمہ تھا۔ ہاتھوں میں کھوپڑیوں والی انگوٹھیاں، گردنوں میں انسانی دانتوں کے ہار، وہ سوتھے، نہیں بے شمار، قطار در قطار گھٹنے زمین پر ٹکائے، دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اٹھائے وہ جھومے جا رہے تھے۔ ان

سے تھوڑی دور بائیں جانب ایک بڑے سے پتھر کے پاس ننگے سر، پھٹے ہوئے ہونٹ، سیاہ چہرے کے ساتھ جھکڑیوں میں قید وہ ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے گول کٹورے میں سرخ مائع پڑا تھا اور ایک پلیٹ میں کچے گوشت کے ٹکڑے۔ اس لڑکی کے بال بے ڈھنگے انداز میں کٹے تھے اور جھکڑیوں میں قید پاؤں کٹے پھٹے سے تھے۔ اس کی آنکھوں کے ریٹینا پر اس ہجوم کا جھومنا ثبت ہو رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا اس ہجوم کا سردار رکا ہے۔ اس نے ایک سرخ رنگ کی تھال اٹھائی اور اس لڑکی کی طرف خباثت سے دانت نکالتے ہوئے دیکھا۔ وہ لڑکی ڈر گئی۔ گھبرا گئی۔ وہ آدمی اٹھ کر اس کی طرف آیا اور کچھ اونچا اونچا پڑھتے ہوئے سرخ رنگ اس پر الٹ دیا۔ وہ پوری سرخ رنگ میں نہا چکی تھی۔ وہ پوری ناپاک ہو چکی تھی۔ اس آدمی نے ہاتھی کا دانت اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے ہاتھ میں کھسکا دیا۔ شیزل کی آنکھ جھٹکے سے کھلی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھی۔ گھپ اندھیرے میں اس نے اپنے ہاتھوں کو ٹٹولا تھا۔ اسے وحشت ہونے لگی۔ وہ کمفرٹر پھینک کر دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکی۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ اس نے قیس کے کمرے کا دروازہ جارحیت کے ساتھ بجایا۔ دوسری ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی شیزل اس سے جا لگی تھی۔ سختی سے اس کی شرٹ کو تھامے وہ اس میں خود کو چھپا رہی تھی۔

”ہے، کیا ہوا ہے۔ شیزل۔۔۔۔“ وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس کے یوں گلے لگنے سے قیس کا توازن بگڑا تھا مگر وہ دروازہ تھام کر سنبھل گیا۔ شیزل کے سانسوں کے تلاطم اسے بہت کچھ باور کروا رہے تھے۔ وہ ڈر گئی ہے اسے اندازہ ہو گیا۔

”وہ، مجھے بچالو۔ وہ، وہ آجائیں گے۔“ بے ربط جملے، ڈر کی انتہا۔ قیس کے دل میں اس بھری۔

”کون آجائیں گے؟ کوئی بھی نہیں ہے صرف میں ہوں۔“ تسلی دی گئی۔ تفتشی کی گئی۔ برف کو چٹھا دیا گیا۔

”وہ، وہ، وہ۔“ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ڈرنے کے ساتھ گھبرائی ہوئی بھی تھی۔ قیس نے اپنے گرے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک کو بلند کیا اور اس کی سر کی پشت پر رکھ دیا۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اسے شانوں سے تھام کر خود سے الگ کر رہا تھا مگر وہ نہیں ہوئی۔

”آپ کو نائیٹ میئر ہوا اور کچھ نہیں، یہاں پر میں ہوں، آپ ہو اور بس۔۔۔ کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہو سکتا۔“ وہ اسے نرم آواز کے ساتھ سمجھا رہا تھا۔ باور کروا رہا تھا۔ ہولے ہولے اس کے سر کو تھپکتا جا رہا تھا۔

”اور اگر کوئی آ بھی گیا تو اس کی جرات نہیں ہے کہ وہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو ہاتھ لگائے۔ اس لیے پرسکون ہو جائیں۔“ یکدم لائیٹ آئی تھی۔ کمروں کے علاوہ لاونج کے نائیٹ بلب روشن ہو چکے تھے۔ شینزل نے اپنی مچی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ روشنی نے اسے ٹھٹھکنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے قیس کی ٹی شرٹ چھوڑتے ہوئے خود کو تیزی سے پیچھے کیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو، چہرے پر گھبراہٹ و ڈر پلس شرمندگی دیکھ کر مسکرا دیا۔ دو قدم آگے آیا۔ اسے شانوں سے تھام کر گویا ہوا۔

”کوئی بات نہیں کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ آپ ڈری ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، ہم۔“ شینزل نے بال کان کے پیچھے اڑ سے پھر ایک طائرانہ نگاہ پورے گھر پر ڈالی جس کی ہر کھڑکی ہر دروازہ لاکڈ تھا۔ قیس نے گہرا سانس لیا۔ وہ اس کا اضطراب جان گیا۔ اس نے تمام لائیٹس پلس فینسی لائیٹس آن کر دیں۔ اس کے کمرے میں گیا وہاں کی لائیٹ آن کر کے دروازہ پورا کھول دیا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر بھی یہی کرنے والا تھا کیونکہ ان دونوں کے

یہ پرفیوم وہی استعمال کرتا تھا۔ رات کو خود پر پرفیوم چھڑک کر سونے کی عادت آج بھی اس میں سے نہیں گئی۔ اس کی عجیب ہی منطق تھی۔ وہ صاف ستھرا ہو کر، نہادھو کر سوتا تھا اور کہتا تھا۔

”موت کا کوئی علم نہیں کب آجائے، میں چاہتا ہوں جب میں مروں تو پاکیزگی کی حالت میں ہوں۔ صاف ستھرا، ٹپ ٹاپ۔“ اور وہ کہتی تھی۔

”پرفیومز میں الکوحل ہوتا ہے جو کہ حرام ہے۔ حرام موت مرنا چاہتے ہو تم کیا۔“ اس پر وہ خائف ہو جایا کرتا تھا۔

”ایکسکیوز می، یہ نان الکوحلک ہے۔ اپنی معلومات کے ذخیرے کو تھوڑا وسیع کریں مادام۔“ اسے لگا تھا گزرتے ماہ و سالوں میں اس کی عادت بدل جائے گی۔ مگر اس کی سوچ غلط تھی۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ بالکل ویسا کا ویسا۔

”ڈپلومیٹ جواب نہیں چاہیے مجھے۔“ وہ مسکرا دیا، چلو کسی وجہ سے تو اس کی چپی ٹوٹی۔

”میرا جواب بالکل خالص ہے۔ یہ بات آپ جانتی ہیں۔“ شیزل نے جواگلی بات کہی تھی۔ وہ اس پر بری طرح اچھلا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں نے تمہارے میسجز دیکھے تھے۔ میں تم دونوں کے رشتے سے تو واقف تھی بس یہ معلوم نہیں تھا وہ لڑکی ہمارے۔ یہ بات مجھے اسی دن سمجھ آ گئی تھی جس دن تم اس کے کام کرنے کے خلاف ہوئے تھے۔ پہلے فقط شک تھا پھر تمہاری بیوی کے منہ سے اعتراف سننے کے بعد یقین ہو گیا۔“ قیس نے تحیر کے عالم میں کمبل میں دبکی اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ کیا تھی۔ کتنی پرتیں تھی اس کی، وہ سمجھ نہیں پایا۔

”اور کیا کیا پتہ ہے آپ کو؟“ شیزل نے فٹ سے کہا۔

”یہ کہ تم قاتل ہو۔“ قیس نے گہرا سانس بھرتے ہوئے سر کو تکیے پر گرایا۔ اس بات پر اس

سے بحث کرنا بے حد فضول تھا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔
”خواب میں کیا دیکھا تھا۔“

شینزل کا حلق کڑوا ہو گیا۔ جس چیز کو بھلانے کیلئے وہ فضول سے آدمی سے باتیں کرنا شروع ہو چکی تھی۔ اسی چیز کو وہ شخص درمیان میں لے آیا تھا۔ انتہا تھی۔
”تمہاری موت۔“

”اچھا، واؤ یار یعنی مجھ سے اتنا لگاؤ ہے کہ میری موت پر اس بری طرح ڈر گئی، میرے لیے اعزاز کی بات ہے یہ۔“ شینزل نے کبل کو آنکھوں تک کھینچا حالانکہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”اپنی بک بک بند کرو مجھے سونا ہے۔“

وہ ہنس دیا تھا۔ جانتا تھا صبح تک اس نے جاگنا ہے۔

”اچھا کس طرح مرا تھا میں وضاحت کروں گی، یعنی تمہارا خواب ہے نا تمہیں بہتر پتہ ہوگا۔“ شینزل جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی۔ قیس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر تپا دینی والی مسکراہٹ لبوں پر لے آیا۔

”قیس الہی تم بہت ڈھیٹ ہو۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

”بلا کا۔“ ہمیشہ کی طرح اضافہ کیا۔

”اچھا ٹھیک کہتا ہے۔ تم میں کوئی تمیز نہیں ہے۔“ وہ غلط وقت پر، غلط جگہ پر، غلط انسان کے سامنے اس کا حوالہ لے آئی تھی۔ قیس کی مسکراہٹ سمٹی۔ آنکھیں پتھر ہوئیں۔

”مجھے کسی غیر کے سٹوفلیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ تمہارے منہ سے میں اس شخص کا نام نہ سنوں۔“ وہ انگلی اٹھاتا اسے وارن کر رہا تھا۔ آپ سے تم تک کا فاصلہ وہ یونہی چٹکیوں

میں مٹاتا تھا۔ غلط کرتا تھا۔ غصہ میں انسان کو اپنی اخلاقیات نہیں بھولنی چاہیے مگر یہ بات قیس کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ اور نہ ہی وہ سمجھنا چاہتا تھا۔

”وہ میرا بہت اچھا دوست۔“ قیس نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

”شٹ اپ، وہ شخص تمہارا کوئی نہیں ہے۔ سمجھی۔“ شیزل لبوں کو کاٹتی ہوئی مسکرائی پھر زہر خند لہجے میں بولی۔

”آگئے اپنی پر۔“

”ہاں آگیا ہوں اور لانا بھی جانتا ہوں، آج تم اس آدمی کو درمیان میں لائی ہو آئندہ لائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس کے لہجے میں اتنی سرداہٹ تھی کہ ریڑھ کی ہڈی سنسناتا ٹھسے۔ شیزل چند لمحے اس لیٹے ہوئے انسان کو دیکھتی رہی پھر اس نے بم پھوڑا تھا۔ جس کے سبب قیس چپتھڑے چپتھڑے ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی جو کہ یہ تھا۔

”تم سے برا کوئی ہے بھی نہیں، اپنی معلومات میں اضافہ کرلو۔ میں اس کے ساتھ منگنی کر چکی ہوں۔ وہ میرا منگیتر ہے۔“ قیس متحیر انداز میں اٹھ کر بیٹھا۔ دونوں بھنوں کو آپس میں ملائے وہ گرم ہوتے کانوں کے ساتھ اس سے دریافت کر رہا تھا۔

”کیا کہا، دوبارہ بولنا ذرا۔“ اس کا انداز، یہ تو اس کا وہی پرانا انداز تھا جس سے شیزل خوف کھاتی تھی۔ وہ آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھ رہا تھا۔ اور قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شیزل لہجہ بھر کو گھبرائی اور اگلے ہی پل سنبھل گئی۔

”وہ میرا منگیتر ہے۔ اس کا حوالہ اب ہوا کرے گا۔“ قیس اس کے سر پر آ کر کھڑا ہوا۔ خون آلود آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ کر گویا ہوا۔

”دوبارہ کہو۔“ شیزل نے بیڈ کی چادر کو مٹھی میں جکڑا، اس کا دل پسلیوں میں دھڑکنے لگا۔

”قیس بی ہیو یور سیلف، یہ زیادہ ہو رہا ہے۔“ وہ اسے وارن کر رہی تھی اور وہ چند سیکنڈز میں پاگل ہوا تھا۔

”میں نے کہا دوبارہ کہو۔“ سرخ آنکھیں، ستا ہوا چہرہ، سرد آواز، انجان سا وہ۔

”میں تمہارے گھر سے ابھی اور اسی وقت چلی جاؤں گی۔“ شینزل نے گھبراتے ہوئے اسے دھمکی دی۔ اسے فرق نہیں پڑا۔

”دوبارہ کہو شینزل قیس الہی۔۔۔ کہ وہ شخص تمہارا منگیتر ہے۔“ وہ دھاڑا تھا۔ اتنی زور سے، اتنی شدت کے ساتھ کہ اگر کوئی عام لڑکی ہوتی تو اس وقت کانوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑتی۔ مگر وہ شینزل تھی۔ وہ صرف گنگ ہوئی تھی کیونکہ اس نے ایسے ایسے روپ دیکھے تھے جن کے سامنے اس کا یہ روپ کچھ بھی نہیں تھا۔

”تم پاگل ہو رہے ہو قیس، اینارٹل، سائیکو۔“ آنکھوں میں ہلکی سی نمی لیے وہ اسے اطلاع دے رہی تھی۔ چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار تھے اور گلارندہ رہا تھا۔

”یونو واٹ۔“ وہ جھک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے سامنے لایا۔ ”میں پاگل ہو نہیں رہا، میں ہوں اور اگر آئندہ۔“ وہ اس کا بایاں ہاتھ تھام کر اس کی تیسری انگلی میں سے انگوٹھی نکال رہا تھا۔ ”میں نے کہا آئندہ تم نے پھر بکو اس کی تو اس بار میں سچ مچ کا قاتل بن جاؤں گا اور قتل تمہارے آنکھوں کے سامنے کروں گا۔“ ایک جھٹکے سے انگوٹھی کھینچ کر وہ اسے کمرے سے باہر اچھال رہا تھا۔ شینزل کی آنکھوں میں لبالب پانی بھر آیا۔ اس کے دانت سختی سے ایک دوسرے کے اوپر جمے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دو تین آنسو ٹپک گئے۔

”تم بے حس ہو۔“ وہ سیدھا ہوا، شینزل کے دیے گئے لقب پر تلخی سے مسکرایا۔

”کم از کم تمہارے جتنا نہیں ہوں جو میرے گھر میں، میرے سامنے ہر لحاظ و مروت کو

میرے بیٹے کا قاتل سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ دو ہفتوں میں چار جانیں چلی گئی ہیں۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو تم۔“ وہ الجھے ہوئے تھے۔ وہ پریشان تھے۔ وہ غم زدہ تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بدن پر چڑھے کوٹ میں سے بھی حزن کی شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔ کیوں نہ پھوٹیں جو ان اولاد تھی۔ وہ بھی زخم تو بنتا تھا نا۔

”ایسا نہیں ہے یار، دراصل جس انسان کے خلاف شواہد ملے ہیں وہ بالکل بھی قاتل نہیں ہے۔ اسے پھنسا یا جا رہا ہے۔ اور خدا نخواستہ اگر اس سب میں وہ ملوث بھی ہوا تب بھی ہم بہت زیادہ عرصے تک اسے جیل میں نہیں رکھ سکتے۔ تم مجبوری سمجھو ہماری۔“ عبدالرزاق کا پارہ ہائی ہو گیا۔ بھلا ان کے بیٹے کی جان سے بھی کوئی عزیز ہو سکتا ہے۔ وہ عدلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قانون کا انہیں بہتر علم ہے اور وہ اس علم کو بخوبی استعمال کرنا جانتے ہیں۔

”کون ہے وہ انسان، اور تم اسے جیل میں ڈالنے کی بجائے یہاں پر سکون بیٹھے ہو۔ اسے فوراً گرفتار کرو۔“ وہ بے کل ہو گئے۔ ان کے لفظوں میں بے کلی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بھلا ایسا کون تھا جس کو وہ زیادہ عرصے کیلئے جیل میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ جو بھی تھا وہ اس سے نبٹ لیں گے۔ انہوں نے سوچ لیا۔

”عبدالرزاق، تم اسے جانتے ہو۔ وہ قیس الہی ہے۔“ عبدالرزاق کا ماتھا ٹھنکا۔ میز پر ہاتھ رکھ کر وہ آگے کو جھکے۔

”وہ، وہی کرائم ونگ والا۔“ حیدر نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ان کے دوست کے ماتھے کی رگ پھڑپھڑا اٹھی۔ پر حدت سے کمرے میں تپتی ہوئی سی آواز گونجی۔

”تو اسے جیل میں ڈالو، یہ کیا کر رہے ہو تم۔“ ان کی عجلت دیدنی تھی۔ ان کی نفرت ظاہری۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ عبدالرزاق نے میز پر ہاتھ مار کر اپنے طیش کا برملا اظہار کیا۔ ایک باپ کو کم از کم ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔

”کیوں۔“ وہ سمجھنے سے قاصر تھے اور وہ سمجھانے سے۔

”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا لیکن ابھی مصلحت کی خاطر چپ ہو جاؤ، یقین کرو اس پر انکواری بٹھائی گئی ہے۔ جس دن اس پر جرم ثابت ہو گیا اس دن میں فیصلے کا اختیار تمہیں دے دوں گا۔“ عبدالرزاق نے زور سے ہاتھ میز پر مارا۔

”اس دن۔۔۔۔ مجھے ابھی فیصلہ چاہیے۔ مجھے ابھی وہ چاہیے۔“ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کے دل کو کسی طور سکون نہیں مل رہا تھا۔ ان کے بیٹے کا قاتل، وہ قیس الہی، وہ آزاد تھا۔ ناممکن۔

”یار میں کہہ رہا ہوں ابھی سچ ثابت نہیں ہوا۔ اسے گرفتار کیا تھا۔ انکواری ہو رہی ہے اس پر، اگر وہ قاتل نکلا تو میں خود اپنی بندوق تمہارے ہاتھ میں دوں گا۔“ وہ جانتے تھے ایسا دن نہیں آئے گا۔ قیس پر انہیں پورا بھروسہ تھا۔

عبدالرزاق نخوت سے سر جھٹک کر وہاں سے گئے تھے۔ حیدر نے اپنی کنپٹی کو مسلا۔ وہ اثر کام پر سردرد کی گولیاں لانے کو کہہ رہے تھے۔

وہاں سے کچھ دور کسی کے گھر میں، کسی کے بیڈروم میں کسی کا فون بج رہا تھا۔ سفید تکیے میں چھپا منہ اور فون ٹٹولتا ہاتھ، وہ انسان الٹا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا فون مسلسل رنگ کر رہا تھا۔ فون کرنے والا بڑا ہی مستقل مزاج تھا۔ اس نے بلا آخر سفید کمفرٹر کو خود پر سے اتارا، جمائی روکتے ہوئے وہ فون کو آنکھوں کے قریب لایا تب تک فون بند ہو چکا تھا۔ قبل اس کے وہ اسے واپس رکھ کر سوتا ایک میسج فون کی اسکرین پر ابھرا تھا۔

”لو جی ہو گیا کام خراب۔“ یہ میسج ونگ کی جانب سے آیا تھا۔ جس میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ کیلئے اس کیس سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اور اسے کچھ وقت کیلئے چھٹیاں دی گئی ہیں۔ وہ کچھ وقت کیلئے اپنی ڈیوٹی جوائن نہیں کر سکتا۔ اسے بھی کون سا شوق تھا یا وہ مرا جا رہا تھا یہ کام کرنے کیلئے۔ اس نے بڑے ہی پر مسرت انداز میں وکیشن کا احساس لے کر خود کو لٹایا ہی تھا کہ اس کے دماغ میں الارم بجا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا بیڈ خالی تھا۔ وہ کمرے سے باہر آیا۔ کچن میں بھی سناٹا تھا۔ اس نے شیزل کا کمرہ حتیٰ واش روم تک چیک کیا۔ وہاں بھی کسی کے ہونے کے آثار نہیں تھے۔ اس کا دل برا ہوا، عجیب سی گھبراہٹ رگ و پے میں پھیل گئی۔ وہ پورا لاؤنج، سارے کمرے یہاں تک کہ لان بھی چیک کر چکا تھا مگر شیزل وہاں نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں دوڑتے ہوئے اس نے فون اٹھا کر اس کا نمبر ڈائل کیا مگر فون آف تھا۔ اس نے بار بار نمبر ٹرائے کیا، بار بار وہی پرانی اطلاع دی گئی۔ جلدی سے کپڑے بدل کر وہ پولیس اسٹیشن آیا تھا مگر اسے وہ وہاں بھی نہیں ملی تھی۔ اس نے سرسری سا ہر ایک سے اس کے بارے میں پوچھ لیا تھا مگر جواب ندارد۔ وہ بلا آخر اس کے اپارٹمنٹ میں آیا مگر وہ بھی بند تھا۔ اس نے ساتھ والے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عمر رسیدہ گرلیں فل سی خاتون اس دروازے سے برآمد ہوئی تھیں۔

”بیٹا بیل پر ہاتھ رکھ کر بھول نہیں جاتے، تھوڑا صبر بھی کرتے ہیں۔“ عورت نے قدرے ڈپٹنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔ قیس نے ان کی بات کو نظر انداز کر کے عجلت میں سوال کیا۔ ”آئی شیزل ہے آپ کے گھر؟“ وہ اس خوب رو سے لڑکے کے منہ سے اپنی ہونے والی بہو کا نام اس قدر بے باکی سے سن کر ٹھٹھک گئیں۔

”نہیں وہ بھلا یہاں کیوں ہوگی اسے تو اپنے گھر ہونا چاہیے یا پھر پولیس اسٹیشن۔“ قیس

بنا کچھ کہے مڑا پھر یاد آنے پر فوراً پلٹا۔

”اُحد آپ کا بیٹا ہے نا، مجھے اس کے آفس کا پتا چاہیے۔“ رحمت اس لڑکے کے انداز پر خشمگیں ہوئیں۔ بھلا یہ کون بدتمیز تھا جو ان کی بہو اور ان کے تمیزدار بیٹے کو جانتا تھا۔ کوئی اخلاقیات نہیں اس لڑکے میں، انہوں نے فوراً جج کر کے نتیجہ نکالا۔

”تم کون ہو بھلا۔“

قیس نے گال پھلا کر ان میں سے سانس خارج کیا پھر تحمل سے گویا ہوا۔

”آئی آپ مجھے اس کے آفس کا کارڈ دے رہی ہیں یا نہیں۔“ پہلے اس نے اکھڑ لہجے میں کہہ دیا پھر اسے اپنی فاش غلطی کا اندازہ ہوا اس لیے نرم لہجے میں گویا ہوا۔ ”یعنی میں کرائم ونگ سے آفیسر قیس الہی ہوں اس لیے شینزل سے ملنا میرا بہت ضروری ہے۔“ رحمت کو اس لڑکے پر تاؤ آیا تھا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر گئیں اور کافی دیر بعد باہر آئیں۔ جب وہ باہر آئیں تب انہوں نے دیکھا وہ لڑکا ٹہلتے ہوئے فون پر بار بار کسی کا نمبر مل رہا تھا۔ ناکامی بار بار اس کا مقدر بن رہی تھی۔ ان کی آمد پر وہ رکا، شکر یہ کہتے ہوئے ان کے ہاتھ سے کارڈ تھا مگر جو نہی پلٹنے لگا ایک بار پھر سے ٹھٹھک گیا۔ وجہ وہ بوسیدہ سے گلاب تھے جو شینزل کے دروازے کے باہر پڑے تھے۔

”یہ کس نے رکھے ہیں یہاں پر۔“ اس نے غلط انسان سے سوال کیا۔ رحمت نے کچھ لمحے اس لڑکے کو دیکھا پھر اسے پانی پانی کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”پہلے تمیز سیکھ آؤ بیٹا پھر جواب لینے آ جانا۔“ ٹھاہ کی آواز سے دروازہ بند کیا گیا تھا۔ قیس گلابوں کی طرف آیا جو تھوڑا مر جھا چکے تھے۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اس گلدستے کو اٹھایا اور وہیں موجود ٹریش بین میں ڈالتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔

”اپنے بیٹے کو لگائیں دیں زیادہ سرپٹ دوڑ رہا ہے وہ۔“ رحمت کی سماعت سے اس کی آواز بخوبی ٹکرائی تھی۔ انہوں نے احد کا نمبر ڈائل کیا۔ فون دوسری بیل پر اٹھالیا گیا۔ سلام دعا کے بعد وہ اس سے کہہ رہی تھیں۔

”کوئی قیس آیا تھا ابھی تمہارا اور شیزل کا پوچھ رہا تھا۔ کارڈ لے کر گیا ہے آفس کا، پہنچنے والا ہوگا۔“ انہیں احد کی قدرے خفاسی آواز سنائی دی۔

”ماں آپ اسے نہ دیتیں کارڈ۔“ رحمت کو بلاوجہ غصہ آ گیا۔

”کیسے نہ دیتی، انتہا کا بد تمیز تھا وہ، گھر میں گھس جاتا پھر۔“ احد نے کرسی سے ٹیک چھوڑی اور اپنے سامنے بیٹھی شیزل کو دیکھا جو سینے پر بازو باندھے کھلی ہوا میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ ایک اوپن ایئر کیفے تھا جس کی دوسری منزل میں سردیوں کی ہوا کے درمیان وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

”اس نے کچھ کہا ہے آپ سے۔“ شیزل نے رخ احد کی جانب کیا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے سب ٹھیک ہے کا اشارہ دے رہا تھا۔

”نہیں لیکن انداز اس کا اکڑ تھا۔ میں نے بھی کھری کھری سنا دی۔“ وہ اب ماں کی بات پر مسکرایا تھا۔ ہوا کے سبب شیزل کی کچھ لٹیں اس کے چہرے پر آرہی تھیں۔ سیاہ رنگ کی ڈائس والی کورین پونی نے اس کے بالوں کو جکڑا ہوا تھا۔ اس پونی سے نکلتا کپڑا اس کے شانوں پر دائیں بائیں گرا ہوا تھا۔

”یوں بھی اس کی جرات نہیں تھی کچھ کہنے کی اور ہاں شیزل سے کہو اس انسان سے دور رہے خبردار جو میں دونوں کو ساتھ دیکھوں۔“ رحمت نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا تھا۔ احد نے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا پھر ان ٹھنڈی ہواؤں میں اپنا گہرا سرد سانس خارج کر دیا۔

وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ ”وہ“ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس کیوں منڈلاتا تھا اور شینزل کے نام کے ساتھ اس کے نام کی کیا حیثیت تھی وہ بہت اچھے سے سمجھ رہا تھا۔ مگر ہر مرد کی طرح کہیں نہ کہیں وہ بھی تنگ ذہن و تنگ نظر تھا۔ وہ ہرگز اپنی ہونے والی بیوی کے سابقہ شوہر کی اس کے ارد گرد موجودگی اور فریقین کی آپس میں وارفتگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پازیسو ہو رہا تھا۔

”اب آگے کیا کرنا ہے۔“ وہ علی الصبح اس کے پاس آئی تھی تب جب وہ جاگنگ کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر جا کر وہاں سے سوٹ کیس تیار کر کے اس کی کار میں بیٹھ چکی تھی۔ اور تب تک بیٹھی رہی تھی جب تک وہ نہیں آیا تھا۔ احد کے لاکھ اصرار پر بھی وہ اس کے اپارٹمنٹ نہیں آئی تھی تاہی اس نے ناشتہ کیا تھا۔ اس لیے وہ اسے قریبی کیفے میں لے آیا تھا۔ شینزل نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا فقط اتنا کہ اس کی اپنی دوست سے لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ اس کا گھر چھوڑ کر آ گئی ہے اور اپنے گھر میں وہ اس لیے نہیں رہنا چاہتی کیوں کہ آج کل وہ ڈپریشن کا شکار ہو چکی ہے۔ اکیلی رہے گی تو مزید ٹینشن میں رہے گی۔ احد نے اسے تجویز پیش کی تھی کہ وہ اس کی ماں کے ساتھ اس کے گھر پر رہ لے اور وہ اس کے گھر پر رہ لے گا۔ لیکن اس تجویز کو بھی شینزل نے رد کر دیا تھا۔

”لاہور جاؤں گی، تم مجھے لاہور کی ٹکٹ بک کروادو۔“ احد نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ اس کے دماغ میں پھر سے قیس آیا تھا۔

”مگر کیوں، وہاں تو کوئی تمہارا جاننے والا بھی نہیں ہے۔“ ٹھنڈی ہوا دونوں کے چہروں پر لگ کر انہیں طمانیت بخش رہی تھی اوپر سے سورج کی نرم گرم شعائیں ان کے رگ و پے میں تراوٹ اتار رہی تھیں۔

”اس لیے تو جا رہی ہوں۔“

”شیزل تم فرار ہو رہی ہو مگر کس سے؟“ اس کے چہرے پر سفیدی تھی۔ حزن کی ایک تہہ تھی۔

”خود سے۔“ ایک لفظی جواب تھا۔ احد کی نظر اس کی خالی انگلی پر گئی۔ اس کے دل کو ٹھیس پہنچی۔

”ایسا نہیں کرو، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔ شیزل نے ایسا

نہیں کرنے دیا۔ وہ انہیں سینے پر باندھے لب بستہ تھی۔ اسے سن رہی تھی۔

”پریشان نہیں ہو جلد آ جاؤں گی۔“ وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی۔

قیس جی پی ایس کو فالو کر کے اس کیفے میں آیا تھا۔ نیچے والے پورشن میں وہ نہیں تھی۔ وہ

دو دو کر کے سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا اور ایک طائرانہ نگاہ تمام حصہ پر ڈالی وہاں بھی وہ نہیں تھی۔

وہ جانے کیلئے پلٹا ہی تھا کہ اس کی نگاہ اپنے دائیں جانب رکھی میز پر پڑی۔ سفید فون اس میز

پر الٹا رکھا ہوا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر اسے ناک کی طرف کیا پھر آنکھیں بند کر کے گہرا سانس

لیا۔ یہ خوشبو شیزل کی تھی۔ اس نے فون کا سائیڈ بٹن آن کیا۔ سیاہ اسکرین پر سیاہ وال پیپر جگمگا

اٹھاتا تھا۔

”اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔“ سیاہ وال پیپر، سفید حروف، وہ اس کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جس میں

سے شیزل کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ صبح سے شام ہو چکی تھی۔ شام سے رات مگر وہ آئی تھی نا ہی اس

نے آنا تھا۔ وہ اسے نہ ڈھونڈے اس لیے وہ جان بوجھ کر اپنا فون چھوڑ کر گئی ہے۔ قیس کو اس

بات کا ادراک ہو گیا۔ اس کی میز پر انگنت کافی کے کپوں کے نشان تھے۔ ویٹر اور وہاں کی

انتظامیہ اس مستقل مزاج شخص کے وہاں بیٹھے رہنے سے عاجز آ چکے تھے۔ ان کی عاجزی کرسی

چھوڑتے قیس کو دیکھ کر مٹی تھی۔ بالکل ختم تب ہوئی جب اس نے بھاری قیمت ان لوگوں کو ادا

کی تھی۔ وہ کیفے سے باہر آیا، آنے کے بعد ون وے روڈ پر دوڑتی ٹریفک کو ایک ٹک دیکھنے

لگا۔ اس کا دل و دماغ بالکل خالی تھے اور اس کا فون ساکنٹ۔ رات کے اندھیرے میں تاروں سی چمکتی ٹریفک اس کے دل کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیے۔ ان میں بے چینی تھی۔ چیونٹیاں دوڑ رہی تھیں۔ قیس انہیں کھول کر بند کرنے لگا۔ بے چینی فقط ہاتھوں میں نہیں رہی تھی اب پورے بدن میں تھی۔ ایسے جیسے وہ ٹوٹ رہا ہو۔ کوئی اسے کند چھری سے کاٹ رہا ہو۔ اس نے اپنی پاؤں کی انگلیوں کو جوتوں کے اندر ہی موڑنا شروع کیا۔ بے چینی وہاں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ کیفے کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ صبح تک بیٹھا رہا۔ اس آس میں کہ کیا پتا اب وہ اپنا فون لینے آ جائے۔ اس کی آس ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا انتظار مر رہا تھا۔



آسمان کے آنسو جانے پہچانے سے تھے۔ درد میں لپٹے، آہوں میں بے، سسکیوں زدہ سے۔ اس نے پردے کو کھڑکی سے ہٹایا۔ نم آلود شیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس نے اپنا مرمریں ہاتھ اس گیلیے شیشے پر جمایا دیا۔ گہرے گہرے سانس بھرتے ہوئے اس نے شیشے کو سرکایا تھا۔ دوانچ جتنا، اس دوانچ سے آتی گیلی سرد ہوا اس کے نحیف چہرے پر پڑ کر اس کو تروتازہ کر رہی تھی۔ ایک دو بوندوں نے جسارت کی۔ وہ اس کے چہرے کو بھگو گئی تھیں۔ رتبہ مسکرائی مگر پھر جلد ہی اس کی مسکراہٹ چھپ گئی۔ آج اس کا بھائی اچھا خاصا چپ تھا۔ اس کی آنکھیں غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور سوچ کی طنائیں جانے کہاں انکی تھیں۔ رتبہ نے خود کو موڑا، لاؤنج میں ٹھس بیٹھا وہ یہاں سے نظر آ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کو واپس بند کیا پھر پردے برابر کر دیے۔

”اس کیلئے اداس ہو رہے ہوتا۔“ سوال پر بھی اس نے جنبش نہیں کی تھی۔ سوچیں اتنی عمیق

تھیں کہ سماعت لفظوں کو سن نہیں پائی۔

”کوئی بات نہیں، آجائے گی۔“ وہ تسلی دے رہی تھی۔ پھر جب اسے محسوس ہوا اس کا بھائی یہاں ہو کر بھی نہیں ہے تو وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ صوفے پر اس کے برابر بیٹھی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئی۔

”بھائی۔“ وہ پکار پر چونکا تھا چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”کیا بچے، کچھ کہا؟“ رتبہ نے گہرا سانس بھرا بھرنے کے بعد اسے دزدیدہ نگاہوں سے گھورنے لگی۔

”ہاں جی، اس کے بارے میں بات کر رہی ہوں جسے سوچ سوچ کر آپ ہلکان ہو گئے ہیں۔ پریشان نہیں ہوں لوٹ آئے گی۔“

ہونٹوں پر انگلی رکھے وہ گم نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھے گیا۔

”تمہیں کیا لگ رہا ہے، میں اس کی جدائی سے پریشان ہو رہا ہوں۔“ استغہامیہ انداز میں پوچھا گیا۔ رتبہ کے ماتھے پر بل پڑے اور لبوں پر پھسکی مسکان۔

”ہاں، کیا نہیں ہو رہے؟“ وہ مستعجب ہوئی اس سے زیادہ حیران۔

”بچی ہو تم بالکل۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے مسکرایا پھر وہاں سے کھڑا ہو کر کچن میں چلا گیا جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نیم گرم پانی کی شیشے کی بوتل تھی۔ وہ اس پر سے لکڑی کا ڈھکن ہٹا کر ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔

”اگر تم اس وجہ سے پریشان نہیں ہو، تو کیا وجہ ہے؟“ وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھا۔ ایک گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے شانے اچکا دیے۔ رتبہ کا ماتھا ٹھنکا۔

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ہاں مجھے یاد آیا، وہ اس بیگ میں، میں کچھ کپڑے لے

کر آیا ہوں انہیں پرلیس کر دو اور آج مالش بھی کر دینا میرے بالوں میں، مجھے لگتا ہے انہیں تیل کی ضرورت ہے۔“ وہ سہولت سے بات کو بدل گیا تھا۔ رتبہ کو شک ہوا۔

”تمہیں میرا وعدہ یاد ہے نا۔“ وہ کس بابت کہہ رہی تھی۔ اس کا بھائی بخوبی سمجھ رہا تھا۔ نظر انداز کرنا اس کی فطرت میں تھا سو وہ پھر سے اس بات کو نظر انداز کر گیا۔

”صبح میں وقتی آؤں گا تو پلیز میرے کپڑے پرلیس رکھنا، مجھے کہیں ارجنٹ جانا ہے۔“ رتبہ کے بدن میں ٹھنڈا ترنے لگی۔ کپکپی تھی جو اسے شروع ہو چکی تھی۔

”تم پھر اسے مارنے کا پلان کر رہے ہو۔“ حیرت درحیرت۔
”رتبہ، مائنڈ یو راؤن بزنس۔“ وہ اسے پہلی بار جھڑک رہا تھا۔ رتبہ کا نرم دل منٹوں میں پانی ہوا۔

”تم ایسا کر رہے ہو۔“ اب کی بار جواب مطلب کا آیا تھا۔ وہی کہا گیا جو اس نے کہنا تھا۔
”ہاں، کیونکہ پہلے دن سے یہی طے تھا۔ پہلے اسے ماروں گا اور پھر آخری شکار کو، دنیا دیکھے گی جانوروں کی موت کو، دنیا کا نپے گی ان کی موت پر۔“ وہ پاگل تھا۔ وہ جانتی تھی۔ وہ بلیٹ تھا، اسے پتا تھا۔ وہ ظالم و جنونی ہوگا، اس کا ادراک اسے اب ہوا تھا۔

”اس کے بعد کیا کرو گے تم؟“ بوتل میں چند گھونٹ پانی بھر گیا تھا۔ وہ اس پانی کو ہلاتے ہوئے اپنی بہن کو دیکھے گیا۔

”سرنڈر کروں گا مگر اس سے پہلے کسی کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔“ رتبہ کی لبالب بھری آنکھیں چھلک پڑیں۔
”کس کو؟“

”وہ جو اس کے آس پاس منڈلاتا پھرتا ہے۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے وہ شخص۔“ لہجے

سے چھلکتا نخوت بڑا واضح تھا۔ گال پر پھسلتے آنسو کے ساتھ وہ مسکرائی۔

”شراکت پسند نہیں ہے پھر بھی جابر بن رہے ہو۔“ اس نے اپنی بہن کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ایک یہی چیز تھی جس کا سامنا وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے آنسو اسے گھائل کرتے تھے۔ اس کے آنسو اسے اذیت دیتے تھے۔

”رتبہ اس بات کو سمیٹ دیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔“ اس نے اپنے گال پونچھے۔ ”یہ بتاؤ تمہارے سرنڈر کرنے کے بعد میرا کیا بنے گا۔ جبکہ میں مکمل طور پر تم پر منحصر ہوں۔“ وہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا بھائی تذبذب کا شکار ہو رہا ہے۔

”اس لیے کہتا ہوں خود کو ہیل کرلو، دنیا کا سامنا کرو، مضبوط بنو۔ میں تمام عمر تمہارے ساتھ نہیں ہو سکتا رتبہ، مجھے تمہاری شادی کرنی ہے۔ تمہاری خوشیاں دیکھنی ہیں اور۔“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ رتبہ جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتی بھاگی تھی۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔ وہ جانتا تھا۔ وہ اس کہ شہ رگ کو چھیڑ چکا ہے۔ غلطی کر چکا ہے۔ فاش غلطی۔

وہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر پولیس اسٹیشن میں اس وقت کنٹرول روم میں حیدر کے ساتھ دو سنئیر انسپکٹر بھی موجود ہے۔ کمال کا شمار ان دو افسروں میں ہوتا تھا۔ وہ اس وقت پانی میں موجود انسان کو دیکھ رہے تھے جس کی ریکارڈنگ بڑی مہارت سے کی گئی تھی۔ گہرے پانیوں میں تیرتا وہ انسان بلاشبہ انہیں بھی قیس ہی لگا تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہوئے۔ ان کے اشارے پر جنگل والی ریکارڈنگ چلائی گئی تھی۔ انہوں نے شوز پر زوم کروایا تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے کہہ سکتے تھے کہ یہ جوتے قیس کے ہیں مگر وہ کیا بے وقوف ہے جو کیمروں کی موجودگی

جاننے کے باوجود بھی اپنے پسندیدہ جوتے پہن کر آئے گا۔ مجرم غلطی کرتا ہے اور قیس نے بڑی ہی کوئی فاش غلطی کر دی تھی۔ ان کے ماتھے پر پسینہ چمکا۔

”سر، شینزل میم والی ریکارڈنگ بھی ہمارے پاس ہے۔“ نشاء کی اطلاع پر اسے چلانے کی اجازت دی گئی۔ شینزل کے بیان کے مطابق قاتل نے اس پر حملہ کیا تھا۔ وہ قاتل جب بھاگتا ہوا ایک کار کی بونٹ سے چھلانگ لگا رہا تھا تب اس سے کچھ دیر پہلے اس نے لائیٹس آن کرنے کا اشارہ دیا تھا۔ بونٹ سے چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے دو ہاتھ سیاہ کار کی سطح پر رکھے اور اپنے وجود کو اوپر اچھالا عین اسی لمحے پر حیدر نے اس کلپ کو رکوا دیا تھا۔ روشنیوں میں کار کی سیاہ سطح پر اس انسان کا نقاب میں چھپا چہرہ واضح تھا۔ نشاء نے حیدر کے کہنے پر اسے زوم کیا۔

”اس کی آنکھوں کو فوکس میں لو۔“ بڑی ساری پانچ سات اسکرینز پر نقاب میں سے چھلکتی دو آنکھیں واضح تھیں۔ حیدر کا دل نچڑ گیا۔ انہوں نے کیپ کو سر پر سے اتارا۔

”جو خط ڈیڈ باڈیز سے ملے ہیں ان کی اور قیس کی رائیٹنگ میچ کرو، کرنے کے بعد مجھے اطلاع دینا۔“ ڈھلکے ہوئے شانوں کے ساتھ وہ کمرے سے باہر جا رہے تھے۔ کمال نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ ان آنکھوں کو دیکھا جو قیس الہی کے سوا کسی کی نہیں تھیں۔ شینزل ٹھیک تھی۔ قاتل وہی تھا۔

”ہم اتنا عرصہ اندھیرے میں رہے۔ قیس سر کی عدم دلچسپی اور سستی پر کڑھتے رہے لیکن ہم اس بات سے انجان رہے کہ قاتل وہی ہیں۔“ کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ اب وہاں فقط نشاء اور کمال ہی تھے۔

”یقین تو نہیں آتا مگر حقیقت یہی ہے۔“ اس نے سسٹم آف کرتے ہوئے پڑ مردہ دل

کے ساتھ کہا۔

”شاید یہی وجہ ہے جس کے سبب شینزل میم اور ان کے درمیان علیحدگی ہوئی۔ شاید قیس سرکا مزاج اسی طرح کا ہوگا۔“ کمال نے نفی میں سر ہلایا۔

”ایسی بات نہیں، وہ ابھی بھی ان کی بیوی ہیں۔ ان کے نام کے بعد ابھی بھی قیس الہی ہے یعنی وہ ابھی تک ان سے منسلک ہیں۔“ نشاء کرسی کو دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سوال کر رہی تھی جو کہ یہ تھا۔

”اب کیا ہوگا؟“

”اب یہ ہوگا کہ آفشلی طور پر قیس سر کو سپینڈ کر دیا جائے گا اور انہیں سزا دی جائے گی۔“ نشاء اداس ہوئی۔ جو بھی تھا وہ ایک اچھا انسان تھا۔ ایک زندہ دل انسان جو عہدے کے تفرق سے بالکل الگ تھا۔ جس کیلئے کوئی چھوٹا بڑا نہیں تھا۔ وہ انسان جو چوکیدار کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھا سکتا تھا جو اس کے گلاس میں پانی پی لیتا تھا۔ وہ کس طرح ایک قاتل ہو سکتا ہے۔ وہ الجھ گئی۔ بری طرح الجھ گئی۔

”اور یہ سب کب تک متوقع ہے۔“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا تھا۔

”زیادہ سے زیادہ پندرہ دن، کم سے کم ایک ہفتہ۔“

وہ سر ہلاتی کمرے سے باہر گئی تھی۔ جاتے ہوئے وہ کسی کا نمبر ملا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ لیا تھا جس پر وہ عمل کرنے والی تھی۔ بہت جلد عمل۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

چاہتوں کے دور میں
حلاوتوں کے رنگ ہیں

نفرتوں سے ہم پرے
خاہشوں کے سنگ ہیں

سڈنی میں اس وقت شام اتری ہوئی تھی۔ سورج کی پڑمردہ سی کرنیں منڈیروں سے پھسل کر واپس جا رہی تھیں۔ ہوا میں نرمی گرمی سی تھی۔ کونل کی کوک کہیں دور سے کان میں پڑتی اچھا تاثر پیش کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایک اسٹریٹ کیفے میں موجود تھے۔ بلاک زمین ان کے پیروں تلے بچھی تھی۔ آسمانی رنگ کی چھتری ان کے سروں پر تھی۔ لکڑی کی سفید کراس والی کرسی و میز پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ دیے، نظریں آپس میں ملائے، ان کے کافی کگ ہاتھوں سے پرے دائیں بائیں جانب رکھے تھے۔ جھاگ تازہ تھی جس پر دل بنے ہوئے تھے۔

”میں سمجھتا ہوں اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔“ بٹر فلائے کٹ بالوں والی لڑکی نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں آسودگی رچی بسی تھی۔

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتی ہوں جیری، میں تو کتنی بار تمہیں پرپوز کر چکی ہوں۔ تم ہی دیر کر رہے تھے۔“ اس لڑکے نے جیب سے سرخ مخملی ڈبیانکالی جیسے ہی اس نے اسے کھولا لڑکی کی آنکھیں مسرت سے پھیل گئیں۔ جگر جگر کرتی انگوٹھی اپنی قیمت بتا رہی تھی۔

”کیا مجھے اجازت ہے؟“ اس لڑکی نے یکدم نفی میں سر ہلایا۔

”یہ بہت مہنگی ہے۔ میں یہ نہیں لے سکتی۔“ اس نے انکار کیا جسے جیری قطعی خاطر میں نہیں لایا۔ وہ انگوٹھی کو نکال کر اس کی مرمریں انگلی میں پہنا رہا تھا۔ پہنانے کے دوران کہہ رہا تھا۔

”جتنی بھی قیمتی ہو، ہم دونوں کی محبت سے زیادہ مہنگی نہیں ہوگی۔“ وہ اس انگوٹھی کو پہنانے کے بعد اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اسے اس دنیا کے سب سے خوبصورت ترین ہاتھ لگے

تھے۔ وہ مسکرا دیا۔

”تم پاگل ہو بالکل۔“ لڑکی نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔ جیری نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

”سو تو ہوں، اچھا اب کافی پیتے ہیں پھر ہمیں لانگ ڈرائیو پر بھی تو جانا ہے۔“ ان دونوں نے وہاں بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کیں۔ کافی میں ماش میلو ڈال کر پینے کی عادت اس کی پیاری سی منگیتر کی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اللہ کا شکر گزار ہوا تھا۔ وہ جب بری طرح بھٹک رہا تھا۔ اندھیروں میں تھا تب وہی تھی جو اسے راہ راست پر لائی تھی۔ تب وہی تھی جس نے اسے گند سے باہر نکالا تھا۔ وہ کیا بن رہا تھا۔ ایک جانور، ایک ظالم، ایک ایڈیکٹ، اسے راہ چاہیے تھی۔ اسے راہ دکھائی گئی۔ وہ عورت ہو کر اس مرد کو سنبھال گئی تھی۔ وہ مرد ہو کر خود کو نہیں سنبھال پایا تھا۔ اس نے ہر طرح کے گناہ کیے تھے۔ وہ ہر برائی میں گہرائی تک اتر اٹھا تھا۔ وہ جب اندھیروں میں بھٹک رہا تھا تب اس نے اپنے پیچھے پاگل ایک لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ شادی کے فنکشنز سے دور بھاگتا تھا۔ شادی سے چڑھتی اسے۔ لیکن اس لڑکی کی جنونیت، اس کا پاگل پن اسے اس کے ساتھ جڑنے پر مجبور کر گیا تھا۔ اس نے کتنا دھتکارا تھا اسے، کتنا روکیا تھا۔ کتنی نفرت ظاہر کی تھی مگر وہ پھر بھی ہار نہیں مانی تھی۔ آخری جیری کو ہی ہار مان کر دینی پڑی۔ اس لیے فقط نکاح کر کے رخصتی کر لی تھی بعد ازاں اسے یہ اپنی زندگی کا سب سے سنگین فیصلہ لگا تھا۔ وہ شادی بری طرح ناکام گئی تھی۔ اس کے مزاج میں اور اس کی سابقہ بیوی کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کر پارہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس رشتے کو نباہ نہیں پارہا تھا اور یوں بھی وہ اپنی بیوی کو ایک گرل فرینڈ کے طور پر ہی رکھ رہا تھا۔ اس کے ہر حقوق سے دستبردار تھا۔ جھگڑے شور ڈیلی کی روٹین بن گیا تھا۔ اور پھر آخر وہ رشتہ ختم ہو گیا۔

پھر اسے وہ ملی جس کا ہاتھ تھام کر اس نے روشنیوں تک کا سفر کیا اور آج وہ اسے انگوٹھی پہنا کر اس سفر کو منزل تک پہنچا رہا تھا۔

لانگ ڈرائیو کے دوران ان کی ونڈ اسکرین پر بہت سارے کیڑے مکوڑے چپک گئے تھے۔ موسم ایسا چل رہا تھا اوپر سے ہوا بھی تھی۔ اس لیے اس نے کار کو ایک پٹرول پمپ کے سامنے روکا۔ وہ وہاں موجود دور کر کو اپنے شیشے کو صاف کرنے کا کہہ رہا تھا۔ اسٹیرنگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے اس نے جونہی کھڑکی سے باہر دیکھا جم گیا۔ اس کی پلکیں لوہے کی راڈز میں بدل گئی تھیں جو جھپکنے سے بالکل قاصر تھیں۔ اس نے دیکھا بھورے کوٹ میں ملبوس ایک لڑکی موپ اور پانی سے بھری ہوئی بڑی ساری بالٹی اٹھا کر وہاں آئی ہے۔ اس نے اس بالٹی کو تھوڑی دیر کو نیچے رکھا، گہرے گہرے سانس بھرے کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ اپنے سر کو اونچا کر رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے ایک آزاد سانس خارج کیا پھر گردن کو دائیں بائیں کر کے اس کے مسلز کھینچے۔ اتنے میں ایک آدمی وہاں آ کر اسے کچھ کہتے ہوئے ان کی کار کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اس لڑکی نے نظر کار کی جانب ڈالی پھر حامی بھرتے ہوئے پھر سے بالٹی اٹھالی۔ کار کے قریب پہنچتے ہی اس نے ایک نظر ان میں بیٹھے افراد پر ڈالی پھر کہنی پر رکھی چھوٹی نیلی بالٹی کو زمین پر رکھنے لگی۔ اسپنج کو اس نے چھوٹی بالٹی میں ڈبو کر باہر نکالا پانی کی دھار اس میں سے نکل کر بالٹی میں گر رہی تھی بالکل ویسے جیسے اس کے دل پر آنسو گرنا شروع ہوئے تھے۔ پھر وہ شیشے کی جانب بڑھی۔ جیری سے باتیں کرتی لڑکی یکسر طور پر وہاں آئی قیامت سے انجان تھی۔ وہ رخ اس کی جانب موڑے خوش اخلاقی سے اسے کوئی قصہ سنا رہی تھی۔ لڑکی نے جھاگ سے بھرا اسپنج پورے شیشے پر لگایا۔ اس دوران وہ ان مردانہ آنکھوں سے مکمل طور پر نظریں چرائے ہوئے تھی جو اسے یک ٹک سانس روکے دیکھے جارہی تھیں۔ جھاگ کو اس لڑکی

نے موپ سے ہٹایا پھر خشک کپڑے سے اسے صاف کرنے کے بعد جیسے آئی تھی ویسے چلی گئی۔ جیری کی ناک کی ہڈی سے لے کر گال تک سرخی پھیل چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے ٹھنڈ پھوٹنے لگی۔ وہ دیکھ رہا تھا وہ لڑکی اب دوسری کار کی طرف بڑھی ہے۔ وہ کتنی ہی بار بالٹی کو زمین پر رکھتی پھر کمر پر ہاتھ دھر کر گہرے گہرے سانس لیتی۔ وہ وزن اٹھانے کی حالت میں نہیں تھی پھر بھی اٹھا رہی تھی۔ جیری کا دل سخت شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ وہ سارا فسون جو کچھ دیر پہلے تھا ہوا کی نظر ہوا۔ اس نے اپنے لب بری طرح کاٹے تھے۔ اس کی منگیتر نے اس کا شانہ ہلایا۔

”چلو، دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اس کے کہنے پر چل تو دیا تھا لیکن اس کی نظریں بیک و یو مرر سے اب بھی اسے ہی ٹٹول رہی تھیں جو کسی کار والے سے ٹپ لیتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ جیری کے آنکھوں کے کناروں میں مرچیں بھر گئیں۔ بہترین دن کا بدترین اختتام ہوا تھا۔ قیامت آئی اور گزر گئی۔ دل ریزہ ریزہ ہوئے اور پھر کبھی نہیں جڑے۔ سانس رکی اور بس رکی ہی رہی۔ دور و حیں بس وہیں پٹرول پمپ کے کارواش ایریا میں رہ گئیں۔ خاموش، ایک دوسرے کو تکتی ہوئیں۔ بالکل چپ۔

☆.....☆.....☆

وہ سرینہ میں بیٹھی چائے کی چسکیاں بھر رہی تھی جب یک لخت ہی کوئی اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں پھر اپنے شانے ڈھلکا گئی۔ ”ہیلو لیڈی، کیسی ہو؟“ خوشگوار انداز، تھکا ہوا چہرہ، بجھی سی آنکھیں۔ ”اچھا لگا مجھے دیکھ کر؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جو پتہ نہیں کہاں بھٹکی ہوئی تھیں۔ قیس نے ایک ابرو اچکائی۔

”تمہیں لگتا ہے تم مجھ سے چھپ سکتی ہو۔“ وہ گھٹنے پر پاؤں رکھے، سینے پر بازو باندھے اس سے سوال کر رہا تھا۔ شینزل نے اچھلتی نگاہ اس پر ڈال کر واپس پھیر لی۔

”سات پردوں میں بھی چھپ جاؤ تب بھی تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا، تم میری نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتی شینزل بی بی۔“ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے اس کی نگاہیں عوام پر تھیں جو خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ چچ کانٹے کی آواز وہاں کثرت سے پائی جا رہی تھی۔

”تم نے فون تو چھوڑ دیا تھا مگر تم کیمرے کی آنکھیں بند کرنے میں چوک گئی، کیفے سے بس اسٹیشن، بس اسٹیشن سے لاہور، لاہور سے یہاں دی گریٹ سرینہ میں۔“ وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کی نظر اندازی برداشت کر رہا تھا۔

”اور پھر بھی میرے سامنے۔“ شینزل نے رخ موڑے رکھا جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں، ایک سیکنڈ گزرا، پھر دوسرا پھر تیسرا اور پھر بیسواں، قیس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ لڑکی اسے زچ کرنے کے بہت سے گر جانتی ہے۔ اس بات پر قیس کو آنکھ بند کر کے یقین تھا۔

”اوہیلو، تم سے بات کر رہا ہوں میں؟“ وہ اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا رہا تھا۔ شینزل نے چونکنے کی اداکاری کی۔

”ایکسیکویزمی، کون ہو تم اور کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہے ہو۔“ قیس کا منہ کھلا، ابرو اچکی پھر اس کے لب ہولے ہولے پھیلنا شروع ہوئے۔

”درا۔۔۔ صل۔“ وہ نچلے لب دانتوں میں پکڑ کر چھوڑ رہا تھا۔ ماتھے پر خوشگوار حیرت کے بل تھے اور آنکھوں میں شوخی، وہ کرسی پر آگے کو جھک کر بیٹھا۔ ”میں اناؤنس کر سکتا ہوں میں تمہارا کون ہوں۔ کروں؟ صبر کرو، لیڈیز اینڈ جینٹلمین۔“ وہ گلاس اور کانٹا اٹھا کر کھڑا ہوا اور اسے بجاتے ہوئے لوگوں کو خود کی جانب متوجہ کرنے لگا۔ قبل اس کے سب اس کی جانب

متوجہ ہوتے شیزل نے جھک کر اس کی شرٹ کھینچی۔

”یہ کیا حرکت کر رہے ہو تم، بیٹھو فوراً۔“ قیس نے گلاس اور فورک کو واپس میز پر رکھا پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ نظروں کا ارتکاز اسی پر تھا جس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔

”تم نے قسم کھا رکھی ہے تم مجھے چین نہیں لینے دو گے ہے نا۔“ وہ تپ چکی تھی اس بات کا اندازہ قیس کو ہو گیا۔

”ویل، یہ جملہ تو میرا تھا جو تم نے بول دیا۔ اکیچو کلی۔“ وہ میز پر ایک ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا۔ ”تم دو جواب اس بات کا، ہری اپ۔“ شیزل نے غصہ سے ہنکارہ بھرا۔ وہ یہاں اس انجان شہر میں آئی تھی کہ اپنا ڈپریشن ختم کر سکے۔ اگلا لائحہ عمل طے کر سکے۔ سکون سے سوچ سکے۔ مگر یہ جو تک اسے یہاں بھی چپک گئی۔ وہ بری طرح بد مزہ ہوئی تھی۔

”قیس، تم مجھ سے بات نہیں کرو ورنہ میں نے یہ گلہ ان اٹھا کر تمہارے سر پر مار دینا ہے۔“ وہ جس ذہنی خلفشار سے گزر رہی تھی اس بات کا اندازہ قیس کو تھا۔ یہ تناؤ اسی کی دین تھا وہ جانتا تھا۔

”ہاں تو مار دو میں کون سا روک رہا ہوں، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا سر پھٹے گا خون نکلے اور بس۔۔۔ تمہارا غصہ تو ختم ہو جائے گا نا کم از کم۔“ شیزل کا ڈنرا اس کی میز پر چنا جانے لگا۔ قیس کی بھوک کی اشتہا بڑھی۔ وہ ہاتھ رگڑتا ہوا کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ شیزل نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے گھور کر سر کونفی میں ہلایا۔

”تم بہت ڈھیٹ ہو۔“ وہ اسٹیک کا ٹکڑا کانٹے میں کھبو کر منہ میں لے جا رہا تھا۔ چکن کو دانتوں میں چباتے ہوئے وہ اضافہ کرنا نہیں بھولا۔

”بلا کا۔“ شیزل کرسی کو آواز کے ساتھ پیچھے کی اور سر کا کراٹھ کر جانے لگی تھی جب قیس کی

دُہائی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ تھیر بھرے انداز میں مڑی۔

”بل کون دے گا۔“ شیزل کی گھوری، قیس کی میسنی سے صورت۔“ یعنی میں پوچھ رہا تھا کہ۔“ اس نے سرینہ کی بلڈنگ پر نظر دوڑائی۔“ مہنگا کھانا ہے یہاں کا تو بل بھی خاصا موٹا لگے گا نا۔“ شیزل نے دانت کچکچاتے ہوئے اپنے پرس میں سے کارڈ نکال کر میز پر پٹخا اور روانی میں پن کوڈ بتاتی وہاں سے چلی گئی۔ وہ شہر دل کی سڑکوں پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس کا دماغ عمیق سوچوں کی آماہ جگہ بن چکا تھا۔ اس کا دل بہت تاریک تھا۔ وہ احد اور قیس کے درمیان پھنس چکی تھی۔ وہ کیس و قاتل کے درمیان پھنس چکی تھی۔ وہ قیس کو جانتی تھی۔ اچھے سے جانتی تھی۔ وہ اس کی خوشبو پہچان لیتی تھی۔ اس کے لمس سے واقف تھی۔ اس کی موجودگی سے آشنا تھی۔ وہ آنکھ بند کر کے کہہ سکتی تھی کہ اس روز پارکنگ لاٹ میں اس کا سامنا قیس سے ہی ہوا تھا۔ وہ اسی کی خوشبو تھی۔ وہ اسی کا انداز تھا۔ وہ بلاشبہ قیس ہی تھا۔ وہ قتل کر رہا تھا۔ مگر کیوں؟ وہ انتقام لے رہا تھا مگر کس لیے؟ بہت ساری سوچیں تھیں۔ بہت سارے تانے بانے تھے جن کو سلجھانے وہ یہاں تھی مگر پھر بھی تنہا نہیں تھی۔ ٹھس سے انداز میں سینے پر ہاتھ باندھے وہ چہل قدمی کر رہی تھی جب کسی نے اس کے شانے کے ساتھ اپنا شانہ ٹکرایا تھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار، شیزل نے خود کو روکا اس کے برابر چلنے والا بھی رک گیا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے تڑخ کر دریافت کیا۔

”سوری۔“ بے ساختہ کہا گیا۔

”ناٹ ایکسپنڈ، اب میرے راستے میں مت آنا۔“ وہ چلنے لگی تھی۔

”ویری سوری یعنی ویری ویری سوری۔“ وہ یکدم اس کے سامنے آکر کان پکڑ گیا تھا۔

”میں خوشگوار موڈ میں نہیں ہوں قیس۔“ اس نے لبوں کو کھینچا۔ (ہوتی کب ہو خوشگوار موڈ

میں تم، سڑیل)

”میں بھی سنجیدہ ہوں، واللہ۔“ دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر وہ ایک بار بیٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ محظوظ ہو رہے ہیں۔ باتیں بنا رہے ہیں۔ فسانے گھڑ رہے ہیں۔ اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس نے ”دنیا والوں“ کی پرواہ کرنا کب کی چھوڑ دی تھی۔ تبھی وہ من موجدی تھا۔ تبھی وہ مسرتوں کا کھوجی تھا۔

”قیس تماشا نہیں بناؤ۔“ وہ سخت لہجے میں اسے ٹوک رہی تھی۔ اس نے سٹاپ کرنا بند کیے۔ اس کے سامنے کھڑے کھڑے کہنے لگا۔

”تو پھر معاف کر دو، سچ میں آئندہ کوشش کروں گا کہ زیادہ اوورری ایکٹ نہ کروں۔“ شیزل نے تضحیک سے ہنکارہ بھرا۔

”اوورری ایکٹ؟ تم اوورری ایکٹ نہیں کرتے تم دل چیر دیتے ہو۔ زندہ درگور کر دیتے ہو، تم سمجھتے بھی ہو تم میرے ساتھ کیا کر چکے ہو؟“ وہ سوال کر رہی تھی۔ بہت پیچیدہ سوال۔

”میں مانتا ہوں میں بہت برا ہوں۔ میرے برے پن کی کوئی انتہا نہیں ہے لیکن۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ قیس کو اس کی آنکھوں میں موجود حزن و رنج نہیں بھایا۔ وہ اداس ہونے والوں میں سے نہیں تھا مگر وہ اداس ہو رہا تھا۔ وہ مغلوب ہونے والوں میں سے نہیں تھا مگر وہ مغلوب ہو رہا تھا۔ لیکن اب میں اپنی تمام زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں سب فکس کرنا چاہتا ہوں۔“

شیزل ایک قدم اس کے قریب آئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہوا تھا۔

”ازالہ کرنا ہے نا تمہیں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ امید کے جوت سے جگمگاتی آنکھیں اور تیزی سے ہلتا ہوا سر۔ ”میری جان بخش دو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں

معاف کر دوں گی پھر تمہیں۔“ امید کی جوت بجھ گئی۔ جملے تیز ہوا کی مانند آئے اور آنکھوں میں جلتے چراغوں کو بجھا گئے۔

”آپ کو بھول جاؤں یعنی میں پھر سے مر جاؤں۔“ شیزل کا دل بھر گیا مگر آنکھیں قحط زدہ رہیں۔ وہ جانتی تھی اس کی آواز میں لرزش کی آمیزش گھل چکی ہے تبھی لبوں کو سختی سے ایک دوسرے کے اوپر پیوست کیے سر کو اثبات میں ہلارہی تھی۔

”تجویز اچھی ہے لیکن آخری لائن بہت ہی گھٹیا ہے کیونکہ۔“ سارا طلسم یکدم سے ٹوٹا اب کی بار وہ اس کے نزدیک آیا تھا اور شیزل نے ہلنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ”ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، یاد رکھو۔“ وہ انگلی اٹھا کر وارن کر رہا تھا۔ ”جہاں تم ہوگی وہاں میں ہوں گا اور آف کورس کیونکہ اب میری شادی ہو چکی ہے تو جہاں میں ہوں گا وہاں ہمارا ملازمی ہوگی۔ یہ ٹرائے اینگل کبھی نہیں ٹوٹے گا۔“

وہ ایک نمبر کا گھٹیا، ڈھیٹ اور دو منازر تھا۔ اس بات پر مہر لگ چکی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ میں دل میں چڑھتا تھا اور اگلے ہی لمحے دل سے اتر جاتا تھا اور اگلے ہی پل پھر سے اپنی جگہ بنا لیتا تھا جیسے اب بنانے کی سعی میں تھا۔

”کیونکہ آپ میرا عکس ہو اور میں آپ کا، ہمارے دل آپس میں بری طرح جڑے ہیں۔ آپ چاہے لاکھ انکار کر لو، لاکھ نفرت جھاڑ لو، لاکھ منہ پھیر لو یہ بات تو پھر بھی برحق ہے کہ میں آپ کے دل کے سب سے اونچے مقام پر فائز ہوں۔ میری جگہ کوئی اور لے ہی نہیں سکتا اور یہی حال میرا بھی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں۔“ شیزل کی آنکھوں کی قحط سالی میں بارش ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی اکھٹا ہو رہا تھا جسے وہ پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئی مگر ناکام رہی کیونکہ اس کی آنکھوں میں بھرے آنسو جو اس کے دل پر گر رہے

تھے قیس نے دیکھ لیے۔

”تم خوش گمانیوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو قیس الہی، ایک ماں کیلئے اس کی اولاد کا قاتل کبھی بھی دل کے قریب نہیں ہوا کرتا کجا کہ وہ اونچی مسند پر موجود ہو۔ تمہارا وہ تھپڑ، وہ جھٹکنا میں نہیں بھولی ہوں۔ یاد رکھنا یہ بات تم اب میرے کوئی نہیں ہو۔“

وہ ساکت و جامد سن وجود کے ساتھ کھڑا اسے سن رہا تھا۔ کچھ وقت گزرا اسے سمجھ نہیں آئی اور جب سمجھ آنا شروع ہوئی تب اس کی سماعت میں سیٹیاں بجنی شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں دوڑاٹھی تھیں۔ یہ کیسا الزام تھا جو اس کے سر آگیا تھا۔ یہ کیسی تکلیف تھی جو وہ جھیل رہا تھا۔ شیزل وہاں سے چلی گئی۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنا سینہ مسلتا ہوا جنگلے سے جا لگا۔ یہ کیا تھا جو وہ سن چکا تھا۔ یہ کیا تھا جو وہ سہہ چکا تھا۔ اس نے دل کو زور زور سے تھپکنا شروع کیا۔ وہاں سے گزرتا راہ گیر اس کی حالت دیکھ دریافت کرنے لگا۔

”بیٹے، تم ٹھیک ہو؟“ اسے سانس واقعی نہیں آ رہا تھا۔ وہ خود حیران ہو گیا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس نے زندگی میں بہت سے فیزدیکھے تھے۔ بہت سی تکالیف جھیلی تھیں مگر یہ والا جو درد تھا یہ ناقابلِ بیاں ناقابلِ یقین تھا۔

”تمہیں کچھ چاہیے؟“ سوال پھر سے آیا تھا۔ جنگلے سے ٹیک لگائے قیس نے برق رفتاری سے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

”آ کیسجن۔“ اسے بولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کیوں ہو رہی تھی۔ وہ متحیر ہوا۔ اس ادھیڑ عمر آدمی نے دیکھا اس لڑکے کے ہونتوں کے ساتھ ساتھ اس کے ناخن اور انگلیوں کے پور بھی نیلے پڑ چکے ہیں۔ معاملہ سمجھ کر وہ دکانوں کی اور دوڑا صد شکر وہاں ایک میڈیکل اسٹور

تھا۔ وہ وہاں سے ان ہیلر لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے منہ کھولنے کا کہا۔ قیس اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ استھما کا مریض نہیں ہے لیکن یہ وقت بحث کا نہیں تھا۔ اس کی سانس انگی ہوئی تھی اور اسے اس وقت آکسیجن کی ضرورت تھی جو اس نے لے لی۔ دو تین اسپرے کے بعد اس کی سانس بحال ہوئی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس بھر کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نارمل ہو رہا تھا۔

”بیٹا جب آپ کو پتہ تھا آپ مریض ہو تو آپ پمپ ساتھ رکھتے اپنے۔“ قیس نے جھٹکے سے اس آدمی کی طرف دیکھا پھر انتہائی کڑوے انداز میں کہنے لگا۔

”نصیحت کیلئے شکریہ اور مدد کیلئے بھی، لیکن میں مریض نہیں ہوں۔“ وہ اس آدمی کو کر اس کر کے جانے لگا تھا پھر کچھ یاد آنے پر پلٹا۔ اس کے ہاتھ سے ان ہیلر لیا۔ اپنی جیب سے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور آگے کی اور بڑھ گیا۔

”لا حول ولا قوۃ، آج کل کے بچوں میں تمیز بالکل ندارد ہے۔“ وہ آدمی بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ جگہ جہاں دل ٹوٹا تھا خالی رہ گئی تھی۔



دوپہر ڈھل رہی تھی۔ دن دراز ہو رہے تھے۔ یہ جنوری کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی جس میں بیٹھا وہ اپنے جوتے کے تسمے کس رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس اس کی دائیں جانب پڑا تھا۔ کوٹ وہ پہن چکا تھا۔ سپر اس نے کر لیا تھا۔ کیمل رنگ کی گھڑی کی طرح کے ہی اس کے جوتے تھے جن کے تسمے کس کر وہ سیدھا ہوا۔ رحمت بڑی فرصت سے اسے سب کارروائی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ایک گہرا سانس لے کر انہوں نے سوال کیا۔

”لاہور کیا کام پڑ گیا تمہیں جو یوں آنا فانا جا رہے ہو، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ اس نے

دائیں پاؤں کے جوتے کو دوبار زمین پر مارا، یہ جوتا اسے صحیح فٹ آیا تھا۔ ایک آن لائن ویب سائٹ پر اسکرول کرتے ہوئے شینزل کو یہ شوز بہت پسند آیا تھا۔ وہ اسے اپنے سائز میں منگوانا چاہتی تھی مگر اس کا سائز اس اسٹرکچر میں نہیں تھا۔ وہ بہت مایوس ہوئی تھی۔ احد نے اپنے سائز کا جوتا منگوانے کے بعد بالکل ایسا ہی جوتا اس کیلئے آرڈر پر بنوایا تھا۔ وہ کیمبل کلر کالیسز والا بالکل سادہ اور نفیس جوتا تھا۔ جس کی ایک جوڑی احد کے پاؤں میں تھی اور دوسری اس کے سوٹ کیس میں۔

”ماں، بہت سے کام ہوتے ہیں جو فوراً کرنے ہوتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا پھر ریٹ واپس میں وقت دیکھا۔ اس کی فلائیٹ میں ابھی ٹائم تھا۔

”مثلاً؟“ رحمت کے دریافت کرنے پر وہ پرسوج انداز میں خلاء میں گھورنے لگا۔ بات بن گئی تھی تبھی وہ نگاہوں کا ارتکاز توڑ کر اپنی ماں کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”مثلاً آفس کا کام، مثلاً پرسنل کام۔“ رحمت نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔ وہ سمجھ گئی ان کا بیٹا انہیں بتانے سے گریز کر رہا ہے۔

”ٹھیک ہے مان لیا لیکن پھر شادی کا کیا، میں نے تو خاندان والوں کے ہر ایک فون پر یہی کہا ہے کہ تم میرے ساتھ آرہے ہو۔“ احد نے گہرا سانس بھرا۔ اب یہ بہت مشکل مرحلہ تھا جسے اسے پار کرنا تھا۔ ہر صورت کرنا تھا۔

”آپ معذرت کر لیں نا یقین کریں کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ رحمت اس کی بے نیازی سے پھر سے نالاں ہوئیں۔ اسے ٹوک دیا۔

”تم اتنے غیر ضروری نہیں ہو جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنا۔ تم یوسف زئی خاندان کے واحد پڑھے لکھے نوجوان ہو، برسر روزگار ہو، خوبرو ہو، تمہاری غیر

موجودگی تو خاندان کے ہر فرد کو کھلے گی۔ اپنے آپ کو ویلیو دینا سیکھوڑ کے، کب تک میں تمہیں سمجھاتی رہا کروں گی۔“

اس نے کان کی پشت کھجاتے ہوئے رحمت کا لیکچر سنا۔ وہ اس کی ماں تھیں۔ اس کی پیاری ماں، جنہوں نے بڑے لاڈ سے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ مامتا دی تھی۔ کسی بھی غرض کے بغیر، کسی بھی لالچ سے پرے، تو پھر وہ کیوں نہ ان کا احترام کرتا۔ وہ کیوں نہ ان کی عزت میں گھلتا۔ اس نے کہا جو اسے کہنا چاہیے تھا۔ جو اس وقت بہت ضروری تھا۔

”قدر کرتا ہوں آپ کی بات کی اور آئندہ اس پر عمل بھی کروں گا مگر ماں۔“ اس نے توقف کیا۔ رحمت اسے دیکھے گئیں۔ ”ابھی جانا بہت ضروری ہے اگر نہ ہوتا تو آپ کو لگتا ہے میں آپ کی بات ٹال سکتا تھا۔“ رحمت نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا۔

”خاہ، مکھن لگانا کوئی تم سے سیکھے۔“ وہ کھڑا ہوا رحمت بیٹھی رہیں۔
”دیکھ لیں پھر میرے مکھنوں سے آپ کتنی حسین ہو گئی ہیں۔“ وہ جھکا، جھک کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”بیٹے، حسین میں پیدائشی ہوں یوں کہو تمہیں چا پلوسی آگئی ہے۔“ ان کے ہاتھ چومتے ہوئے وہ یک لخت ہنسا، حیرت سے دریافت کیا۔

”اب یہ چا پلوسی درمیان میں کہاں سے آگئی۔“ وہ ہاتھ پر بوسہ دینے کے بعد انہیں آنکھوں سے لگا رہا تھا۔

”جہاں سے تمہارا ضروری کام آیا ہے۔“ آنکھوں پر ہاتھ لگانے کے بعد وہ سیدھا ہوا اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا ماں، کتنا تجسس بھر لیا ہے آپ نے اپنے اندر، صحت کیلئے یہ اچھا نہیں ہوتا میں بتا رہا

ہوں آپ کو۔“ سوٹ کیس کو تھام کر وہ واپس ان کی طرف مڑا۔

”جب بیٹے ماؤں سے باتیں چھپانے لگ جائیں تا تو تجسس خود بہ خود ہی ان کے دل میں بھر جاتا ہے۔ لیکن اب کیا کروں۔ نئی جنریشن ہو تم پر سئل گیپ بھی چاہیے ہوتا ہے، پرائیوی بھی ہوتی ہے اس لیے میں نہیں کرید رہی۔“ وہ جھک کر ان کے گلے لگا۔ رحمت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن اپنی بات جاری رکھی۔“ بس اتنا کہوں گی اپنا ڈھیر سارا خیال رکھنا، خیر سے جاؤ خیر سے آؤ۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر تعظیم بھرے انداز میں سر کو تھوڑا سا جھکایا۔

”بے فکر رہیں جلد آؤں گا اور ہاں میری ہر ہدایت پر آپ نے عمل کرنا ہے۔ کھانا وقت پر کھانا ہے۔ دو اوقات پر لینی ہے۔ واک وقت پر کرنی ہے اور ایکسرسائز بھی وقت پر ہی کرنی ہے۔ ماں کتنی بری بات ہے ایسے منہ تو نہ بنائیں۔ ایک منٹ کی آپ واک کرتی ہے۔ دو منٹ کی بیٹھے بیٹھے آپ کی ایکسرسائز ہوتی ہے پھر بھی آپ منہ بناتی ہیں۔ آپ کی صحت کیلئے ہی کہتا ہوں میں بالکل ویسے جیسے آپ میری بہتری کیلئے مجھے سمجھاتی رہتی ہیں۔“ رحمت گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئیں۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اب جاؤ تم، دیر ہو رہی ہے تمہیں۔“ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں تھی۔ دعائیں دیتے ہوئے اسے رخصت کر رہی تھیں۔ احدا پارٹمنٹ سے باہر آیا۔ ایئر پورٹ کیلئے نکلتے ہوئے اس نے شینزل کا نمبر ملایا تھا جو اس وقت مصروف جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے میں وہ دوبار اس کا نمبر ٹرائے کر چکا تھا مگر دونوں ہی بار وہ مصروف ملا تھا۔ اس کے نام ایک وائس میسج چھوڑنے کے بعد وہ پہاڑوں سے ڈھکی اس سرزمین کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا وقت یکخت کچھ برس پیچھے چلا گیا تھا۔ حال کی کتاب کے صفحے پیچھے کی اور پلٹے اور ایسے ہی کسی ایک منظر پر جا رہے جہاں اسی طرح کی ایک کار میں ایک لڑکا سوار تھا۔ بس فرق اتنا تھا

کہ احد اس جگہ کو چھوڑ رہا تھا اور وہ لڑکا یہاں آ رہا تھا۔ ماضی کی کتاب کے صفحے میں ایک سفید کار سفید ماربل سے ڈھکی پرسوزی حویلی کے باہر آ کر رکی۔ اس کار میں سے ایک لڑکا باہر نکلا تھا۔ حویلی کی بلند و بالا عمارت پر نظر دوڑا کروہ اندر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جونہی اس نے صحن میں قدم رکھا۔ لان میں اگے سبزے پر اسے چند کرسیوں پر کچھ صحافی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ چھتری تلے بیٹھا اس کا باپ پل بھر کو اسے دیکھ کر ٹھٹھکا تھا۔ مگر اگلے ہی پل وہ بڑے ماہرانہ انداز میں صحافیوں کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ دس منٹ تک وہ سلسلہ چلا تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد جہانگیر اپنی کرسی سے اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وہ ان کی اسٹڈی میں ہی موجود تھا جو آج بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔ کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلا کرتیں جیسے کچھ محبتیں نہیں بدلتیں۔

”اسلام علیکم، کیسے ہو بر خودار۔“ گزرے ماہ و سال میں جہانگیر نے اپنی اس اولاد کے ہاتھوں اتنی خواری اٹھائی تھی کہ اب اس کے ملنے پر ان کے لہجے میں گرجوئی کم اندیشے زیادہ ہوتے تھے۔ خوشی مفقود ہو گئی تھی۔ دھڑکوں نے بڑے دھڑلے سے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔

”آپ نے کہا تھا وہ مر گئی ہے۔“ نا سلام نہ دعا، نہ حال احوال، ایک سال دو ماہ بعد وہ ملا بھی تو کس طرح، سراپا سوال بنا، انگاروں میں سلگا، جہانگیر کی چھٹی حس بالکل درست تھی۔ انہوں نے سر دسائس خارج کیا۔

”تصحیح کرو خود کی، وہ تم تھے جس نے اس بات کا اعلان کیا تھا۔“ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے آدھے لب کھل چکے تھے۔ آنکھیں بار لیش چہرے پر جم گئیں۔

”بابا، جب میں بھٹک رہا تھا تب آپ بازو سے پکڑ کر یہاں لائے تھے۔“ اس نے زمین کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔ آپ نے کہا تھا دیکھو سیٹھ صاحب جس نے ہماری

پرواہ نہیں کی اس کی زندگی نے پرواہ نہیں کی، اس کے شوہر نے تشدد کیا اور وہ مر گئی۔ کہا تھا بابا آپ نے۔“ اس کا گلہ رندہ رہا تھا۔ دل کھنچ رہا تھا۔ جہانگیر صوفی نے پر جا کر بیٹھے۔

”بلاشبہ یہ درست ہے میں نے ایسا کہا تھا مگر آپ مجھے اس سوال کے پیچھے کا مقصد بتاؤ پھر ہی میں سوچوں گا مجھے جواب دینا چاہیے یا نہیں۔“

وہ لڑکا ٹھس کھڑا اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ کوئی اور ہو، اس کے جہان بابا نہ ہوں۔

”تو یعنی وہ سب ایک کہانی تھی۔“ اس نے سرگوشی کی، جہانگیر نے سن لی۔
 ”وہ کہانی آپ بنا کر گئے تھے۔ اسے حقیقت کا جامع میں نے پہنایا ہے بھلے قبر میں وہ نہیں ہے مگر دل اب بھی اس پر ہی ہے۔“ بڑھاپا ایک بار پھر سے جہانگیر کے چہرے کی زینت بن گیا۔ وہ بشائیت جو کچھ دیر قبل ان کے چہرے پر تھی۔ وہ چہرے پر ابھرتی بوڑھی لکیروں میں ڈوب گئی۔

”تو یعنی میرا شک صحیح تھا۔ تو یعنی میں نے اسے ہی دیکھا تھا۔“ اب کی بار چونکنے کی باری جہانگیر کی تھی۔ انہوں نے سماعت میں پڑی بات کی تصدیق کرنی چاہی۔

”کیا کہا، کسے دیکھا تھا؟“ ان کا بیٹا اپنا ماتھا مسل رہا تھا۔ اس کے جسم کا سارا کا سارا خون اکٹھا ہو کر چہرے پر آ گیا۔ اس کے دل کی کیفیت جہانگیر سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ وہ آج بھی آنکھ بند کر کے کہہ سکتے تھے کہ ان کا بیٹا اپنی بہن کی محبت میں پور پور ڈوبا ہے بس اعتراف سے گریزاں ہے۔

”آپ نے۔“ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا مگر وہ مرد تھا۔ آواز پر قابو پانا بخوبی جانتا تھا۔
 ”ٹھیک نہیں کیا میرے ساتھ۔“ اس نے پلکیں اٹھائیں۔ پلکوں کی آڑ میں چھپی آنکھوں میں

جانے کہاں سے خون اتر آیا، جانے کب وہاں عداوت کے رنگ پھیلنے لگے۔ جہانگیر کو دھڑکا لگا ایک اور دھڑکا۔

”آپ کی صحت کیلئے یہ ضروری تھا۔“ اس نے یک لخت اونچی آواز میں ان کی بات درمیان میں قطع کی۔

”آپ نے اسے شوٹ کیوں نہیں کیا، اسے ڈھونڈتے، کھوجتے اور مار دیتے۔ اس قبر میں اسے ہونا چاہیے تھا۔ وہ وہاں کیوں نہیں ہے۔“ وہ گردن کی رگیں پھلائے تھوڑا سا جھک جھک کر ہر جملے کو ادا کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی اور انگارے تھے۔ اس کے دل میں آگ لگ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپاہٹ کا شکار تھے۔ جہانگیر کو گمان تھا کہ ان کا بیٹا صحت یاب ہو چکا ہے۔ ان کا بیٹا نارمل ہو چکا ہے۔ سب غلط تھا۔ سب بھر بھرے ریت کے ٹیلے کی طرح تھا جسے تھوڑے سے جھونکے نے آ کر زمین بوس کر دیا۔ سب ختم کر دیا۔

”کیا تمہیں لگتا ہے میں نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ میں نے اسے بہت تلاشا تھا۔ وہ اس لڑکے کے ساتھ نہیں تھی۔ ایسا اس لڑکے کے گھر والے اور وہ لڑکا کہہ رہا تھا۔ کہے جا رہا تھا حتیٰ کہ دھمکیوں اور ڈراوؤں سے عاجز آ کر انہوں نے ملک چھوڑ دیا۔ میں نے پھر بھی تلاشنا نہیں چھوڑا۔ میرا ہر سورس ناکام گیا پھر بھی میں نے ہار نہیں مانی تھی صرف اس لیے نہیں کہ مجھے اسے شوٹ کرنا تھا بلکہ اس لیے کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ہماری محبتوں کو ٹھکرانے کے بعد بھی وہ آسودہ ہے۔ خوش ہے۔ تم بھائی ہو سوتیلے سگے کی تفریق کو چھوڑنے کے باوجود بھی میں جانتا ہوں غصے میں تم کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتے لیکن میں باپ ہوں۔“ انہوں نے سینے پر انگلی رکھی۔ لرزتی ہوئی بوڑھی انگلی۔“ وہ میرے گلے پر چھری بھی پھیرتی تب بھی میں اس کا ہاتھ نہیں جھٹکتا کہ کہیں اسے تکلیف نہ ہو جائے یہ فرق ہے تم میں اور مجھ میں، یہ فرق ہوتا ہے ایک بھائی

اور ایک باپ میں۔“ وہ دو قدم اپنے باپ کے قریب آیا۔ اس کی آنکھوں کا لالہ اتنا ہنوز بھڑک رہا تھا۔ انگاروں میں بجھے لہجے کے ساتھ چبا چبا کر بولا۔

”مجھے اس کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرنی، آپ یہ بات یاد رکھو وہ۔۔۔ مر۔۔۔ چکی ہے۔ اس گھر کو، اس گھر کے لوگوں کو اور اس گھر میں موجود ہر ایک دل کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ یہاں نہیں ہے۔ وہ مر جائے گی تب بھی یہاں نہیں آئے گی۔“ وہ فیصلہ سنار ہاتھا۔ وہ ان کے ہوتے ہوئے فیصلہ سنار ہاتھا۔ جہانگیر کے دل پر ثقیل پڑی۔ کرب نے چہرے کی جھریاں واضح کر دیں۔

”نفرت کرو بیٹا، مگر اتنی نہیں کہ زندہ درگور کر دو۔“ ان کو خدشہ لاحق ہوا۔ ڈر غالب آیا۔ اگر کل کو انہیں کچھ ہو گیا تو نین کا کیا بنے گا؟ اگر وہ در پر آگئی تو اسے تو بری طرح ٹھکرا دیا جائے گا۔ دھتکار دیا جائے گا۔ روند دیا جائے گا۔ وہ ان کی پہلی پہلی اولاد تھی۔ ان کی محبوب بیوی سے ہوئی محبوب اولاد۔۔۔ وہ چاہ کر بھی اس سے نفرت نہیں کر پائے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اسے بھول نہیں پائے تھے۔ ان کے دل میں ہوک اٹھی تھی۔ بہت گہری ہوک۔

”وہ نفرت کے بھی قابل نہیں۔“

ان کی اسٹڈی میں انگارے بھر کر وہ خود وہاں سے چلا گیا تھا۔ جہانگیر بیٹھے ہوئے دل کے ساتھ صوفے پر بیٹھے رہ گئے۔ ان کا ماتھا عرق آلود ہو رہا تھا۔ ان کے دل میں درد ہو رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے فون اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ وہ باپ تھے۔ خود مختار با اختیار تھے۔ اچھے سے جانتے تھے انہیں کیا کرنا ہے۔ فوراً کرنا ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔

بہت۔ بہت زیادہ دیر۔۔۔



نشاء نے قیس سے اس کے جوتوں کی تصویر مانگی تھی جو اسے ایک دن کے وقفے کے بعد بھیجی گئی۔ وہ قیس کے بھیجے گئے جوتوں کی تصویر کو قاتل کے جوتوں سے میچ کر رہی تھی۔ وہ جوتے اگزیٹ وہی ڈیزائن اور وہی سائز کے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا سول بھی ویسا کا ویسا ہی تھا۔ نشاء ابھی اسی پر غور کر رہی تھی جب جاسمین وہاں آ گئیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہی کھڑی ہوئی تھیں۔

”تم نے شیزل کو اس کا پارسل دے دیا تھا۔“ اس نے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر یکدم نفی میں۔
 ”میں ایسا نہیں کر سکی کیونکہ وہ گھر پر نہیں تھیں۔“ جاسمین نے فون نکال کر آنے والی کال کا نمبر دیکھا پھر اسے کاٹ دیا۔

”چلو کوئی بات نہیں جب وہ آئے تو اسے یاد سے دے دینا اور ہاں۔“ انہوں نے نظریں دیوار گیر اسکرین پر دوڑائیں جہاں سیاہ چوٹے والا پاؤں اٹھا کر درخت کا ٹہنا کر اس کر رہا تھا۔
 ”اسے بند کر دو کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ قیس پھنس چکا ہے۔ بہت جلد اس کی ہینڈ رائٹنگ میچ کی جائے گی اور پھر اسے اریسٹ کر لیا جائے گا۔“ وہ جانے لگی تھیں جب نشاء نے انہیں پکار لیا۔ وہ مڑتے مڑتے سیدھی ہوئیں۔

”میم، قیس سر قاتل نہیں ہیں اگر وہ ہوتے تو کیوں یوں نشانیاں دیتے پھرتے۔ اور میم، ملائکہ سے بھی تو کوئی خاطر خواہ معلومات نہیں ملی ہیں۔ اسے جن بھی لوگوں کی آواز سنائی گئی وہ سب کو رد کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے قیس سر کی آواز کو بھی رد کیا ہے۔ یعنی قاتل قیس سر نہیں ہیں۔“ جاسمین مبہم سا مسکائیں۔

”بیٹا، حقیقت کیا ہے یہ جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ اور غلطیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں۔ قیس سے یہ ہوئی کہ اس نے خود کو سب کے سامنے عیاں رکھا۔ انسان کے کچھ پوشیدہ خول بھی

ہونے چاہیں جنہیں اپنی ذات کے علاوہ کوئی کھوج نہ سکے۔“ نشاء کے دل میں امید جاگی جس کی چمک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”یعنی آپ بھی مانتی ہیں قیس سر کو پھنسا یا جا رہا ہے۔“ جاسمین نے شانے اچکائے۔ یہ ان دونوں کی پہلی بہت لمبی بات تھی۔

”ابھی فوری طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، وہ سکی ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

جس سکی کے بارے میں وہ دونوں بات کر رہے تھے وہ اس وقت انگریزی لیتا ہوا کمرے کے پردوں کو جھٹکے سے ہٹا رہا تھا۔ لاہور میں جنوری کے آخری دنوں کی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ فریش فریش سا وہ اس نرم گرم سی دھوپ میں خود کو بھگوئے کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی سفید رنگ کی ٹی شرٹ بالکل سادی اور ہاف بازوؤں والی تھی۔ اس نے سوچا تھا اس پر وہ جیکٹ پہن لے گا مگر دھوپ کی وجہ سے اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سیاہ سادے رنگ میں کافی کے گھونٹ بھر رہا تھا جب اس کی نظروں کو ٹھٹھکنا پڑ گیا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے ہوٹل کا عقبی حصہ نظر آتا تھا جہاں دور دور تک گھاس کا خالی قطعہ تھا۔ اس قطعہ پر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے سورا رنگ کی فارمل شرٹ اور بلیک فارمل پینٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس کا بھورا کوٹ اس کے سوٹ کیس کے اوپر پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ گلابوں کا گلہستہ تھا اور وہ اسے اپنے عین سامنے کھڑی لڑکی کی طرف بڑھا رہا تھا۔ اس لڑکی نے خود کو بیگی رنگ کے وول کوٹ سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کے بال کھلے تھے اور وہ مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ رہی تھی۔ قیس کیلئے یہ منظر شدید ناگوار گزرا۔ وہ کافی کا مگ سائیڈ ٹیبل پر ٹنچ کر جا رحیت سے باہر کی اور بڑھا۔ لابی میں موجود ہر فرد آگ کی لپٹیں خود میں سے نکالے اس شخص کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کی گردن سے لے کر بازو تک کی رگیں کھینچ چکی تھیں۔ وہ جلد بازی میں

جوتے بدلنا بھول گیا تھا۔ کلاگز پاؤں میں اڑسائے وہ ہوٹل کے عقبی حصے میں آیا جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔

”میں یقین نہیں کر سکتی کہ تم میرے لیے یہاں تک آ گئے ہو، اوہ گاڈ احد تم بالکل پاگل ہو۔“ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سرخ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ وہ لڑکا محظوظ ہوتے ہوئے اپنی پینٹ کی جیب سے مخملی ڈبیہ نکال رہا تھا۔

”پاگل تو میں کب سے ہوں تمہارے پیچھے مگر تم ہی ہو جو نظر انداز کیے جا رہی ہو۔“ وہ بڑے بڑے ڈگ بھر کر یہاں آیا تھا اس لیے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ منظر بھی اس کا سانس پھلا دے گا۔

”خیر نظر انداز تو میں نہیں کرتی تمہیں، یہ مجھ پر بہتان ہے۔“ وہ دونوں ساتھ ہنس دیے۔ قیس کو وہ دونوں شدید برے لگے۔ اس کے نتھنے پھول پچکنا شروع ہوئے تھے۔

”چلو کسی بہانے سہی تم ہنسی تو ورنہ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا تھا کہ جانے کس سنگی کی صحبت میں رہ کر آئی ہو جو اتنی دل برداشتہ ہو، ایسے لوگوں سے دور رہا کرو۔“ شینزل نے پھولوں کو آنکھیں بند کر کے سونگھا۔ وہ اسی انداز میں اس کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

”ہمم، وہی کر رہی ہوں ٹا کسک لوگوں سے یوں بھی دور رہنا چاہیے۔“ اس نے آنکھیں کھولیں تو جگر جگر کرتی انگوٹھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ ایک بار پھر سے محظوظ ہوئی۔

”کب تک میرے لیے انگوٹھیاں خریدتے رہو گے۔“ وہ کھنکتی آواز سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ یہ منظر قیس کے ریٹینا پر نہیں بلکہ اس کے دل پر کھب رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکتا ہوا اسے دیکھتا رہا صبر کرتا رہا۔

”جب تک آپ جناب ان کی ویلیو سمجھ جائیں گے کہ کس قدر دل کی گہرائیوں سے انہیں

خریدا گیا ہے۔ تو بتاؤ شیزل قیس الہی کیا مجھے اجازت ہے۔“ قبل اس کے وہ اثبات میں سر ہلاتی وہاں سے تھوڑی سی دور دو بلیاں آپس میں لڑتی ہوئیں قیس کے عقب میں سے بھاگی تھیں۔ شور کی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا، ایک کا چہرہ سنجیدہ ہوا تھا اور ایک کا سفید، ایک کو برا لگا تھا اور ایک کو ڈر، ایک بد مزہ ہوا تھا تو دوسرا خوفزدہ، شیزل قیس کے تاثرات دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کا چہرہ، اس کے کان تک سرخ تھے۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ آنکھوں میں ہزاروں جذبات لیے یکدم مڑا تھا۔ شیزل بے ساختہ طور پر اس کے پیچھے لپکی۔

”کہاں جا رہی ہو۔“ احد نے اس کی کلائی تھام کر سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی، بکے ہاتھوں سے چھوڑتی اس انسان کے پیچھے دوڑی تھی جو اس کا سب کچھ تھا پھر بھی کچھ نہیں تھا۔ احد دلبرداشتہ سا اس کے ہاتھ سے چھوٹے پھولوں کو دیکھتا رہا جو بے مول سے زمین پر آن پڑے تھے۔ اسے دکھ ہوا تھا۔ بے تحاشہ دکھ۔

”قیس رکو، ایسے نہیں جاؤ میری بات سنو۔“ وہ دوڑتی ہوئی اس تک آئی۔ اس کا بازو تھام گئی بہت مضبوطی کے ساتھ ایسے کہ وہ وہیں کھڑا رہے۔ چھوڑ کر نہیں جائے۔ سمجھ جائے۔ مان جائے۔ خفا نہ ہو۔ غلط نہ سمجھے۔ برا نہ جانے۔ اس کی پکڑ میں مضبوطی تھی۔ خوف میں لپٹی مان بھری مضبوطی۔

”حد میں رہو اپنی۔“ وہ انگلی اٹھاتا اسے وارن کر رہا تھا۔ شیزل کو اس کی آواز کپکپاتی ہوئی لگی۔ اس کے دل کو بری طرح سے کچھ ہوا تھا۔ کھٹکا تھا اور بہت ظالم تھا۔ اس نے سو کھتے لبوں کو تر کیا۔

”قیس تم۔“ وہ یکدم اس پر دھاڑا۔ اس کی دھاڑ قابل دید تھی۔

”مر گیا قیس، نام مت لو میرا۔“ پھر اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کیں۔ ایک گہرا

سانس لینے کے بعد وہ نچلے ہونٹ پر زبان پھیر کر تحمل کا آخری سرا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا۔
 ”ہاتھ چھوڑو اور میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ شیزل کی آنکھوں کے کنارے نم ہوئے۔ اس
 کے دل کو بری طرح سے کچھ ہوا تھا۔ اس نے بازو نہیں چھوڑا۔ اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ قیس
 بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ احد سے یہ منظر برداشت نہیں ہوا۔ وہ ان دونوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔
 ”نہیں تم پہلے میری بات۔“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ وہ ہنر دق سی اس کی دھاڑ
 سن رہی تھی۔

”میں نے کہا چلی جاؤ۔“ اس نے شدت سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ اس کی
 آواز بہت اونچی اور بھاری تھی۔ اس کا جھٹکنا بہت زبردست تھا تبھی وہ لڑکھڑا گئی قبل اس کے
 وہ گرتی احد نے اسے بازوؤں سے تھام کر سنبھال لیا تھا۔ شیزل نے آنکھیں پھاڑ کر گردن موڑ
 کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں جھولی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں جو خون آشام
 نگاہوں سے قیس کو دیکھ رہا تھا۔ پھٹی آنکھوں نے احد کے چہرے سے نظر ہٹا کر پھر سے اس پر
 ڈالی جس کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھیں ابلی ہوئیں اور جبراً بھینچا ہوا۔

”اس کی اتنی ہمت۔“ وہ شیزل کو سنبھالنے کے بعد سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں قیس پر لپکا
 تھا۔ اس اچانک وار کیلئے قیس تیار نہیں تھا اس لیے زوردار پنچ نے اس کے ہونٹ کا کنارہ پھاڑ
 دیا تھا۔ وہ اس کے مکے کی شدت سے لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوا تھا۔ ہونٹ سن ہوا اور اس میں
 سے خون بھل بھل بہنے لگا۔ قیس نے حیرت سے اپنے ہونٹ کے کنارے پر دو انگلیاں رکھ کر
 آنکھوں کے سامنے کیس جو خون آلود تھیں۔ قبل اس کے وہ پھر سے کوئی لائحہ عمل اختیار کرتا احد
 اس کا گریبان پکڑ کر اسے درخت کے ساتھ لگا چکا تھا۔ وہ ایک اور مکا اسے جڑ رہا تھا۔ تیسرے
 پر قیس نے سنبھلتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے زمین بوس کرتے ہوئے اس کے شانے پر

گھٹنے کا بوجھ ڈال کر اسے مارنے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں سمجھم گتھا ہو چکے تھے۔ شینزل دور کھڑی حواس باختہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ وہاں پہنچ چکی تھی۔ شور کی آواز، گالیوں کی بوچھاڑ اور پولیس کے سائرن کی آواز، شینزل ان دونوں کو چھڑوانے کیلئے بھاگی تھی۔ جہاں قیس احد کو مار رہا تھا وہاں احد بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے بھی انہیں چھڑوانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کسی کے ہاتھ نہیں آرہے تھے۔ شینزل ان دونوں کے درمیان آئی۔ قیس کا اٹھتا مکا اس کے چہرے سے تھوڑے سے فاصلے پر آ کر رکا تھا۔ پولیس کے سائرن کی آواز قریب آ کر رک گئی تھی۔ اب فقط قدموں کی دھمک تھی جو ان کے قریب آ رہی تھی۔

”ہٹ جاؤ تم، میں نے کہا دور ہٹو۔“ وہ قیس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ پھولے سانس کے ساتھ متحیر سا وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ کم از کم ابھی اس سے اس چیز کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ وہ احد کی ڈھال تھی۔ وہ اس وقت فقط اس کی سائیڈ پر تھی۔ آنکھوں میں نمی اور چہرے پر اشتعال سجائے اس نے کس قدر بے رحمی سے اسے دھکا دے دیا تھا۔ احد سے دور کر دیا تھا۔ نفرت کا اظہار کر دیا تھا۔

”میں نے کہا چلے جاؤ۔“ وہ حلق میں خراشیں ڈال کر ایسے چیخی کہ قیس اپنی جگہ ساکت و صامت ہو گیا۔ بت بن گیا۔ وہ اس کی تھی مگر اس کے حق میں نہیں تھی۔ پوری دنیا کے سامنے وہ اس شخص کی اسپورٹر بن گئی تھی جو فقط اجنبی کے کچھ نہیں تھا۔ قیس نے دل کے ٹکڑوں کو سینے میں چبھتے ہوئے محسوس کیا، اس کا سانس ایک بار پھر سے تنگ ہوا تھا۔

”جانور ہو تم۔“ اس کے ہونٹ، ماتھے اور کان میں سے خون نکل رہا تھا۔ احد کا فقط ایک گال نیلا پڑا تھا اور بازو پر چند ایک کھروٹے تھیں۔ وہ گہرے گہرے سانس بھرتا شینزل کو اپنے

حق میں لڑتا دیکھ رہا تھا۔ آسودہ ہو رہا تھا۔ اس کی آسودگی نے قیس کی روح چھلنی کر دی۔ اس کا سب ختم کر دیا۔ پولیس وہاں آئی اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ جاتے جاتے قیس نے ایک انجان نظر اس لڑکی پر ڈالی تھی پھر وہ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی قیس کا وکیل وہاں پر موجود تھا۔ آن ڈیوٹی آفیسر کو وہ ساری ڈیٹیلز بتا چکا تھا تبھی جیسے ہی قیس نے اسٹیشن کے اندر قدم رکھا۔ وہ پولیس والا کھڑا ہو کر اس کا استقبال کر رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر اہلکار کو قیس کو چھوڑنے کو کہا تھا۔ قیس کے وکیل نے اسے ٹی شرٹ پیش کی تھی کیونکہ اس کی سفید ٹی شرٹ خون آلود ہو چکی تھی۔ اس نے وہ اولو (زیتون) رنگ کی ٹی شرٹ اس سے لی اور وہیں اسٹیشن میں بدل لی۔ وہ جب سفید ٹی شرٹ اتار کر اپنے وکیل کے اسٹنٹ کو تمہارہا تھا تب ہی شینزل تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں آئی تھی۔

”آپ جا سکتے ہیں سر، معذرت آپ کو زحمت ہوئی۔“ وہ ایک تلخ نظر شینزل پر ڈال کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے وکیل نے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ بینڈجج کروالے مگر وہ قیس ہی کیا جو کسی کی سن لے۔ ہوٹل کے کمرے میں آ کر اس نے اپنا سامان سمیٹا اور پہلی فرصت میں ہی وہاں سے چلا گیا کہ اس وقت اس کا چلا جانا ہی سب کے حق میں بہتر تھا۔

شینزل احد کو پولیس کسٹڈی سے چھڑوا کر واپس لے آئی تھی اور اب وہ اس کے سر پر کھڑی اس سے اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے جھگڑنے کی، دیکھا بھی ہے کتنی چوٹ پہنچائی ہے تم دونوں نے خود کو۔“ احد گال پر آئس بیگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے بازو سینے اور ٹانگوں میں درد ہو رہا تھا۔ قیس نے اسے گم مار ماری تھی تبھی وہ ظاہری طور پر تو ٹھیک تھا مگر اندر ورنی طور پر اسے کئی زخم آئے تھے۔

”وہ تم پر چیخ رہا تھا بدتمیزی کر رہا تھا۔“ شیزل کا ایک ہاتھ کمر پر تھا اور دوسرا ماتھے پر، وہ ماتھے والا ہاتھ ہٹا کر کہہ رہی تھی۔

”تو کرنے دیتے، چیخنے دیتے اسے۔“ احد کے کان کے پیچھے والی جگہ پر شدید ٹیس اٹھی۔
”اس نے تمہیں دھکا دیا تھا شیزل؟“ خفا سا تھیرا اس کے لفظوں میں گھلا تھا۔ شیزل کے اگلے جملے نے اسے مزید حیران کر دیا۔

”سوواٹ؟“

”سریسلی، وہ تمہیں دھکا دے۔ تمہیں زک پہنچائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟“ خفا کن سے انداز میں پوچھا گیا۔ حیرت کی انتہا تھی۔

”اس کی ایسی انٹینشن نہیں تھی۔ وہ غصے میں تھا۔ وہ جب غصے میں ہوتا ہے تو اسی طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔“ احد نے خود کو پرسکون کرنے کیلئے ضبط سے آنکھیں بند کیں۔ اب اسے غصہ آرہا تھا اور شدید آرہا تھا۔

”تو یعنی وہ غصے میں کچھ بھی کرے تو جائز ہے۔ وہ کون ہے شیزل؟“ اس نے باقاعدہ سر اٹھا کر اس سے سوال کیا۔ شیزل اپنی جگہ جم گئی۔

”وہ کوئی نہیں ہے۔“ اس نے خود کو کہتے سنا۔

”تو پھر؟“ وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔ اسی جھنجھلاہٹ میں بولی۔

”احد پتہ نہیں تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔“

”میں سب سمجھ رہا ہوں شیزل، آج جب تم میرے حق میں لڑی مجھے پولیس سے چھڑوا کر یہاں لائی تو مجھے بہت اچھا لگا تھا مگر اب جب تم دانستہ یا نادانستہ طور پر اس شخص کی حمایت کر رہی ہوں تو میں اس بات سے بالکل خوش نہیں ہو رہا ہوں۔ مجھے شدید قسم کا برا لگ رہا ہے۔“

سرد آواز، سرد سا انداز، شیزل ون سیٹر صوفے پر جا کر بیٹھی۔

”احد میں کسی کی حمایت نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو جنرل سی بات کر رہی ہو۔“ احد نے آکس بیگ ٹرے میں پٹخا۔

”یعنی تم چاہ رہی ہو میں یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں۔“ وہ پھر سے خفا ہو گیا تھا۔ شیزل نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ کھڑے کیے۔

”او کے فائن، ریلکسیس اس بات کو سائیڈ پر رکھ دیتے ہیں یہ بتاؤ آفس سے کتنی دن کی چھٹیاں لی ہیں تم نے۔“ احد نے واپس آکس بیگ اٹھایا اور پھر سے اپنے سو بے ہوئے نیلے گال پر رکھ لیا۔

”تین دن کی۔“

”سو پر، پھر تو تب تک تمہارا یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا، مجھے بتا دو جو تم نے کھانا ہے میں آرڈر کر دیتی ہوں۔“ احد نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں کچھ بھی نہیں، ابھی میں آرام کروں گا۔“ وہ دو سیکنڈ تک اسے جانچتے ہوئے دیکھتی رہی پھر، پھر سے دریافت کیا۔

”آر یو شیور؟“ احد نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”توبہ، تم مرد کتنے ہی شریف کیوں نہ ہو غصے میں پاگل ہو ہی جاتے ہو۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اٹھی اور اس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس خارج کیا تھا۔ حزن کی تہہ نے اس کے چہرے پر جگہ بنائی تھی۔ اس نے نظریں قیس اور اپنے فلور پر ڈالیں اور پھر تھکن سے گردن جھکالی۔

☆.....☆.....☆

سڈنی کا پٹرول پمپ اس سے گاڑیوں سے کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ وہ شانوں تک کٹے بالوں والی دوڑتی ہوئی ہر ایک کی کار کی طرف لپکتی، اس کا شیشہ صاف کرتی اور کچھ سکے تھام کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال دیتی۔ یہ کوئی دسویں کار تھی جسے وہ صاف کر رہی تھی جب اس پٹرول پمپ کے مالک نے اسے گیارویں کار کی جانب جانے سے روکا تھا۔

”ٹھہر جاؤ ہنی، کچھ دیر آرام کر لو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس بوڑھے شخص کو دیکھا جو کسی مسیحا کی طرح اسے ملا تھا۔ وہ ایک مصری تھا۔ انہتر سال کا ایک بوڑھا حبشی، جس کا تعلق ساؤتھ افریقہ سے تھا اور یہاں وہ روز معاش کیلئے آیا تھا۔ اس نے اسے تب سنبھالا دیا تھا جب وہ خود کی بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے تب اسے سہارا دیا تھا جب وہ پور پور مر چکی تھی۔ وہ اپنی اولاد کو اس دنیا میں لانے والی تھی اور وہ اس کیلئے بے حد خوش تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔“ یا مین اس کی بات پر مسکرایا۔ اپنا جھریوں زدہ سیاہ ہاتھ اس کے جوان سفید گال پر رکھ کر گویا ہوا۔

”میں جانتا ہوں بیٹا، تم بہادر ہو، تمہارے علاوہ اور ہو بھی کون سکتا ہے۔“ اس بوڑھے کی آنکھیں بہت بڑی بڑی اور پیلی تھیں۔ دانت اس کے بالکل صاف تھے لیکن ان کی رنگت بھی پیلی تھی۔ ناک باقی حبشیوں کی طرح کافی موٹی اور پھنی تھی اور ہونٹ بھرے بھرے۔ اس کے سر پر موجود گرے بال سیاہ جلد سے چپکے ہوئے تھے۔ قد میں وہ اس سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ جو بھی ان دونوں کو باپ بیٹی کی حیثیت سے دیکھتا تھا انگشت بنداں رہ جاتا تھا۔ پہلی فرصت میں سب کے دماغ میں دولت کا خیال آتا تھا کہ کیا پتہ اس لڑکی کی ماں نے دولت کی خاطر اس حبشی سے شادی کی ہو تبھی وہ لڑکی اپنے باپ سے اتنی مختلف ہے۔ بہت سے لوگ بہت سی زبانیں، بہت سی زبانیں بہت سے کہانیاں۔

”اگر آپ مجھے نہ ملتے تو میں بہادر نہ ہوتی، یہ اعزاز بھی آپ کی بدولت ہی ملا ہے مجھے۔“ وہ مشکور ہوئی اس بات سے بے خبر کہ ایک سیاہ کار کے ٹائر وہاں چر چرائے ہیں۔

”اوہ کم آن ہنی، تم دل خوش کر دیتی ہو۔“ وہ بوڑھا اس کے شانوں پر ہاتھ پھیلا گیا تھا۔ سیاہ کار میں بیٹھے شخص نے ہارن پر ہاتھ رکھا اور پھر نہیں ہٹایا۔ یامین اور اس لڑکی نے مڑ کر اس کا روالے کو دیکھا تھا جس کا شیشہ نیچے گرا تھا۔ وہ اس کا سائیڈ پوز دیکھ سکتے تھے۔ اس لڑکے کی آنکھوں پر سیاہ شیڈز لگے تھے اور سر جھکا تھا۔ نین اسے پھر سے یہاں دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ بدل گیا تھا بہت زیادہ بالکل اسی طرح جس طرح وہ بدل چکی تھی۔ کبھی اس کی ایک پکار پر والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکنے والی اب اسے دیکھ کر فقط سپاٹ چہرہ بنانے کے کچھ نہیں کر سکی تھی۔ اس کے دل میں اپنے بھائی کو لے کر اب کوئی محسوسات نہیں آئے تھے جس طرح اسے اپنی بہن کو دیکھ کر نہیں آتے تھے۔

”اونچے لوگ نیچی تمیز۔“ یہ یامین کا اس کے بھائی کیلئے تبصرہ تھا۔ نین نے جھک کر بالٹی اٹھائی اور چھوٹے چھوٹے قدم چلتی اس کی کار کی طرف آنے لگی۔ اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں تھی اسے لے کر بلکہ وہ یہاں سیٹھ صاحب کی موجودگی سے تکلیف سے دوچار ہو رہی تھی۔ اس نے پانی اس کے شیشے پر اچھالا۔ سیاہ جیکٹ میں لبوں کو آپس میں سختی سے پیوست کیے وہ نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ بھورے کوٹ میں قید وہ لڑکی جس کے بال قدرے گھنگھریالے تھے کار کے شیشے کو رگڑ رہی تھی۔ اسی دوران نا جانے کب کیوں اور کیسے جیری کو کچھ ہوا تھا۔ وہ جھٹکے سے کار سے نیچے اترا، اس کا ہاتھ تھام کر اسے کار میں پٹخا اور خود رائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے وہاں سے بھگا لے گیا۔ یامین جب واش روم سے باہر آیا تو نین وہاں نہیں تھی۔ پانی کی بالٹی تارکول کی سڑک پر گری تھی اور اس کا موپ زمین بوس تھا۔ وہ نین کا نام چلاتا ہوا سڑک پر اتر

آیا تھا۔ اس کے قدم کنٹرول روم کی جانب دوڑ رہے تھے جہاں وہ ویڈیو کلپ میں اسے کھوج سکتا تھا۔

”گاڑی روکو، کہاں لے کر جا رہے ہو مجھے تم۔“ یہ وہ سیٹھ صاحب نہیں تھا جو نرم دل اور خوش مزاج ہوا کرتا تھا۔ یہ کوئی شدت پسند تھا جو اس کے سامنے موجود تھا۔

”سیٹھ صاحب۔“ وہ یکدم دھاڑا تھا۔

”جیری نام ہے میرا، ڈونٹ کال می سیٹھ صاحب اوکے۔“ آنکھیں نکالتا ہوا وہ اسے وارن کر رہا تھا۔ نین ڈرگئی۔ وہ اپنے بھائی سے ڈر گئی۔ اس کی پتلی پتلی پتلی کلاسیوں پر انگلیوں کے نشان تانہوز چھپے تھے۔ غربت اس کے چہرے سے بری طرح ٹپک رہی تھی۔

”مجھے درد ہو رہا ہے پلیز اسپید آہستہ کرو۔“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نظروں کے ارتکاز کو توڑ کر وہ کار کو ایک سائیڈ پر لگا رہا تھا لگانے کے بعد زہرا گل رہا تھا۔

”اپنی اولاد اپنی جان کی تمہیں کتنی پرواہ ہے۔ تمہاری وجہ سے، صرف تمہاری وجہ سے میری اولاد اس دنیا سے گئی ہے۔ تم ایک نہیں کئی جانوں کی قاتل ہو، تم ایک نہیں کئی عزتوں کی خونی ہو۔ میں تم سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔ باز پرس کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں تھپڑ مارنا چاہتا ہوں۔ تمہیں شوٹ کرنا چاہتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں تم پر فاتحہ پڑھ چکا ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اس سے پہلے کہ میں کچھ برا کر دوں۔“ وہ سخت لہجے میں بول رہا تھا مگر اس کی تھوڑی کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اس کے وجود میں ارتعاش بھرا تھا۔ وہ لڑکی اپنے بوسیدہ بھورے کوٹ کو سنبھالتی نیچے اتری تھی قبل اس کے وہ دروازہ بند کرتی اس کا بھائی گاڑی زن سے اڑا لے گیا۔ وہ اس سے ڈر گئی تھی اور اس چیز کیلئے وہ خود کو بلیم کر رہی تھی۔ اسے لوگوں سے ڈر لگتا تھا۔ ہجوم سے خوف آتا تھا۔ وہ کسی کے چہرے کو نہیں دیکھتی تھی

بس نظریں جھکائے اپنا کام کرتی تھی اور مسکرا کر پیسے لیتی تھی۔ وہ اپنا خوف دنیا کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ دنیا کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ ہیومن فوبیا کا شکار ہو رہی ہے کیونکہ وہ خود کو مضبوط کرنا چاہتی تھی اور وہ کر رہی ہے۔ اسے خود کیلئے اسٹینڈ لینا تھا وہ لے رہی ہے۔ اسے ماضی میں نہیں جھانکنا تھا وہ ایسا کرنا کب کا بند کر چکی ہے۔ وہ جب وہاں پہنچی تو یامین کے ساتھ پولیس کھڑی تھی۔ وہ نین کو دیکھ کر والہانہ پن سے اس کی جانب لپکا۔

”تم ٹھیک ہو، کہاں چلی گئی تھی اور کون تھا وہ شخص جو تمہیں کار میں بٹھا کر لے کر گیا تھا۔“

اس نے گیلی نظروں سے یامین کو دیکھا پھر گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے وہ جھوٹ بولا جو وہ پورے رستے سوچتی آئی تھی۔

”میری طبیعت خراب ہو رہی تھی، میں نے اس سے مدد مانگی تھی اس نے دے دی، یہ قریب ہی کلینک پر گئی تھی۔“ اس نے یامین اور پولیس کو ایک ہی بیان دیا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بات یامین محسوس کر گیا لیکن اس نے کرید نہیں۔ وہ اسے اسپیس دینے کی خاطر پھر سے اپنے کام میں مگن ہو گیا تھا۔ نین اس رات سو نہیں سکی تھی۔ اس رات اسے پھر سے اپنے ماضی سے کراہیت آنے لگی تھی۔



اس نے گہرا سانس بھر کر بیل پر ہاتھ رکھا۔ دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور اگلے ہی سیکنڈ اس کے منہ پر زوردار انداز میں بند کر دیا گیا۔ شیزل کو سبکی کا احساس ہوا تھا مگر اس نے درگزر کر کے ایک بار پھر سے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس بار دروازہ نہیں کھولا گیا۔ اس نے ناب گھمائی۔ پہلے وہ ڈور لاکڈ تھا مگر اس بار نہیں تھا یعنی اس کیلئے ہی کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔ دول کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکایا پھر اپنی سفید پلیٹڈ اسکرٹ پر ہاتھ پھیر کر اندر آ گئی۔ وہ

سامنے ہی سنجیدہ چہرے کے ساتھ کتاب کی ورق گردانی میں مشغول نظر آیا۔ اس کی آنکھوں پر بغیر فریم والے نظر کے گلاسز لگے تھے۔ شیزل کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کی نگاہ کمزور ہو گئی ہے۔ وہ اپنے سیاہ چنٹ والے جرسی بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شیزل نے اپنے پریٹڈ سلک کے اسکارف کو مٹھی میں جکڑا جکڑنے کے بعد وہ اس کے ہونٹ کے کنارے، کان اور ماتھے پر لگے کٹس کو دیکھ رہی تھی جو سرخ اور قدرے سو جے ہوئے تھے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا موصوف نے فقط خون روکنے پر کام کیا ہے بینڈیج کی زحمت نہیں کی۔ اس نے لب کاٹتے ہوئے کچھ جھکتے ہوئے سوال کیا، بے حد بچکانہ سوال۔

”تمہیں۔“ وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔ ”درد ہو رہا ہے۔“ جواب ندارد، اس نے گہرا سانس بھرا کچھ لمحہ جواب کا انتظار کیا۔ جواب تو نہیں آیا ہاں اس نے کتاب کا صفحہ ضرور پلٹا تھا جس کا رخ اس سے دوسری جانب تھا۔ اب یہ رخ اس نے جان بوجھ کر موڑا تھا یا وہ واقعی لفظوں کو منہمک انداز میں پڑھ رہا تھا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔ شیزل اپنی جگہ سے اٹھی، قیس نے اسے دیکھنے سے گریز کیا۔ وہ لب بستہ سا کتاب پڑھنے کا ڈرامہ کر رہا تھا حقیقت میں تو صفحہ پر نگاہ جمائے اسی پردھیان رکھے ہوئے تھا۔ اس نے دیکھا وہ گھر کے ایک حصے میں غائب ہوئی ہے کچھ دیر بعد وہ جب واپس آ رہی تھی تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ قیس کے قریب بیٹھ کر اپنے دائیں جانب اس نے باکس رکھا رکھنے کے بعد ایک نگاہ بے نیاز سے قیس پر ڈالی پھر کاٹن نکال کر اسے اسپرٹ سے بھگونے لگی۔ وہ روئی کے اس گیلے ٹکڑے کو اس کی کان کی لو کے پاس لے کر جا ہی رہی تھی جب قیس نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اتنی بری طرح کے وہ روئی دونوں کے قدموں کے پاس جا گری۔

”دور رہو۔“ وہ اسے وارن کر رہا تھا۔ شیزل نے دانت پیتے ہوئے اس کے صوفے پر رکھے ہاتھ پر تھپڑ مارنے والے انداز میں اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ قیس اس کی اس حرکت پر عیش عیش کراٹھا۔

”نہیں رہوں گی پھر؟ کرنا ہے جو کر لو، آئے بڑے۔“ وہ سیر تھا تو وہ بھی سوا سیر تھی۔ قیس نے اپنے جبرے کو سختی سے بھینچا۔

”یونواٹ، تم بالکل ٹھیک ہو کیونکہ تم ڈھیٹ ہو۔“

”ہاں ہوں اور بلا کی ہوں بالکل تمہاری طرح۔“ وہ ترکی بہ ترکی اسے جواب دے رہی تھی۔ ”اب چپ چاپ شرافت سے بینڈ تاج کروالو اور زیادہ نخرے نہیں کرو۔“ ماحول کو بد لنے کی خاطر وہ خود کو بدلتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ اندر سے وہ تھوڑی سی تو گھبرائی ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی جو وہ کر چکی ہے وہ سراسر غلط تھا۔

”تم اپنے منگیترو کو جا کر بینڈ تاج کرو اسے اس چیز کی زیادہ ضرورت ہے۔“ وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ شیزل کے دل پر یہ بات لگی۔ بات دل کی تھی دل پر ہی لگنی تھی۔

”قیس پلیز۔“ وہ نخوت سے سر جھٹک کر کھڑا ہوا، مین ڈور کی طرف گیا۔ اس کا دروازہ پورا کھول کر خود ایک سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔

”آپ جاسکتی ہیں مادام کیونکہ اب سے آپ آزاد ہیں۔“ وہ جانتی تھی اسے برا لگے گا۔ وہ جانتی تھی اس کا رد عمل شدید ہوگا۔ وہ سب جانتی تھی ہر لمحہ ہر برے رویے کیلئے تیار تھی مگر جانے کیوں پھر بھی اسے شدید ہتک کا احساس ہوا تھا اسے شدید ناگوار گزارا تھا۔

”قیس تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔“ اس نے مدھم مدھم آواز کے ساتھ کہا تھا۔ قیس نے تلخ مسکان لبوں پر سجائی۔

”عزت ہے تمہاری، چلو سوچ لو یہ آخری بار ہے کہانا اب سے تم آزاد ہو۔“ وہ دوسری بار

یہ بات کر رہا تھا۔ وہ دوسری بار اس کے دل کو دھڑکا دے رہا تھا۔

”حد میں رہو اپنی۔“ اس کے کان گرم ہو گئے تھے اور آنکھیں نم۔

”حد میں ہی رہ کر بات کر رہا ہوں۔ میں آج سے شینزل قیس الہیٰ کو بھول رہا ہوں۔ چاہو تو بخوشی سر نیم چینیج کروا سکتی ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس کے الفاظ، وہ خفا خفا سے انجان سے بیگانگی میں ڈوبے الفاظ، وہ دل چیر فیصلہ، وہ لائق کا اظہار۔ شینزل کا سانس رکنے لگا۔ خوف عود کر آیا۔

”کیا مطلب ہے اس بات کا؟“ بدترین خدشات تھے جو اس کے دماغ میں ابھر رہے تھے۔ شینزل کو لگا اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو چکے ہیں۔ وہ اب کھڑی نہیں ہو پائے گی کبھی بھی نہیں۔

”وہی جو تم سن چکی ہو، میں تمہیں اب چھوڑ رہا ہوں۔ تم اپنی زندگی کی اب خود مختار ہو جس سے چاہے شادی کرو جو چاہے کرو، میں اب تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا نہ ہی اس شہر میں تمہیں ملوں گا کیونکہ میں جان چکا ہوں قیس الہیٰ کی شینزل کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے کوئی عزت نہیں، تم نے اس احد کو بھرے بازار میں مجھ پر فوقیت دی۔ تم پولیس اسٹیشن تک اس کے پیچھے آئی۔ ٹھیک ہے تمہیں وہ مبارک ہو۔“ وہ اس کے لفظوں سے اس کے لہجے سے گھائل نہیں ہوئی تھی وہ تو بلکہ اس بات پر بلبلا اٹھی تھی کہ، کہ وہ اسے چھوڑ رہا ہے۔ اسے بالکل تنہا کر رہا ہے۔ اس کے بغیر وہ کیا کرے گی، کون ہوگا جو ہر مصیبت میں بوتل میں قید جن کی طرح اسے اس مصیبت سے نکالنے کیلئے حاضر ہوگا۔ کون ہوگا جو اس کی پردہ، در پردہ حفاظت کیا کرے گا۔ کون ہوگا جس سے وہ لڑا کرے گی، نفرت کا اظہار کرے گی اور پھر اسی کی راہ تکے گی۔ وہ تسلی، وہ دلاسا کہ ہاں اس دنیا میں اس کا بھی کوئی ہے۔ وہ ختم ہو جائے گا۔ مٹ جائے گا۔ اسے لگا وہ ابھی ختم ہو رہی ہے۔ وہ ابھی مٹ رہی ہے۔

”احد؟“ دل نے کہا خبردار بالکل بھی نہیں، احد کبھی بھی قیس نہیں ہو سکتا بالکل بھی نہیں۔

”تم مذاق کر رہے ہو، ہے نا۔“ وہ دروازہ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ بند کر کے اندر آیا۔“ کہہ دو کہ تم۔۔۔۔ مجھے تنگ کر رہے ہو۔“ وہ اس کے سامنے آیا اسے بازو سے تھام کر لاونچ میں لگے شیشے کی جانب لے گیا۔ شیشے میں دونوں کا عکس واضح تھا۔ وہ اس کے عقب میں اس کا بازو تھامے کھڑا ہو گیا۔

”دیکھو غور سے میرے چہرے کو دیکھو یہ جو زخم ہیں نایہ تمہارے منگیتر نامدار کی دین ہیں اور اس وقت جب وہ مجھے مار رہا تھا تب تم نے میرے یہاں۔“ اس نے اپنے سینے پر انگلی بجائی۔“ یہاں ہاتھ رکھ کر دکھا دیا تھا۔ تم اس کے سامنے ڈھال کی طرح کھڑی تھی۔ تم اسے سپورٹ کر رہی تھی۔ تم پولیس اسٹیشن اس کے پیچھے آئی۔ تم نے اسے مجھ پر برتری دی اور اس بات نے میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹا دی ہے۔ مجھ پر واضح کر دیا ہے کہ میں تمہاری نظروں میں کون ہوں، میری وقعت کیا ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا بلکہ تم رکو میں ابھی سائن کر دیتا ہوں پیپرز پر یوں آج ہی تمہاری اس ٹاکسک انسان سے جان چھوٹ جائے گی اور تمہیں دور رہنے کے جتن بھی نہیں کرنے پڑیں گے اور ویسے بھی تمہاری اولاد کا قاتل ہوں، تمہاری تو خواہش ہوگی مجھ سے جلد از جلد چھٹکارہ پانے کی۔“

وہ جب بولتا تھا تو رکتا نہیں تھا۔ دل کا ٹٹا تھا یا دل رکھتا تھا۔ آج وہ اس کا دل نہیں کاٹ رہا تھا بلکہ اس کی روح کے چیتھڑے چیتھڑے کر رہا تھا۔ اس نے اسے اپنے کمرے میں جاتے اور عدالتی کاغذ کیساتھ واپس آتے دیکھا تھا۔

”تم نے بہت عرصہ پہلے بالکل صحیح کہا تھا کچھ رشتوں کا گریس فل انداز میں الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔“ اس نے بال پوائنٹ کے سرے پر انگوٹھے کا دباؤ ڈالا نب باہر نکل آئی تھی۔

”بس میں ہی ضدی تھا۔ اڑا رہا کیونکہ شاید مجھے کہیں نہ کہیں یہ گمان تھا کہ ہم دونوں کے بیچ سب ٹھیک ہو جائے گا، ہم دونوں پھر سے ایک ساتھ خوش رہیں گے۔“ اس نے کاغذ کو شیشے کی میز پر رکھا۔ ”مگر میں غلط تھا، کچھ لوگ واقعی ہمارے لیے نہیں ہوتے، کچھ رشتے واقعی پائیدار نہیں ہوتے، کل تک مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میں ہی تمہارے لیے سب کچھ ہوں کل کے بعد مجھے ادراک ہوا میں تو بس ایک زبردستی کا طوق ہوں جو تمہارے گلے پڑا ہوا ہے۔“ وہ جھکا، سیدھا ہاتھ کاغذ پر جمایا اور پن کی نب کو سائن والی جگہ پر۔ وہ لیفٹ ہینڈ تھا۔ اس کی انگلیوں میں دبا پن بس صفحے پر گھسٹنے ہی والا تھا۔ سب بس ختم ہونے ہی والا تھا۔

”اس لیے بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ لیا ہے۔ خود کا محاسبہ کیا ہے۔ میں واقعی ٹاکسک ہوں، میں واقعی۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا قبل اس کے وہ ہاتھوں کو جنبش دیتا نظریں جھکا تا شیزل کھڑے قد سے نیچے گری تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں کے شیشے میں شیزل گرتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کھڑے قد سے زمین بوس ہوئی تھی۔ لمحہ لگا تھا اسے گرنے میں۔ فقط ایک لمحہ۔۔۔ پہلے پہل تو اسے کچھ سمجھ نہیں آئی پھر جیسے ہی دماغ نے کام کیا وہ پن پھینکتا دیوانہ وار اس کی طرف لپکا تھا۔ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر وہ اس کا سر گود میں رکھ کر اس کا گال تپتپہارہا تھا۔

”شیزل، شیزل آنکھیں کھولو، کیا ہوا ہے تمہیں۔“ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا وہ ٹھنڈا تھا۔ اس نے اس کی گردن پر انگلیاں رکھیں وہ بھی ٹھنڈی تھیں۔ وہ برق رفتاری سے اس کے ہاتھ اٹھا کر رگڑ رہا تھا۔ اس کی ہتھیلیوں کو گرمائش پہنچا رہا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس نے نبض چیک کی پھر فوراً اسے اٹھا کر کمرے میں لے آیا۔ اس پر کمبل ڈال کر اس نے جلدی اسٹیٹھو اسکوپ اٹھا کر اس کے دل کی دھڑکن چیک کی تھی جو بہت زیادہ تیز تھی۔ اس نے

بی بی چیک کیا وہ بھی ہائی تھا۔ اس نے جلدی سے دراز میں سے ایک شیشی برآمد کی، انجیکشن اٹھا کر وہ مائع اس میں بھرا اور اس کے بازو پر لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے دو گولیاں اٹھائیں انہیں عجلت میں پیسا، اس کا سفوف پانی میں ملانے کے بعد وہ اس کے سر ہانے آ کر بیٹھا۔ اس کی گردن کے پیچھے ہاتھ ڈال کر تھوڑا سا اسے اٹھایا اور چھوٹا سا شیشے کا کنٹینر اس کے لبوں سے لگا دیا۔ قطرہ قطرہ پانی اس کے حلق میں انڈیلنے کے بعد اس نے یونہی بیٹھے بیٹھے اس کنٹینر کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کے بعد احتیاط سے اس کا سرواپس تکیے پر رکھ دیا اور خود سنگل سیٹر صوفہ گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے پاس لے کر آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا۔ شیزل کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اسے بھینچے ان پر تھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کا دایاں پاؤں برق رفتاری سے ہل رہا تھا۔ اور وہ ساتھ ساتھ گھڑی میں وقت بھی دیکھے جارہا تھا ٹھیک دس منٹ بعد اس نے پھر سے دل کی دھڑکن چیک کی جو معمول پر آ چکی تھی اور بی بی بھی نارمل ہو گیا تھا۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ پھر واپس اپنی کمر صوفے کی پشت سے نکالی۔ دو منٹ کے وقفے کے بعد وہ سیدھا ہو کر اس کے ماتھے کو چھو رہا تھا۔ ٹھنڈے پن میں کچھ کمی آئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے خرد سے بیگانی لڑکی کو تکیے جارہا تھا جب اس کے گھر کی ڈور بیل بجی تھی پھر اس نے قدموں کی آواز سنی۔ وہ جانتا تھا آنے والا کون ہے۔ بہت آرام کے ساتھ شیزل کا ہاتھ چھوڑ کر اس پر کھبل درست کر کے وہ باہر آیا تو دیکھا ہما کچن کاؤنٹر پر کچھ سامان رکھ رہی ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھسکی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ سوال بے ساختہ تھا تو جواب برجستہ۔

”قیس تم روئے ہو، ہے نا؟“ وہ حیرت سے دریافت کر رہی تھی۔ اس نے تجاہل عارفانہ

سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

”ہرگز نہیں۔“ پر زور تردید۔

”مجھ سے چھپا رہے ہو؟“ خشکی سے انداز۔

”پتہ نہیں کیسی فضول سی باتیں کر رہی ہو تم، میں صرف پریشان ہوں اور بس۔“ اس نے

ٹوکری میں رکھے فروٹس کو ٹٹولا جو ہما اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ سیلڈ چیریز کے باکس کو اٹھا کر

ایک سائیڈ پر لے گیا، پلیٹ اٹھائی اور اس پر سے ریپراتا ردیا۔

”کس طرح کی پریشانی ہے تمہیں، کم آن قیس میں تمہاری بیوی ہوں مجھے حق ہے تم سے

سوال جواب کرنے کا۔“ وہ اس کی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ جب

سے یہاں آیا تھا بدل گیا تھا اور یہی بات ہما کو کھٹک رہی تھی۔

”ہما پرسنل اسپیس بھی کسی چیز کا نام ہوتا ہے۔ ہم میں بھلے ہی کوئی رشتہ ہو مگر اس کا یہ

مطلب نہیں ہے میں تمہیں اپنے ہر سیاہ سفید سے آگاہ کرتا رہوں، میں نے پہلے ایسا کیا تھا اور

نہ اب کروں گا۔“

وہ جان گئی اس کا موڈ سخت خراب ہے۔ وہ جان گئی کہ ابھی اس کے ساتھ بحث کرنا یا اسے

کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔ اس لیے درگزر کیا کہ رشتوں کو بچانے کیلئے انہیں چلانے کیلئے درگزر

بہت ضروری ہوتا ہے اتنا ضروری جتنا جینے کیلئے سانس۔

”اچھا ٹھیک ہے یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے، میں نے سوچا ہے تمہارے لیے آج سوٹی بناتی ہوں

اور گھر کی تھوڑی صفائی بھی کر دوں گی، کیا خیال ہے۔“

اس نے ساری چیریز پلیٹ میں منتقل کیں پھر سنک پر لے جا کر ٹوکری میں رکھ دیں۔ وہ

ٹل چلانے کے دوران کہہ رہا تھا۔ ”ہما۔“ شفاف پانی پہلے سے دھلی چیریز کو مزید صاف کر رہا

تھا۔ اس نے ٹل بند کیا اور مڑا۔ ”گھر بالکل صاف ہے اور آج میرا کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے گھر میں اور نہ ہی باہر، میں تھک چکا ہوں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ آج انجان تھا بالکل کسی اجنبی شخص کی طرح ہمارے چہرے پر پیلا ہٹ پھیلی۔

”کچھ۔۔۔ ہوا ہے کیا۔“

قیس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں، نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، تمہیں دروازے تک چھوڑ آؤں۔“ ہمارے آنکھوں میں نمی چھلکی۔

”میں چلی جاؤں گی۔“ اس کی آواز بھی قدرے بھاری لگی تھی۔ قیس شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا۔ وہ بیگ کی اسٹریپ کو کندھے پر جگہ دے رہی تھی جب وہ اس کے قریب آیا، ہمارے مڑ کر دیکھا۔ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں میرا رویہ تمہاری طرف ہارش ہو رہا ہے مگر ٹرسٹ می ہمارے میں واقعی بہت پریشان ہوں۔ تم بار بار کہتی ہونا کہ تم میری بیوی ہو۔“ وہ پہلی بار ہلکا سا مسکائی، ہم آنکھوں بھری مسکان۔ ”تو پھر یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم مجھے سمجھو، مجھے تھوڑی اسپیس دو، وقت دو تا کہ میری الجھن دور ہو، ہم سب میں سب فکس ہو جائے اور۔“ وہ رک گیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا پر کہہ نہیں پارہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو پھیلا کر اسے چلنے کا اشارہ دیا۔

”آفٹریو۔“ وہ اس کے رک جانے پر خود بھی کچھ دیر تھمی پھر سر ہلاتی مڑ گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم چلتی گھر کے باہر تک آئی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس سے پیچھے مگر اس کے تھوڑا سا برابر۔

”میں کل آؤں گا تمہارے پاس، تم مجھے سوشی کے علاوہ کچھ بھی بنا کر دینا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی گاڑی میں بیٹھ گئی قبل اس کے وہ گاڑی اسٹارٹ کرتی قیس نے جھک کر شیشے پر

انگلیاں بجائیں۔ ہمارے شیشے کو فولڈ کر دیا۔

”ناراض تو نہیں ہونا مجھ سے۔“ وہ جو واقعی میں خفا تھی ایک دم سے اس کے پوچھنے پر راضی ہو گئی۔ دل میں ایک کوئیل کھلی اور مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا گئی۔

”اپنا خیال رکھنا، یونویو آرویری اسپیشل ٹومی۔“ اس کے بالوں کو ہلکا سے بکھیرنے کے بعد وہ اس کے سر کو دو تین بار تھپک کر پیچھے کو ہوا۔

”میں جانتی ہوں۔“

قیس مسکرا کر ہلکا سا سائیڈ پر ہوا۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ وہ اس کی کار کے ساتھ ساتھ باہر آیا۔ وہ جب تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی وہ کھڑا رہا تھا۔ اس کے غائب ہوتے ہی قیس کے شانے ڈھلک گئے اور مسکراہٹ گم ہو گئی۔ وہ اندر آیا تھا۔ شینزل بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اب اس نے رات کو ہی اٹھنا ہے۔ اس نے دھلی ہوئی چیریز کو دیکھا جن پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح جمے تھے۔ یہ اس نے شینزل کیلئے دھوئی تھیں۔ چیریز سے نظریں ہٹا کر وہ سگریٹ سلگا گیا تھا۔ اب شام تک اس نے یہی کرنا تھا سگریٹ سلگانی تھی اور خود کو جلانا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج آسمان سرخ تھا جیسے وہ نوحہ کر رہا ہو، آج دل تنگ تھا جیسے وہ کر لارہا ہو۔ آج ہوا بند تھی، سانس تنگ تھی۔ چرند پرند سب پریشان تھے۔ حواس باختہ تھے۔ آج کچھ ہونے والا تھا کچھ بہت عجیب، وہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ جو بالکل غلط تھا۔ بورڈ میٹنگ میں موجود افراد زور شور سے واویلا کر رہے تھے۔ حیدر کے سامنے ثبوت تھے۔ ویڈیو ریکارڈنگ سے لے کر ہینڈ رائٹنگ تک ان کے پاس تھی جو فقط قیس الہی کے کسی کی نہیں تھی۔ وہ بزنس مین جس کا بیٹا

بڑی بے دردی کے ساتھ مارا گیا تھا آج آپ سے باہر تھا۔ اسے ہر صورت مجرم سلاخوں کے پیچھے چاہیے تھا۔ وہ ہر حال میں اس جو شیلے لڑکے کو عمر قید کروانا چاہتے تھے جس پر انہوں نے کبھی یقین کیا تھا۔ کہانی دو ہفتوں کی تھی۔ آج دو ہفتے مکمل ہو چکے تھے اور پھر بھی قاتل سرعام گھوم رہا تھا۔ انہوں نے اپنا مدعا ممبرز کے سامنے رکھا۔

”وہ میرا بیٹا تھا، میری اولاد میں کیسے اس کے قاتل کو بخش سکتا ہوں۔ مجھے اسے سلاخوں کے پیچھے دیکھنا ہے اور بس۔“ خالد نسیم کی حمایت مجسٹریٹ عبدالرزاق نے بھی کی تھی۔

”بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ہمیں مجبوراً میڈیا کا ساتھ لینا پڑے گا، اب بہت ہو گیا ہم نے بہت صبر کر لیا جو کرنا ہے قانون کو جلد کرنا ہوگا ورنہ میڈیا عقل ٹھکانے کرنا جانتی ہے۔“ حیدر نے ان کی دھمکی پر ماتھے کو مسلا۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے مگر وہ تھے کہ مان کے ہی نہیں دے رہے تھے۔

”اس نے میرے بیٹے کے بدن پر چھریاں چلائی تھیں۔ اس نے انجیکشن لگا کر اسے ہارٹ اٹیک دلوایا اور پھر اسے پیرالائز کر دیا، میرا بیٹا جی رہا تھا اور اس نے اسے جیتے جی مار دیا۔ میں اس کی عبرت ناک سزا چاہ رہا ہوں۔“ حیدر نے ایک بے بسی بھری نظر ان چاروں پر ڈالی پھر گلا کھٹکھارتے ہوئے بولے۔

”دیکھیں ہم اس کی گرفتاری کا نوٹس دے دیں گے۔ وہ آج کل میں پکڑا جائے گا لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا۔ وہ زیادہ عرصے تک جیل میں نہیں رہ سکے گا۔ آپ چاروں کو آپ کے بیٹوں کی جان کے بدلے اس کا باپ رقم دینے پر تیار ہے۔ آپ کیس واپس لے لیں اور میڈیا تک نہ جائیں آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔“ مجسٹریٹ عبدالرزاق تو اس بات پر بھڑک اٹھے تھے۔ منہ سے کف نکالتے ہوئے بولے۔

”اوائے حیدر، تو کس قسم کا بندہ ہے اوائے، میں نے تو سوچا تھا تو میرا دوست ہے۔ میری مدد کرے گا مگر تو اس لڑکے کی وکالت کر رہا ہے۔ ہے کون وہ اور اس کا باپ، اوقات کیا ہے ان دونوں کی۔“ حیدر دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹیک چھوڑ گئے۔ ٹھنڈے لہجے میں گویا ہوئے۔

”اس کا باپ اس ملک کا وزیراعظم ہے اور وہ اگلا وزیراعظم ہوگا۔ یہ اوقات ہے اس کی اور اس کے باپ کی۔“ خالد نسیم ٹھٹھکے تھے۔

”کس کے بارے میں بات کر رہے ہو تم۔“ ان سب کا ماتھا صحیح ٹھنکا تھا جواب جو آیا وہ عین توقع کے مطابق تھا۔

”سید جہانگیر الہی بخاری کی اور ان کے بیٹے سیٹھ صاحب قیس الہی کی، ہاں ٹھیک سنا تم نے کرائم ونگ سے تعلق رکھنے والا انسان اس ملک کا نیا وزیراعظم نامزد ہے۔ تم چاروں نے اس کی معمولی جاب اور سادگی دیکھی ہے۔ تم نے اس کی تمکنت اور اسٹیٹس پر غور نہیں کیا جو وہ چھپائے پھرتا ہے۔ کرتے تو یوں مچل نہ رہے ہوتے۔“ سب کو ایک منٹ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب ہی جہانگیر الہی سے واقف تھے۔ سب غائبانہ طور پر سیٹھ صاحب کو جانتے تھے مگر کوئی بھی قیس الہی سے واقف نہیں تھا اور اس میں بھی قیس کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ خود کو عام رکھتا تھا اور اسی میں پرسکون تھا۔ سیاسی پروٹوکول اسے کبھی پسند نہیں تھی۔ اپنی زندگی کا ایک عرصہ اس نے ابروڈ میں گزارا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی پاکستان میں پایا جاتا تھا۔ یہ تو دل تھا جس نے اسے یہاں رکھنے پر مجبور کر دیا ورنہ اب تک وہ کئی بار پاکستان کو چھوڑ چکا ہوتا۔

”جو بھی ہو، اس نے قتل کیے ہیں، اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔“ یہ بیورو کریٹ تھا جو کہہ رہا تھا۔ سیاسی مفاد ہر کوئی لینا چاہتا تھا۔ اس نے بھی اس سخت ترین حالات میں لیا تھا مگر اپنی ذہانت کے ذریعے۔“ مگر میں ایک کام کرنے کو تیار ہوں، سیٹھ صاحب کا نام میڈیا میں نہیں

جائے گا مگر اس کیلئے جہانگیر الہی کو ہم سے ملاقات کرنی ہوگی۔“ سب کے منہ سل چکے تھے کیونکہ سب جانتے تھے جلد یا بدیر ان کے پیٹ بھرنے والے ہیں۔ بھلے قیس قاتل ہو یا نہ ہو ایک وزیر اعظم کی عزت پر آئی بات کو سمیٹنا ان کے کارندوں کا اور ان کا وطرہ ہوتا ہے اور اس کیلئے وہ پیسوں پر نظر ثانی نہیں کرتے، نوازتے ہیں اتنا کہ آدھی عمر آرام سے بیٹھ کر کھا سکیں۔ ان چاروں کے دماغ میں اس وقت یہی چل رہا تھا۔ وہ آدھی عمر بیٹھ کر کھانا چاہتے تھے۔

جہانگیر مینشن کی بلند و بالا عمارت رعونت کے ساتھ سراٹھائے کھڑی تھی۔ اس رعونت کے خول میں اداسی چھپی تھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ حالیہ دن سے چار دن بعد جہانگیر الہی کی اسٹڈی میں کچھ لوگ جمع تھے۔ ظاہری بات ہے یہ لوگ وہی تھے جن کے بیٹوں کی جانیں گئی تھیں۔ وہ چار ٹوٹے ہوئے باپ تھے جو ایک بکھرے ہوئے باپ کے سامنے بیٹھے تھے۔ جہانگیر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے صوفے پر براجمان تھے۔ ان سب کے آگے میز لوازمات سے سجی تھی۔ وہ سب یہاں نت نئی ڈشز سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر دل تھا کہ مان کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب یہاں اپنے بیٹوں کی جانوں کا حساب مانگنے آئے تھے۔ جہانگیر نے باری باری سب کو دیکھا پھر اپنے لب ہلائے۔

”سیٹھ صاحب میرے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ضدی اور سرکش ہیں۔ جذباتی اور خود سر بھی ہیں لیکن میں ایک بات بلا جھجک بلا تصدیق کے کہہ سکتا ہوں کہ وہ قاتل نہیں ہیں۔ وہ۔۔۔ کسی کو نہیں مار سکتے۔“ ان چاروں نے خاموشی سے جہانگیر کو سنا اور تحمل سے ہی جواب دیا۔ یہ براہ راست ان کی پہلی میٹنگ تھی ورنہ تو اب تک ٹی وی میں ہی دیکھا تھا انہیں۔

”آپ کی بات بجا ہو سکتی ہے مگر ثبوت ان کے خلاف ہی ہیں۔“ جہانگیر نے مسکرا کر خالد نسیم کی بات درمیان میں قطع کی۔

”کیمرہ ہے، اپنی مرضی سے کچھ بھی دکھا سکتا ہے اگر ابھی آپ لوگوں کی میرے ساتھ ملاقات ریکارڈ ہو جائے تو اسے کتنے رنگ ملیں گے یہ آپ سب لوگ جانتے ہیں۔“ مجسٹریٹ عبدالرزاق نے پہلو بدلا۔

”ایک ملاقات میں اور موقع واردات پر پکڑے ہوئے انسان میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہمارے بیٹوں کی جانیں بڑے ظالمانہ انداز میں گئی ہیں۔ آپ ریکارڈنگ دیکھیں تو سہی۔“ جہانگیر نے ابرو اچکا کر سنجیدگی کا خول خود پر چڑھایا۔

”بلاشبہ ایسا ہی ہوا ہوگا، میں منکر نہیں ہو رہا ہوں ٹھوس بات کر رہا ہوں۔ میں نے دیکھی ہیں ریکارڈنگز مگر کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ کیمروں کو بھی ضبط کیا جاتا ہے۔ ان سے ویڈیوز چرا کر انہیں ایڈیٹ کیا جاتا ہے۔“ خالد نسیم نے ہاتھ پھیلانے، جہانگیر کی نگاہ ان پر اٹھی تھی۔

”معذرت مگر آپ اپنے بیٹے کو ڈیفینڈ کر رہے ہیں۔“ جہانگیر نے اس کی بات کی نفی نہیں کی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئے۔

”بالکل اور ہر باپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے ویسے بابر صاحب، دوہئی میں آپ نے اچھے خاصے پیسے انویسٹ کیے ہوئے ہیں۔ لیف کسینو میں آپ نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ کمائی لگائی ہے اوہ ہاں مجھے یاد آیا اس کا آئز کیا بھلا سا نام ہے اس کا ہاں ابوالقاسم وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اسے کہوں گا میں کہ آپ کا خیال رکھے۔“ شطرنج کی بساط انہوں نے بڑے طریقے سے بچھائی تھی۔ بیورو کریٹ بابر چغتائی کی زبان پر یہ سن کر تالا لگ گیا۔ سب کو اپنے اپنے مفاد نظر آنے لگے۔ سب کا اشتعال اور الجھن یک لخت ہوا کی نذر ہوئی تھی۔ پہلے بات بیٹوں کے قتل کی تھی مگر اب پیسوں کی ہے۔ وہ پیسہ جو اندھا کر کے خود کا گرویدہ کر دیتا ہے۔ صحیح غلط کی تمیز مٹا دیتا ہے۔ اچھے برے میں فرق ختم کر دیتا ہے۔ حلال کیا ہے حرام کیا ہے، فراموش

کر دیتا ہے۔ پیسہ جو شرف بھی ہے اور شر بھی، راحت بھی ہے اور کراہت بھی، جس کے ہونے سے سکون ہے اور نہ ہونے سے بے سکونی، جس کے نہ ہونے میں بھی سکون ہے اور ہونے میں بھی بے سکونی، پیسہ اچھے خاصے انسان کو ظالم جابر، قابیل، کابل بنا دیتا ہے۔ اس کی ہوس جس کو لگ جائے وہ برباد ہو جاتا ہے پھر اس کیلئے کون سے رشتے، کون سا خون۔ کیسی محبت، کیسی انیسیت۔ کون اولاد، کون جان۔

”میں نے آپ سے کہا قیس کبھی ایسی غیر انسانی حرکت نہیں کر سکتے لیکن اگر واقعی وہ ایسا کر چکے ہیں تو میں خود اس کو سزا دلواؤں گا۔ جانتا ہوں آپ لوگوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔ میں جتنا ازالہ کروں کم ہے مگر میں اپنی بساط کے مطابق ضرور آپ سب کی مدد کروں گا اور آپ کی شکایت کو دور کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔ اللہ آپ سب کے بچوں کی مغفرت فرمائے اور آپ کو اس دکھ کو سہنے کی ہمت عطا فرمائے۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔“

پانچ منٹ کی ملاقات میں وہ سارا راستہ سمیٹ کر اٹھ گئے تھے۔ دور آج کل پیسے اور مفاد کا ہے۔ پہلے خون کے بدلے خون ہوتا تھا اب خون کے بدلے قسمت ہوتی ہے۔ وہ قسمت جو ان چاروں کی بدلنے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

موجودہ شب۔

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔ اس کے نتھنوں سے بھینی بھینی خوشبو نکرائی تھی۔ نیم وا آنکھوں کو اس نے جھٹکے سے کھولا، قیس وہاں نہیں تھا مگر اس کی خوشبو ضرور موجود تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے دو ننھے ننھے قطرے تھے۔ ایک تو کمفر ٹراؤپر سے ہیٹر کی گرمائش، مدھم زرد

روشنی کمرے میں پھیلے اندھیرے کو مات دینے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر سیاہ باڈی والے لیمپ کو دیکھا جس پر آدھا چاند رکھا ہوا تھا جیسے پلیٹ کے اوپر شیشے کا ڈھکن رکھتے ہیں۔ اس داغ دار چاند میں سے پھسکی زرد روشنی پھوٹ رہی تھی۔ شیزل کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھی جو نہی وہ بیٹھی اس کا سر بری طرح چکرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑا تھا۔ تھوڑی دیر اسی طرح رہنے کے بعد اس نے اپنا اسکارف ڈھونڈا جو اس کے تکیے کے پاس ہی پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسکارف کو اٹھا کر گردن کے پیچھے سے گزار کر پہنا۔ اسی دوران گھڑی پر نظر ڈالی رات کے سوا ایک بج رہے تھے۔ اسے سب یاد آ گیا تھا تبھی دکھ کی ایک لہر اس کے بدن میں اٹھی تھی۔ وہ علی الصبح ہی اس کے پاس آئی تھی۔ وہ علی الصبح ہی بے ہوش ہوئی تھی۔ وہ پورا دن اور آدھی رات تک سوتی رہی تھی۔ ایک منٹ کو دل چاہا واپس بستر میں گھس جائے مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تبھی کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر واش روم چلی گئی۔

فریش وغیرہ ہونے کے بعد اس نے بیڈ کے پاس پڑے اپنے جوتے پہنے اور کمرے کا دروازہ تھوڑا سا وا کر کے باہر جھانکا، سامنے ہی صوفے پر بیٹھا وہ کسی سے فون پر بحث کرنے میں مگن تھا۔ شیزل نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ گہرا سانس بھر کر وہ لان میں کھلتے دروازے کے قریب آئی۔ دیوار پر لگا بٹن دبایا پردے آواز پیدا کیے بغیر سمٹتے چلے گئے۔ مررڈور سے وہ رات کے اندھیرے میں ڈوبالان دیکھ رہی تھی جس کی اکا دکا لائٹس جلی ہوئی تھیں۔ یہ بتیاں لان کو منور کرنے کی ناکام کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ شیزل نے دروازے کو سلائیڈ کیا، پہلا پاؤں باہر رکھا پھر دوسرا پھر وہ جو نہی مڑ کر دروازہ بند کر کے سیدھی ہوئی دھک سے رہ گئی۔ قیس اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ تاہنوز فون پر کسی سے برہم انداز میں

بات کر رہا تھا۔ شینزل کے قریب پہنچ کر اسے سیدھا ہوتے دیکھ وہ اس کی کلائی تھام کر چلنے لگا۔
ناچار اسے بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

”یار میں بیس بار آپ کو ایک بات سمجھا چکا ہوں مگر آپ ہیں کہ سمجھ ہی نہیں رہے ہیں۔
میری پراپرٹی ہے میں سیل کروں یا نہ کروں آپ کو اس سے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ مجھے جب
وہاں رہنا ہی نہیں ہے تو اس پلاٹ کا میں اچار ڈالوں گا آپ بس کاغذات تیار کروا کر اس
پلاٹ کو بیچ دیں اور پیسے ایک اکاؤنٹ نمبر بھیجوں گا اس میں ڈلوادیں۔“ لان عبور کر کے اس
نے اسٹپس چڑھے پھر داخلی دروازے سے اندر داخل ہو کر لاؤنج میں آ گیا۔ وہ صوفوں کے
قریب آ کر کھڑا ہوا، شینزل بھی کھڑی رہی۔ قیس نے اس کے شانے پر زور دے کر اسے بٹھایا
اور خود کچن میں چلا گیا۔ وہ باری باری چیزیں لا کر اس کے سامنے میز پر رکھ رہا تھا۔ صبح کی دھوئی
چیریز باسی ہو گئی تھیں اس لیے اس نے تازہ آرڈر کر دی تھیں۔ ایک گلاس میں ملک شیک تھا
فروٹ سیلڈ اور پتہ نہیں کیا کیا۔

”دیکھیں سر اب آپ مجھے غصہ دلا رہے ہیں۔“ قیس نے کانٹا چیری میں کھسکا یا کھوبنے
کے بعد شینزل کے منہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے بلا جھجھکی چیری کھانا شروع کی۔ وہ قیس کو سن
رہی تھی جو کہہ رہا تھا۔ ”میں پیسے اپنی بیوی کو دوں کالے چور کو دوں یا کسی کو بھی دوں یہ آپ کا
سرور نہیں ہے۔ اب آپ مجھے تب ہی کال کرنا جب پلاٹ بک جائے۔“ کال منقطع کر کے
اس نے چند لمحے شینزل کو سنجیدگی سے دیکھا پھر وہ ہلکا سا مسکا دیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا، چہرے پر شرمندگی تھی اور
دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔

”گڈ، ٹھیک ہی رہنا ہے آپ کو۔“ وہ اس کے بال بکھیرتا کھڑا ہوا، رخ کچن کی جانب

تھا۔ ”آپ کو فروٹس کی بہت ضرورت ہے کیونکہ آپ میں خون کی بہت کمی ہے، کچھ دن میرے پاس رہیں اچھی ڈائیٹ سے اس کمی کو پورا کریں اور اگر خدا نخواستہ ایسا نہیں ہوتا تو میں سوچ رہا ہوں آپ کو بلڈ لگوا دوں۔“ اس نے اسٹیک کو گرم کرنے کیلئے اوون میں رکھا۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

”آج آپ کا بی پی ہائی تھا مگر آپ کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ آپ کی حالت میرے لیے تشویش ناک تھی۔ ٹھیک ہے رشتوں سے بے اعتنائی سمجھ آتی ہے مگر صحت کے ساتھ ظلم، یہ سمجھ کے باہر ہے۔“ وہ اپنی ٹرے اٹھا کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ شیزل نے اب تک بس وہی چیری کھائی تھی جو قیس نے اسے دی تھی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ قیس نے ان لوازمات کو دیکھا اور پھر اسے۔

”شیزل، آپ کو خود زحمت کرنی ہوگی، خود کھانا ہوگا آپ چاہتی ہیں میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں تو ایسا بالکل نہیں ہونے والا۔“ وہ ایسے مسکرا رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ ایسے ٹریٹ کر رہا تھا جیسے یہ معمول کی بات ہو۔ اس کی ناراضگی۔ اس کا غصہ سب جیسے ہوا تھا۔ جھونکا آیا اور چلا گیا بس۔۔۔

”چلو شروع کرو شاباش۔“

وہ یک ٹک وٹا منر سے بھری ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی جب اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔ وہ خود اس برسات پر ہنر و نقاد تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ کوئی بھی محسوسات نہیں تھے پھر یہ آنسو؟ وہ سمجھ نہیں پائی، قیس نے گہرا سانس بھر کر چیخ اور کانٹے کو ٹرے میں واپس رکھا پھر بازو پھیلا کر اسے کہنے لگا۔

”ادھر آؤ، ادھر آؤ۔“ شیزل کھسک کر اس کے قریب آئی۔ قیس نے اس کے گرد بازو پھیلا دیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ مان بھرا سوال۔

”کچھ نہیں۔“ لرزتا ہوا جواب۔

”کیا ہوا ہے۔“ اس بار مان بھری دھونس سے دریافت کیا گیا۔

”تم مجھے چھوڑ دو گے تو نہیں۔“ اس نے متورم آنکھوں کے ساتھ سراٹھا کر اس سے پوچھا تھا۔ قیس دو سیکنڈ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام کر مضبوطی سے پکڑا۔

”ایسا کر سکتا ہوں میں؟“ اس نے سوال پر سوال کیا تھا۔ شیزل کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آنسو رک کیوں نہیں رہے۔ غبار بہہ نکلا تھا۔ دل ہلکا ہو رہا تھا۔

”تم ایسا کر رہے تھے۔“ وہ اس کے یاد دلانے پر مسکرا دیا۔

”ہاں کیونکہ مجھے بہت زیادہ غصہ تھا۔ بہت زیادہ دکھ تھا۔“ شیزل نے پھر سراٹھا کر اسے دیکھا، اس کی انگلی کا ناخن قیس کی شرٹ کے بٹن کو کھرچ رہا تھا۔

”تو کیا اتنا کچا رشتہ ہے ہمارا۔“ وہ عرصہ بعد اس کے ساتھ اس طرح سے پرسکون بیٹھی تھی۔ وہ عرصہ بعد اس سے یوں ہم کلام تھی۔ قیس کو بے نام سی خوشی کا احساس ہوا، اس نے اس کے شانے پر رکھے اپنے ہاتھ کا دباؤ تھوڑا سا بڑھایا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں، ایم سوری تم ہرٹ ہوئی۔“ قیس نے اپنا ہاتھ صوفے کی بیک پر پھیلا لیا۔ شیزل اس سے کافی فاصلے پر مگر اس کے حصار میں صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

”میں تمہاری وجہ سے ہرٹ نہیں ہوئی ہوں یہ شاید ڈپریشن ہے جو مجھ سے ایسا کروا رہا ہے۔“ وہ اس کے یکدم منکر ہونے پر لبوں پر مسکان کو دبا گیا۔ قیس کی اسٹیک ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ فوڈی تھا مگر اس نے پرسوں صبح سے ایک کپ کافی لینے کے علاوہ کچھ نہیں کھایا تھا۔

اب کھانا اس کے سامنے تھا اور وہ میڈیم اس کے ساتھ، اس نے گہری آہ بھری۔

”ہاں ہاں مان لیا کہ بے ہوش بھی آپ ڈپریشن کی وجہ سے ہوئی تھیں۔“ شیزل نے پھر سے سر اٹھا کر بل دار ماتھے کے ساتھ اسے دیکھا جو مزید کہہ رہا تھا۔“ آپ کے آنسو بھی ڈپریشن کی وجہ سے ہیں۔ ناراضگی بھی ڈپریشن کی وجہ سے ہے۔ سب ڈپریشن کی وجہ سے ہے۔“ وہ سہولت کے ساتھ مزید پیچھے ہوئی سینے پر بازو باندھے اس سے مخاطب تھی۔

”تم طنز کر رہے ہو؟“ اس نے جھک کر اپنی اسٹیک اٹھائی اور اسے رغبت سے کھانے لگا۔ ”مجھ غریب کی مجال جو آپ جناب۔“ اس نے کانٹے کو اس کی طرف کر کے گول گول گھمایا۔ ”پر طنز کروں، یہ شرف فقط آپ کو ہی حاصل ہے۔“ شیزل نے کشن اٹھا کر زور سے اسے مارا جسے وہ ڈاچ کر گیا۔

”میں کب طنز کرتی ہوں؟“ اسے صدمہ ہوا۔ یہ بہتان بہت برا تھا۔ ”طنز۔۔۔ آپ دل پھاڑ دیتی ہیں۔“ شیزل کے کان ایک بار پھر سے گرم ہوئے تھے۔ ”ٹھیک ہے۔ آئندہ میں تمہیں نظر ہی نہیں آؤں گی۔ نہ میں ہوں گی نہ طنز سنو گے تم۔“ تڑخ کر کہتے ہوئے وہ ابھی آدھی ہی اٹھی تھی کہ قیس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے پھر سے جھٹکے سے بٹھا دیا۔

”کیا بد تمیزی ہے۔“ وہ چلائی تھی۔ ”بیٹھ جاؤ، ہر وقت غصہ ناک پر نہ رکھا کرو۔“ منہ میں چکن کا ٹکڑا لیے وہ مسکراہٹ دباتا کہہ رہا تھا۔ شیزل کی آنکھوں میں طیش کی سرخی آن ٹھہری تھی۔ ”مجھے اپنے گھر جانا ہے ابھی اور اسی وقت۔“ دانت پیس کر کہتے ہوئے وہ اسے محظوظ کر گئی۔

”یہ آپ کا ہی گھر ہے۔“ شیزل نے اس کی نفی کی تھی۔ اپنا ہاتھ جھٹکے سے اس سے چھڑوایا۔

”یہ میرا گھر نہیں ہے۔“ قیس نے پانی کے گلاس کو لبوں سے لگایا۔

”لیکن میں نے تو کب کا آپ کے نام ٹرانسفر کروا دیا۔“ وہ اس اطلاع پر مغلوب نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب تک پتہ نہیں کیا کچھ اس کے نام پر ٹرانسفر کروا چکا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹس میں اتنی رقم تھی کہ وہ سات خاندان کو بھی پالتی تب بھی ختم نہ ہوتی۔ یہ اس کیلئے اب عام بات تھی۔ وہ ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی تھی۔

”یہ میرا درد سر نہیں ہے۔“

”یہ آپ کا ہی درد سر ہے۔“

”قیس۔“

”چپ چاپ کمرے میں چلی جائیں اگر مزید زچ کیا تو میں عدالتی پیپر پرسیاں کر دوں گا۔“ دو بدو بات کرنے کے بعد اس نے جو کہا تھا اس پر شیزل کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔ گھڑوں پانی پڑا۔ تو یعنی اب وہ اسے اس طرح بلیک میل کرے گا۔ سکی اتنی ہوئی کہ چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس نے اتنی زور سے دانت کچکچائے کہ آواز باہر تک آئی۔

”دھیان سے کہیں ٹوٹ ہی نہ جائیں۔“ شیزل نے ایک زوردار مکا اس کی ٹانگ پر جڑا تھا۔ وہ یکدم بلبلا گیا۔

”آہ، جنگلی عورت۔“ اپنی ٹانگ کو رگڑتے ہوئے ماتھے پر بل لیے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ شیزل کشن اٹھا کر مارنے لگی پھر کھانے کا لحاظ کر لیا۔

”تم ایک ڈھیٹ انسان ہو۔“

”بلا کا۔“ آنکھ مار کر وہ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ شیزل نے وقت دیکھا رات کے دو بج چکے تھے۔ اس نے صرف دو چار اسٹابیریز کھائیں۔ اس دوران وہ قیس کے تھکے تھکے چہرے کو

بھی دیکھ رہی تھی جو پرسوں صبح ہوئی ہاتھ پائی کی وجہ سے تھوڑا زخمی تھا۔ اس نے ان زخموں پر اب تک کچھ نہیں لگایا تھا۔ وہ ایک اور کوشش کے تحت فرسٹ ایڈ باکس اٹھالائی تھی۔ اس بار قیس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے زخموں کی ڈرینگ کرنے کے بعد ہاتھ دھو کر واپس آئی تو دیکھا وہ صوفے پر ہی سو گیا ہے۔ اس کی تیز سانسیں بتا رہی تھیں وہ گہری نیند میں چلا گیا ہے۔ شیزل نے نامحسوس انداز میں احد کی دی انگوٹھی اتار کر اسکرٹ کی جیب میں ڈالی اور اسے یک ٹک دیکھتی رہی گڑ بڑائی تو تب جب اس کی بھاری خمار میں ڈوبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”آپ اپنی نیند پوری کر چکی ہیں، میں نہیں اس لیے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی جائیں اور مجھے گھورنا بند کریں۔ یہ یاد رکھنا آپ میری اجازت کے بغیر اس وقت یہاں سے نہیں جاسکتیں۔“ وہ متحیر سی بھنویں اچکائے اسے دیکھتی رہی۔ قیس نیند کے خمار میں ڈوبی آواز سے ہی کہہ رہا تھا۔

”تم سے اجازت لیتی ہے میری جوتی۔“ اس نے ایک آنکھ کھولی۔ وہ اس کے سر پر ہی کھڑی تھی۔ پھر اس نے بڑے تحمل کے ساتھ اس آنکھ کو بند کیا اور وہ کہا جس نے شیزل کو سرتا پا سلگا دیا۔

”آپ کی جوتی کو بھی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے چلو شاہباش اپنے کمرے میں غائب ہو۔“ شیزل دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بنائے ضبط کے کڑے پہروں میں کھڑی رہی۔ دل کیا اس کا گلا گھونٹ دے۔ آہہہ۔۔۔

”بھاڑ میں جاؤ۔“

پھر وہ پیر پختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔



اس نے دیکھا آسمان نیلا تھا جیسے گہرا پانی ہوا کرتا ہے، سمندر کی طرح، خوبصورت دل موہ لینے والا، کہیں کہیں روئی کے گالے تھے جیسے سمندری جھاگ ہوتی ہے۔ پرندے تھے جیسے بگلے ہوتے ہیں۔ سورج تھا جیسے نور ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تکان بھری آنکھوں میں یہ منظر قید کر کے گردن جھکالی۔ وہ ایک بلڈنگ کے شیشے کو رگڑ رہی تھی۔ ساتویں منزل تھی جس پر وہ لوہے کی بوسیدہ سی لفٹ پر اپنے وجود کو سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر پیلی کیپ تھی اور نیلی یونیفارم زیب تن کی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں موٹا اسفنج اور وائپر تھا مے وہ دیوار کی جگہ نصب شیشے کو صاف کرنے میں بری طرح مگن تھی۔ اس کے ماتھے پر کچھ پسینے کے قطرے موجود تھے۔ دل میں تھوڑا سا ڈر تھا مگر ارادہ مضبوط تھا۔ اب سے کچھ مہینوں بعد اسے تھوڑی زیادہ رقم کی ضرورت تھی تاکہ اس کا علاج بہتر طریقے سے ہو جائے۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس نے یامین کے علم میں لائے بغیر اپنی ایک جاننے والی کے توسل سے جو اس کمپنی میں خاکروب تھی یہ ڈیوٹی لگوالی تھی۔

پہلے پہل اس کی حالت کے پیش نظر اسے یہ جاب نہیں دی گئی مگر جب وہ کمپنی والوں کے لیے مستقل مزاج اور مستحکم ارادوں کی ثابت ہوئی تو وہ اسے یہ ڈیوٹی دینے کیلئے آمادہ ہو گئے۔ یہ ایک اسپیس کمپنی تھی جن کے راکٹس ناسا کو سیل کیے جاتے تھے۔ ناسا کے اگلے پروجیکٹ میں ایک پاکستانی پھر سے شامل ہو چکا تھا جس کے ساتھ آج کے دن کی میٹنگ فکس تھی۔ اس لیے فرسٹ فلور سے بارہ فلور تک کے تمام شیشے وہ آج ہی چکوانا چاہتے تھے۔ کمپنی والوں کو لگ رہا تھا کہ وہ نحیف سی، غریب سی لڑکی یہ کام نہیں کر پائے گی مگر وہ غلط تھے۔ وہ بہت اچھے طریقے سے، بہت پھرتیلے انداز میں اپنا کام سرانجام دے رہی تھی جب چند کاریں اس بلڈنگ کے سامنے آکر رکیں۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص کار سے اترنے کے بعد میزبانوں

کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا۔ ایسا کرنے کے دوران اس کی نگاہ زمین پر پڑتے سائے پر گئی تھی۔ اس نے یونہی سرسری انداز میں سر اٹھا کر دیکھا پھر شانے جھٹکتا اندر چلا گیا۔ وہ جب میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد ایک کال اٹینڈ کرنے کیلئے آٹھویں فلور کے ایک کمرے میں آیا تو بری طرح ٹھٹھک گیا۔ وہ جب کمرے میں آیا تھا تو کسی سے بات کر رہا تھا۔ نظریں جھکی تھیں اور چھوٹی انگلی ابرو کو کھجا رہی تھی۔ بات کرتے کرتے ٹہلتے ہوئے اس نے جونہی نظر اٹھائی تو اس کا فون نہ جانے کیسے، کیوں اور کب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قدموں میں جا گرا۔ وہ بے یقین نظروں کے ساتھ اسے شیشہ صاف کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لب آپس میں جڑے تھے اور سانس تیز ہو چکی تھی۔ بھرے دل کے ساتھ اس نے رخ موڑ لیا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے باہر نکلا، ریلنگ پر ہاتھ جمائے آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس بھرنے لگا۔

”وہ مر چکی ہے، وہ میرے لیے مر چکی ہے۔“ دماغ کی خالی سلیٹ پر الفاظ ابھرنا شروع ہوئے، باور کروانا شروع ہوئے۔ دل چلا اٹھا، دل کر لیا اٹھا۔

”بکو اس بند کرو، وہ زندہ ہے اور وہ زندگی ہے۔“ قیس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسٹیل کی ریلنگ جسے اس نے انتہائی مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اسے چھوڑا، چھوڑنے کے بعد اپنے قدموں کو مینجر کے کمرے کی سمت موڑ دیا۔

”میں چاہتا ہوں آپ اس لڑکی کو ابھی نیچے اتاریں۔ اسے پورے پیسے دیں اور کہیں وہ کل آ کر باقی کام کرے اور جب وہ کل آئے تب کام پہلے سے ہی ہوا ہو۔“ مینجر اچنبھے میں مبتلا ہوا۔

”سر آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ آپ ٹھیک ہیں؟“ قیس نے اثبات میں سر ہلایا پھر

خود کو نارمل کرتے ہوئے بولا۔

”جوششے صاف کر رہی ہے اس کی بات کر رہا ہوں۔“ مینیجر کو اب کی بار مزید حیرت نے گھیر لیا وہ بلا مبالغہ اس سے دریافت کرنے لگا۔

”ہم ایسا کر دیں گے سر، مگر کیا آپ اسے جانتے ہیں۔“ اس نے ایک جملے میں جواب دیا تھا جس نے مینیجر کی بولتی بند کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا جو کہ یہ تھا۔

”ترس کیلئے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔“ پھر اس نے تھوڑا توقف کیا۔ اس کے بعد مزید کہا۔

میری پی اے آپ کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلوادے گی۔ پیسے اجرت سے زیادہ ہونے چاہیں۔“ وہ کہہ کر مڑ گیا تھا۔ نویں فلور پر وہ اب بھی کام میں مگن تھی۔ قبل اس کے وہ پورے ششے کو صاف کرتی اسے نیچے اتار دیا گیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ باقی کا کام اسے کل آکر کرنا ہے۔ وہ لڑکی ڈبل سیلیری ملنے پر بھی مستعجب تھی جب اس نے استفسار کیا تو اس سے کہا گیا۔

”باس آپ کے کام سے زیادہ خوش ہوئے ہیں اور وہ چاہتے ہیں آپ مستقبل میں بھی ہمارے ساتھ کام کریں۔ اس لیے جب وہ کسی سے خوش ہو جاتے ہیں تو اسے زیادہ نواز دیتے ہیں۔“ وہ پیسے لے کر گھر آئی تھی۔ دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کے بعد اس نے ساری رقم یا مین کے ہاتھ پر رکھ دی تھی جس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے واپس لوٹا دی۔

”یہ تمہاری محنت ہے اور تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ انہیں سنبھال کر رکھو۔“ اس دن شام میں کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ بہت بیمار ہو گئی تھی۔ یا مین اسے نزدیک کے سرکاری ہسپتال میں لے گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے ڈرپ لگا دی تھی۔ یا مین کو پٹرول پمپ پر کام تھا اس لیے وہ اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ لیٹی ہوئی تھی جب اسے اپنے بیڈ کے قریب کسی کے ہونے کا احساس ہوا، اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا، اس کا بھائی اس

کے سامنے کھڑا تھا۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ کھر درالہجہ، سپاٹ آواز۔

”ابھی یہ۔“ اس نے آدھی پچی ڈرپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ ”ممکن نہیں ہے۔“

”نرس۔“ اس کی ایک آواز پر اسے وہیل چئیر پر ڈرپ سمیت منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا اور نرس اس کی وہیل چئیر کو تھامے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ہسپتال کے گھٹن زدہ ماحول سے باہر سبزے میں ایک سنگی بیچ کے قریب لا کر اس کی وہیل چئیر روک دی گئی تھی۔ جونہی نرس وہاں سے گئی تو انہی قیس نے کوٹ کی جیب سے کاغذات نکال کر اس کی گود میں پھینکے تھے۔

”تم ہم سب کیلئے مرچکی ہو مگر پھر بھی زندہ ہو، اللہ کو جواب میں نے بھی دینا ہے اور میرے بابا نے بھی اس لیے ان کاغذات پر دستخط کر دینا، تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا مگر یاد رکھنا پاکستان میں تم قدم نہیں رکھو گی، میں نہیں چاہتا تمہارے منحوس سائے کی وجہ سے میرے بابا کے کریئر پر کوئی آنچ آئے۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے واپس جا رہا تھا مگر اس کے لفظوں کی وجہ سے تھم گیا۔ آسمان پر تارے تھے۔ گھاس گیلی تھی۔ وہ مریضوں کے لباس میں کچھ زیادہ ہی مریض لگ رہی تھی۔ اس کی آواز میں حزن تھا اور ضرورت سے زیادہ تھا۔

”جس طرح میں تم لوگوں کیلئے مرچکی ہوں نا۔“ اس کی آواز لڑکھرائی، وہ رونے لگ گئی تھی۔ ”اسی طرح تم لوگ بھی میرے لیے مرچکے ہو، مجھے خیرات میں دی ہوئی تمہاری دولت نہیں چاہیے۔ تم اسے واپس لے جا سکتے ہو۔“

وہ ایڑھیوں کے بل مڑا تھا۔ تحقیر سے اسے دیکھا اور نخوت سے گویا ہوا۔

”ڈھٹائی کی بھی حد ہوتی ہے، عزتیں اچھالنے کے بعد بھی عزت دار بن رہی ہو، انتہا

ہے۔“ پہلی جلد والی لڑکی اس کے لفظوں کے نشتر سے بری طرح گھائل ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں اٹکتا ہوا گولا اسے تکلیف دے رہا تھا۔ وہ اسے نگلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں نے کسی کی عزت نہیں اچھالی ہے، تم لوگوں نے مجھے تنہا چھوڑا، تم لوگوں نے مجھے در بدر کیا۔“ وہ پینک ہوئی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ رورہی تھی۔

قیس کو اس سے ایک بار پھر سے نفرت ہوئی۔

”اوجسٹ شٹ اپ، یہ میلوڈرامہ کسی اور کے سامنے کرنا، گھر سے بھاگنے والیوں کے منہ سے اس طرح کے جملے سوٹ نہیں کرتے، آئندہ ہمیں الزام دینے سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانکنا تم۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں قیس الہیٰ اور نہ ہی مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ تمہاری ماں نے مجھے گھر سے نکالا تھا۔ اس ظالم عورت سے جا کر سب پوچھو اگر ایمان بچا ہوگا اس میں تو بتائے گی وہ۔“

اس کی بس ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کیوں اور کیسے اسے غصہ آیا مگر وہ برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے اٹے ہاتھ کا تھپڑ اس لڑکی کے گال پر جڑ دیا تھا۔ اس کی وہیل چتیرا ہل کر رہ گئی۔ اس کا دل، اس کی روح ہل کر رہ گئی۔

”یہ مجھے بہت پہلے ہی کر دینا چاہیے تھا۔“ وہ آنکھوں میں خون لیے اس سے کہہ رہا تھا۔ پانچ انگلیاں اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گئی تھیں۔ پانچ مردانہ انگلیاں۔۔۔ اس کے جس ہاتھ میں ڈرپ لگی تھی وہ سو جنا شروع ہو گیا یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ڈرپ کی سوئی بھی اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ اسے درد ہونا شروع ہوا تھا۔ بے تحاشہ درد۔ وہ اذیت کے ان لمحوں میں خود پر جبر کیے لب کاٹتی ہوئی نمناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر کر دیتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ تم جیسی لڑکیاں ایسے ہی سلوک کی مستحق ہوتی ہیں۔“ جھٹکے سے اسے چھوڑ کر وہ پیچھے ہٹا تھا۔

”آج اگر میری ماں زندہ ہوتی تو تمہاری جرات نہیں ہوتی ایسا کرنے کی۔“ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس کی تھوڑی کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے پانی برسات کی طرح بہہ رہا تھا۔ بدن سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا اور آواز میں ارتعاش بے تحاشہ تھا۔

”مگر افسوس وہ یہاں نہیں ہیں۔ میرا کوئی اس دنیا میں نہیں ہے۔ مر چکے ہو تم لوگ میرے لیے، سب مر گئے۔ دفن ہو گئے۔“ قیس رکا نہیں تھا۔ ایک زہر آلود نظر اس پر پھینک کر لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اپنی کار میں آ کر وہ دو منٹ تک ٹھس بیٹھا رہا پھر اس نے اپنے ہاتھ کو زور زور سے اسٹیرنگ پر مارنا شروع کیا تھا یہاں تک کہ اس کے ہاتھ سے خون نکلنے لگا۔ وہ بھول چکا تھا کہ آج سے ایک ہفتے بعد اس نے اسپیس میں جانا ہے۔ وہ فراموش کر گیا تھا کہ اسے دنیا کی سب سے لمبی چھلانگ لگانی ہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا بالکل ماؤف، آنکھوں میں جنون اور دل میں درد لیے وہ ایک بار پھر سے کار سے نیچے اتر ا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا خطرناک چہرے کے ساتھ وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا جس کی وہیل چمیر نرس اندر دھکیلتی ہوئی لے کر جا رہی تھی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھایا اور اس وہیل چمیر کا رخ شدت کے ساتھ اپنی جانب موڑ دیا۔ نین بری طرح لرز کر رہ گئی تھی۔ نرس نے بوکھلاتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ایسا برتاؤ ان کیلئے ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے نرس کو دیکھے بنا خون آلود ہاتھ کھڑا کر کے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود ماتھے پر بل ڈالے، منہ سے کف نکالتے ہوئے بولا۔

”میری ماں پر الزام کیوں لگایا ہے تم نے، بولو جواب دو۔“ وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ نرس دوڑتی ہوئی اندر کو بھاگی۔

”الزام معصوم پر لگا کرتے ہیں۔ میں نے حقیقت بتائی ہے۔“ وہ درد کی شدت سے نڈھال ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ قیس نے جینز کی جیب سے پستل نکال کر لوڈ کی اور اس کے ماتھے پر رکھ دی۔

”الزام کیوں لگایا ان پر۔“ وہ دھاڑ رہا تھا۔ نین پتے کی طرح لرز گئی۔

”موت سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے میں نے قیس الہی، تم کیا جانو یہ وجود کتنے ظلم سہہ چکا ہے۔“ وہ بہتی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اس کی ہچکی بس بندھنے ہی والی تھی۔

”اپنا گند چھپانے کیلئے تم اس حد تک گر جاؤ گی میں نے سوچا نہ تھا۔ آئندہ تمہارے ناپاک لبوں سے میری ماں کا نام بھی نکلا تو سچ کہہ رہا ہوں، شوٹ کر دوں گا تمہیں۔“ اتنی نفرت، ایسا ہتک آمیز رویہ۔ وہ اس کے ماتھے کو پستل کی نال سے جھٹکتے ہوئے مڑا تھا۔

”یاد رکھنا یہ بات، میرا ہاتھ گولی چلاتے ہوئے ذرا نہیں کانپے گا۔“ وہ اپنی بات کہتا رہا نہیں تھا۔ نین وہیل چمیر کے بازو پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نرس گارڈ کو تلب لے کر آئی تھی جب وہ جا چکا تھا۔ اس کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ وہ ایک دن کیلئے ایڈمٹ تھی اسے تین دن تک وہاں رکھا گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح کے دس بجے جب پورا دن چڑھ آتا ہے۔ ہر ذی روح جاگ اٹھتی ہے۔ ہر بندہ روزی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے ایسے میں سفید اسکرٹ والی لڑکی اپنی کار سے باہر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی کار کے بالکل پیچھے ایک جیپ میں کوئی چیونگم چباتا پاؤں ہلاتا ہوا اپنے

لیپ ٹاپ کی اسکرین میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ لڑکی کار کو لاک کر کے بلڈنگ کے اندر بڑھ رہی ہے۔ اس نے ایک بٹن پیش کیا۔ ریموٹ کنٹرول کار لفٹ کے باہر تھی اور لفٹ کی چھت پر چپکا باریک سا کیمرہ لڑکی کے شانے پر آگرا، سیاہ شرٹ میں وہ کیمرہ مدغم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لڑکی نے گھڑی میں وقت دیکھا پھر وہ لفٹ کے کھلنے پر آگے بڑھنے لگی۔ اپنے اپارٹمنٹ کی بجائے اس نے ساتھ والے اپارٹمنٹ کی رنگ بیل پر دو انگلیاں رکھی تھیں۔ چھوٹے سے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر وہ اسکرٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جوتوں پر نظر جمائے کھڑی نظر آئی۔ دروازہ کھلنے پر وہ کسی سے مسکرا کر بات کر رہی تھی پھر وہ گلے ملی اور اندر چلی گئی۔

”بہت زیادہ دنوں بعد آئی ہو تم، احساس ہے اس بات کا تمہیں۔“ رحمت کے شکوے پر وہ مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھی اور اپنا بیگ ساتھ ہی رکھ کر گویا ہوئی۔

”بس آنٹی مصروفیت اتنی ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا، آپ بتائیں کیسی ہیں۔ احد واپس آیا یا نہیں؟“ رحمت کی نظر کچن کی طرف تھی۔ وہ اسے کچھ پیش کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ اس کے سوال پر چونک گئیں۔

”ارے نہیں بیٹا، وہ ابھی نہیں آیا بلکہ فون کر کے کہتا ہے اسے کچھ وقت اور لگے گا۔ تم بتاؤ کہاں ہوتی ہو آج کل۔“ وہ ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ کر جان گئی تبھی اٹھ کر کچن میں گئی۔ پانی پیاس کے بعد کافی پھینٹنے لگی۔

”میں تو یہیں ہوتی ہوں بس وقت میرے پاس نہیں ہوتا۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کافی بنا کر واپس ان کے پاس آئی۔ ایک کپ انہیں دیا اور ایک خود لے کر بیٹھ گئی۔

”نانچے وقت کارو نانا نہ رو، یوں کہو آج کل کی جنریشن کے پاس نیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے

بوڑھے بزرگوں کے ساتھ بیٹھیں یا فیملی کو ٹائم دیں۔ نیت ہو تو وقت خود بخود نکل آتا ہے۔“ وہ شرمندہ کرنا جانتی تھیں شینزل یہ بات مان گئی۔ ان سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

”آئی میں احد کی کوئی چیز لوٹانے آئی تھی۔ وہ گھر پر نہیں ہے تو میں چاہتی ہوں آپ مجھ سے لے لیں۔“ اسے اسکرٹ کے جیب سے انگوٹھی نکالتے ہوئے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی ہچکچاہٹ کو رحمت کی تجویز نے دور کر دیا۔

”تو بیٹا وہ اس کا کمرہ ہے جاؤ اور وہاں رکھ دو، وہ جب آئے گا تو ریسو کر لے گا۔“ شینزل کو یہ بات معقول لگی تھی تبھی وہ ان کی اجازت پر احد کے کمرے میں آئی۔ نفیس سا کمرہ خاموشی کی نذر تھا۔ اس نے بڑے دلچسپ انداز میں کمرے میں نظر دوڑائی۔ رحمت اسے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھ کر گویا ہوئیں۔

”بیٹا سکون سے کمرے کا جائزہ لو، جو تبدیلی کروانی ہو احد کو بتا دینا آخر کو تم نے شادی کے بعد اسی کمرے میں ہی تو رہنا ہے۔“ وہ ان کی بات پر نچل ہونے کے ساتھ ساتھ شرمندہ بھی ہوئی تھی۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہدایت دے کر پھر سے سیدھی ہو گئی تھیں۔ ان کی پیٹھ احد کے کمرے کی طرف تھی۔ شینزل نے اسکرٹ سے انگوٹھی نکال کر ڈرینگ ٹیبل کی سفید سطح پر رکھی پھر دو قدم آگے بڑھ آئی۔

”میرے پاس بہت زبردست کتابوں کی کلیکشن ہے کبھی تمہیں دکھاؤں گا۔“ وہ مسکرا کر اس کی پوری دیوار میں لگی کتابوں کو دیکھ رہی تھی پہلے پہل تو وہ محظوظ ہوئی مگر پھر چونک گئی۔ آدھی سے زیادہ کتابوں کے رخ موڑ کر رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح کے ان کا نام نہیں پڑھا جاسکتا تھا فقط سیاہ، سفید، گلابی یا پیلے صفحات ہی نظر آتے تھے۔ اس نے ایک کتاب کھینچی، اس

کے سرورق پر نظر پڑتے ہی وہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے تیزی سے دوسری نکالی پھر تیسری اور پھر چوتھی سب کی سب ہی دجال کے (نعوذ باللہ) خدا ہونے کی تصدیق پر لکھی ہوئی کتب تھیں۔ یا پھر شیطان کو خدا ماننے پر لکھی ہوئی۔ اس نے نیچے گری کتاب اٹھا کر واپس اس کی جگہ پر رکھی۔ اس کا ماتھا عرق آلود ہو چکا تھا۔ ہاتھ کپکپانے لگ گئے تھے۔ بہت کچھ یاد آنے لگ گیا تھا۔ وہ سوکھے ہونٹوں کو تر کر کے خود کو کمپوز کرتی باہر جا رہی تھی جب اس کی نظر بیڈ کے بالکل ساتھ جالی دار دروازے پر پڑی۔ وہ بنا سوچے سمجھے اس دروازے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے کھولا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر آئی تھی۔ اندر آتے ہی اس کی روح بری طرح کانپی تھی۔ بلڈنگ کے باہر جیپ میں بیٹھا ہوا وہ شخص اسے بڑے ہی مست انداز میں دیکھ رہا تھا دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کر کے وہ انگلیاں چٹختا جیپ سے چھلانگ لگا کر اتر ا۔

شینزل الٹے پیر کمرے سے باہر بھاگی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے اپنے دوسرے فون سے خود کو کال ملائی پھر کال اٹینڈ کر کے چہرے کو نارمل کر کے باہر آ گئی۔

”جی سر، میں بس ابھی پہنچتی ہوں، آئی جی کی کال ہے۔“ فون پر جھوٹ موٹ کا بول کر وہ سرگوشی میں رحمت کو آگاہ کر رہی تھی۔

”نہیں نہیں سر آپ سے نہیں کہہ رہی ہوں بس پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“ اس نے برق رفتاری سے اپنا پرس اٹھا کر شانے پر ڈالا، رحمت کے ہزار روکنے پر وہ ایکسکیوز کر کے باہر آئی تھی۔ اس کا پورا بدن کانپنا شروع ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھی، نیچے لابی

میں آتے ہوئے اس نے نشاء کا نمبر ملایا تھا۔ پہلی باری میں فون نہیں اٹھایا گیا مگر دوسری بار اس کی کال رسیو کر لی گئی تھی۔

”نشاء مجھے تمہاری مدد چاہیے، کیا تم میسر ہو؟“ وہ اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نشاء سے بات کرتے کرتے اسے احساس ہوا کوئی اس کے پیچھے موجود ہے۔ وہ یکدم مڑی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے خوف آ رہا تھا۔ بے حد خوف۔ جان گویا حلق میں آ گئی ہو۔

”لیس میم، آپ مجھے لوکیشن سینڈ کریں میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ پھر سے چلنا شروع ہوئی تھی۔ اس بار اس نے مڑنے کی زحمت نہیں کی، دبے دبے سے قدم اس کے عقب میں تھے۔ اس نے نشاء کو لوکیشن سینڈ کی پھر لمحے بھر کو رک گئی۔ اس کا تعاقب کرنے والا بھی رک چکا تھا۔ شینزل نے فون کو ریکارڈنگ پر لگا کر نامحسوس انداز میں اسکرٹ کی جیب میں ڈالا اور پھر یونہی ہاتھ جیبوں میں ڈالے کھڑی رہی۔

”میں نہیں جانتی تم کون ہو پر اتنا سمجھ گئی ہوں تم قیس نہیں ہو۔“ جواب ندارد، اس نے قدم بڑھایا اس کے ساتھ ہی ایک اور قدم بڑھا۔

”تم جو کوئی بھی ہو انتہائی بزدل انسان ہو جو پیٹھ پیچھے وار کرتا ہے۔ کم آن ہمت دکھاؤ اور میرے سامنے آؤ۔“ اس بار بھی جواب ندارد، شینزل تلخی سی مسکائی اور اب کی بار پرواہ کیے بغیر اپنی کار کی طرف برق رفتاری سے بڑھنے لگی۔ جتنی آہستہ وہ چل رہی تھی اتنی ہی آہستہ اس کا تعاقب کرنے والا قدم اٹھا رہا تھا۔ اب اس نے اسپید بڑھالی تھی تو پیچھے موجود انسان بھی تیز ہو چلا تھا۔ شینزل نے کار کا دروازہ کھولا جسے جھٹکے سے بند کر دیا گیا۔ بند کرنے والی وہ نہیں تھی بلکہ سیاہ گلوں میں چھپے ہاتھ تھے۔

”کیا تم جانتی ہو تم کیا کہہ چکی ہو۔“ وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا اتنا کہ اس کی سانسیں

شینزل کے بالوں سے ٹکرار ہی تھیں۔

”مجھے پرواہ نہیں ہے۔“ اس کی آواز مستحکم تھی۔ وہ انسان ہنس دیا۔

”میں تمہیں ابھی ختم کر سکتا ہوں، تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔“ وہ دھمکی پر مسکرائی، یہ طفل دھمکیاں کم از کم اس کیلئے نہیں تھیں۔

”قیس تمہیں جان سے مار دے گا، ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔“ اب کی بار وہ انسان مزید اونچی آواز میں ہنسا تھا۔ وہ قیس نہیں تھا۔ وہ شاید احد بھی نہیں تھا پھر وہ کون تھا، آخر کون اور کیوں؟

”چلو پھر دیکھ لیتے ہیں ڈیمو، ہم بھی تو دیکھیں یقیناً مستحکم کس طرح ذلیل ہوتا ہے۔“ قبل اس کے وہ کوئی جواب دیتی اسے اپنی کمر کی سائیڈ پر آگ گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔ بنا آواز کے گولی چلی تھی اور بے حد قریب سے چلی تھی۔ وہ انتہائی تعجب کے عالم میں یکلخت مڑی تاکہ اس پر جھپٹے مگر وہ انسان اپنا کام کر کے وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ شینزل کھڑے قد سے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ وہ خون آلود تھا۔ خون بہت تیزی سے نکل کر زمین پر پھیل رہا تھا۔ اس نے نشاء کو کال کر کے ساری صورتحال بتائی، وہ دو منٹ میں اس کے پاس تھی۔

”کیا ہوا ہے میم، اوگاڈا تنا خون۔“ شینزل نے ہاتھ سختی سے اپنی کمر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ قدرے متورم آنکھوں کے ساتھ نشاء کو دیکھتی ہوئی گویا ہوئی۔

”گولی میرے اندر ہے نشاء، ہمیں ہاسپٹل جانا ہوگا مگر یہ بات قیس کو پتہ نہ چلے، تم اسے فون کر کے کہو کہ تم اور میں۔“ تکلیف کی شدت سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا پورا چہرہ عرق آلود ہو گیا۔ ”کچھ دنوں کیلئے دوسرے شہر جا رہے ہیں۔ کوئی بھی بہانا کرو کچھ بھی کہو

مگر اسے مجھ سے رابطہ کرنے سے روک دو، تم سمجھ رہی ہونا میری بات۔“ نشاء معاملہ نہیں سمجھ رہی تھی پھر بھی اثبات میں سر ہلا گئی۔ چونکہ پولیس کو گولی لگی تھی اس لیے پولیس کیس کی کوئی گنجائش نہیں بنتی تھی۔ اس کی گولی نکال دی گئی تھی۔ وہ بہت مختصر عرصے کیلئے بے ہوش رہی تھی جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال کے کمرے میں تنہا تھی۔ اسے خون لگا تھا مگر وہ صحت یاب تھی۔ دھندلی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنا فون اٹھا کر چہرے کے قریب کیا، وقت دیکھا پھر اسے واپس سر ہانے رکھ دیا۔ اس نے ابھی فون رکھا ہی تھا کہ نشاء اندر آ گئی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور حال احوال دریافت کرنے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔“ تم سے ایک ضروری کام سے ملنا تھا۔ بہت اہم بات ہے۔“ نشاء اس کے قریب آ کر بیٹھی، اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور اسے تھکتے ہوئے بولی۔

”آپ پہلے ٹھیک ہو جائیں ہم پھر بات کر لیں گے۔“ شینزل نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ تکلیف کی لہر نے اسے واپس سیدھا لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

”نہیں میں ٹھیک ہوں تم مجھے سنو اور اس پر عمل کرو۔“ اس نے ساری بات اس کے گوش گزار دی۔ نشاء بہت توجہ سے اسے سن رہی تھی۔ بات کے اختتام پر اس نے شانے ڈھیلے کرتے ہوئے کہا۔

”میں تو پہلے ہی کہتی تھی قیس سر قاتل نہیں ہیں۔ انہیں پھنسا یا جا رہا ہے۔“ شینزل نے اس کی بات کی تردید کی، وہ کہہ رہی تھی جو کہ یہ تھا۔

”ابھی یہ بات حتمی طور پر کنفرم نہیں ہوئی ہے کہ قیس اس سب میں ملوث نہیں ہے۔ مجھے بس ایک واجب آئی ہے جس کی میں تصدیق چاہ رہی ہوں۔ تم مجھے دو دن میں احد کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر کے دو، میں جاننا چاہتی ہوں وہ شیطان کا پیروکار ہے یا نہیں۔“

نشاء کے دماغ میں سوچ کا ایک کوندالپکا جسے اس نے لفظوں کا جامہ پہنا دیا۔

”میم ہو سکتا ہے احد ہی کلپرٹ ہو، ہم اس پر شک کر سکتے ہیں۔“ شینزل نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ جس سمت مڑ رہی تھی اسی سمت مسائل و پریشانیاں آ جاتی تھیں۔ احد کو وہ بہت عرصے سے بہت اچھے سے جانتی تھی۔ اس کے خاندان کے ہر فرد سے غائبانہ طور پر متعارف تھی۔ رحمت کتنی اچھی تھیں، متقی و پرہیزگار، احد کتنا اچھا پریکٹسنگ مسلم تھا پھر اس کے گھر سے ٹرائے اینگل کی کتب کا ملنا اور وہ کمرہ، شیطان کی عبادت گاہ، اس کے سر میں درد اٹھ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ وقت بتائے گا نشاء کہ کون کیا ہے۔“ آنکھیں بند کرتے کرتے وہ اس سے کہہ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے غنودگی میں جا رہی تھی۔ ☆

☆.....☆.....☆

نور کی تھال کھینچے ایک سفید خوبصورت حویلی بڑی شان سے سراٹھائے کھڑی تھی۔ اس کی دیواریں سفید سنگ سے ڈھکی تھیں۔ ستون بلند و بالا تھے اور زمین سبزے سے ڈھکی ہوئی۔ پتھروں سے بنے کارپورج میں ایک جیپ کے ٹائر آ کر چرچرائے تھے۔ آنے والے نے اپنی آنکھوں سے گلز اتار کر گریبان میں اٹکائے اور مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اندر کی اور بڑھنے لگا۔ اس کے قدم ہلکے گرے رنگ کے پتھروں سے ڈھکے پورج میں مضبوطی سے جھے اٹھ رہے تھے۔ پورج کے اختتام پر تین سیڑھیوں کو ایک ہی جست میں پھلانگ کر وہ مین ڈور کے قریب آیا۔ جو بہت بڑا تھا۔ مصری کشیدہ کاری اس شہد رنگ دروازے کو بڑی دل فریب بنا رہی تھی۔ گارڈ نے اس کے آتے ہی دروازہ وا کیا۔ وہ اندر آیا۔ فینسی لائٹس نے پورے لاؤنج کو منور کیا ہوا تھا۔ وہ اس قیمتی جگہ کو چھوڑ دائیں جانب مڑا۔ وہ ایک راہداری تھی۔ جس کے

انتہائی دائیں جانب ایک کمرہ واقع تھا۔ وہ اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ مرروال کے قریب ایک گرے بالوں والا انسان پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کا سوٹ سفید تھا اور سفید ہی واسکٹ تھی۔ مرروال کے دائیں بائیں آسمانی رنگ کے بھاری پردے نو عمر بچی کے بالوں کی پونیوں کی طرح گرے ہوئے تھے۔ آنے والا دو منٹ وہاں کھڑا رہا پھر انہیں پکارا۔
 ”آپ نے بلایا تھا بابا۔“ جہانگیر مڑے، گرے جیل سے جے بال، آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور گرے ہی داڑھی۔

”وعلیکم اسلام۔ اس کے چہرے کے خطوط پر نگاہ ڈال کر انہوں نے خود کو دراز کرسی پر بٹھایا۔ قیس پشت پر ہاتھ باندھے، تھوڑی سی ٹانگیں کھولے کھڑا تھا۔ ان کے جواب پر مبہم سا مسکرا دیا۔

”سنا ہے آج کل وہ آپ کے ساتھ ہے۔“ بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ قیس کو حیرانگی نہیں ہوئی۔

”ایسا ہی ہے۔ آپ کے جاسوسوں نے صحیح اطلاع دی ہے۔“ جہانگیر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ کھڑا رہا۔

”کیوں؟“ اس نے شانے اچکا دیے۔

”یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔“ وہ انہیں چپ کروا گیا تھا۔ جہانگیر نے چند ثانیے کا پاز لیا پھر کچھ سوچ کر بولے۔

”آپ کو ہمارے توجہ دینی چاہیے۔ اب وہ آپ کی بیوی ہیں۔“ قیس نے ان کی بات درمیان میں قطع کی۔ ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔

”اچھے سے جانتا ہوں میں بابا، سب کو میں نے ان کے مقام پر رکھا ہوا ہے۔ عدل کا پلڑا

برابر ہے۔ ایک جانب جھکا ہوا نہیں۔“ وہ تاہنوز اسی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ ہاتھ پشت پر باندھے، تھوڑی سے ٹانگیں کھولے۔

”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن سیٹھ صاحب، انسان کو ہمیشہ اپنی غلطیوں سے سیکھنا چاہیے۔ آپ کی پہلی شادی ناکام گئی دوسری میں چاہتا ہوں پائیدار رہے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔ توازن قائم رہے تو ہی بہتر ہے۔“ مرروال کے باہر گارڈن تھا جو اس وقت مصنوعی لائٹس سے روشن تھا۔ اس نے ایک بار پھر سے شانے اچکا دیے۔

”آپ فکر نہ کریں ایسا ہی ہوگا۔“ جہانگیر آنکھیں چندھایائے اسے تکتے رہے پھر انہوں نے لب کھولے تھے۔

”جبکہ میں سمجھتا ہوں شیزل کے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا۔“ قیس کے ماتھے پر دو بل آئے تھے۔ اسے ان کی بات ناگوار گزری۔

”تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے چہرے کے ساتھ ساتھ آواز کو بھی بالکل سپاٹ کر لیا تھا۔ ماتھے پر دو بل ابھی تک موجود تھے جو جہانگیر کی بات سے اپنی موجودگی میں اضافہ کر گئے۔

”فاصلہ۔“

”یعنی موت۔“ وہ ٹھٹھکتے ہوئے چپ ہوئے، خود کو بولنے کیلئے آمادہ کیا۔ حیرت میں ڈوبے الفاظ ہوا میں بکھر کر قیس کی سماعت سے ٹکرائے جو کہ یہ تھے۔

”شیزل سے۔“ وہ رکے کچھ دیر کو تھمے۔ ”اب بھی پیار ہے آپ کو؟“ قیس کی گردن کی ہڈی اوپر نیچے کو ہوئی، مرروال سے جھانکتے گارڈن پر نظر جمائے وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ میں ہوں۔“ پھر اس نے جہانگیر کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔ ”خود

سے کب کسی کو نفرت ہوئی ہے۔“ اس کا جواب لا جواب کر دینے والا تھا۔ جہانگیر سر کو ہلا گئے۔

”آپ کے خلاف جو محاذ چل رہا ہے اس کے بارے میں کیا کہو گے۔“ اس کے وجود میں بے چینی پھیل رہی تھی وہ نہیں جانتا تھا ایسا کیوں ہو رہا ہے لیکن اس کا دل ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تنگ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے پشت پر بندھے ہاتھوں کی مٹھی کو مزید مضبوطی دی۔

”کچھ بھی نہیں کیونکہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ جہانگیر نے یو ایس بی نکال کر جھک کر میز پر رکھی۔ قیس نے ایک نظر یو ایس بی پر ڈالی پھر واپس انہیں دیکھنے لگا جو کہہ رہے تھے۔

”اس میں تمام ثبوت ہیں جو آپ کے خلاف ہیں۔ ایک پل کو میں بھی دیکھ کر چونک گیا تھا۔ سمیت شینزل، حیدر کا بھی یہی کہنا ہے کہ قاتل آپ ہو اس لیے میں چاہتا ہوں آپ سچ بتا دو۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کسی کی مدد کر رہے ہو یا یہ آپ کا کوئی پرسنل معاملہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سب کچھ جانا ہے کیونکہ آپ جانتے ہو آنے والے الیکشنز میں میری جگہ آپ ہی کھڑے ہونے والے ہو اور اس کیلئے آپ کا ریکارڈ صاف ہونا لازم ہے۔ آپ سمجھ رہے ہو میری بات۔“

قیس نے ہاتھ کھولے، انہیں ڈھیلا چھوڑ کر لٹکایا پھر چھوٹے قدم اٹھاتا سنگل سیٹر پر جا کر بیٹھ گیا۔ کہ اب اس میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔

”میں بے قصور ہوں بابا، چاہے شینزل کہے یا حیدر انکل میں نے کسی کو نہیں مارا بس ایک قتل کیا تھا، کس کا یہ آپ اچھے سے جانتے ہیں۔“ جہانگیر کے کہنے پر انہیں چائے پیش کی گئی تھی۔ قیس نے اپنے باپ کو دیکھا جو اس پر اندھا یقین کرتے تھے۔ وہ چائے کی چسکی بھرتے ہوئے تکلیف دہ سوچوں کے گرداب میں پھنس گئے۔

”ہاں جانتا ہوں۔“ جھریوں زدہ چہرے پر بڑھا پا عود کر آیا۔ ”پرکاش آپ قاتیل کے

نقش قدم پر نہ چلتے۔“ ان کی سرگوشی قیس کی سماعت سے با آسانی ٹکرا گئی۔ اس نے نہ لب کاٹے اور نہ ہی دانت پیسے وہ ویسا ہی ٹھس بیٹھا رہا جیسے پہلے بیٹھا تھا، بے چین دل کے ساتھ بے چین روح کے ساتھ۔

”اگر مجھے دوبارہ موقع ملے تو میں پھر سے وہی کروں گا جو میں نے کیا تھا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔“ جہانگیر نے گہرا سانس بھرا۔ ان کے نتھنوں سے بھینی بھینی روز میری کی خوشبو ٹکرائی تھی۔ خوشبو خوشگوار تھی مگر احساس نہیں، سوچ اور احساس بہت تکلیف دہ تھے۔

”اس ٹاپک کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ تکلیف لینے اور دینے سے بہتر ہے ہم کوئی اور بات کر لیں۔“

قیس کی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی بالکل ویسے جیسے اس کا انداز سرد تھا۔ وہ جانتا تھا جہانگیر اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اس لیے اس نے سہولت سے بات کا رخ چنبچ کرنے کو کہا۔ اس فرار کے انتظار میں تو جہانگیر بھی تھے۔ اس کی بات بہت آسانی سے مان گئے۔

”حیدر کہہ رہا تھا۔“ ایک چڑیا رات کے اس پہاڑی ہوئی ان کے شیشے سے ٹکرائی تھی۔ آواز پیدا ہونے پر قیس نے نظریں اٹھا کر مرروال کو دیکھا جہاں مٹی رنگ کی چڑیا چونچ میں کچھ تنکے اکٹھے کیے پر مار رہی تھی۔“ آپ کو گرفتاری دینی ہوگی۔ معاملہ سنگین ہے اور آپ ان کی نظروں میں مجرم ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لیے ابھی آپ کا گرفتار ہونا بہت ضروری ہے۔“

قیس نے دیکھا وہ چڑیا بھکی نہیں تھی بلکہ وہ زخمی تھی۔ اس کے جسم پر واضح کھروٹے تھے جن میں سے خون رس رہا تھا۔ تنکوں کا وزن شاید اس کی بساط سے باہر تھا بھی وہ بل کھاتی ہوئی ان کے شیشے پر آگری۔

”لیکن میں کوشش کر رہا ہوں، معاملہ لین دین سے نبٹ جائے تو اچھا ہے، خاص کر میڈیا

کی نظروں سے دور رہے تو اور بھی اچھا ہے۔ مقتولوں کے والدین نے اور خاص کر حیدر نے ابھی تو شیورٹی دی ہے کہ میڈیا اس سارے قصے میں نہیں آئے گی لیکن دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔“ وہ چڑیا پھر سے پر مارنا شروع ہوئی۔ اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ تیسری باری میں وہ اڑ گئی۔ بساط سے بڑھ کر اللہ نے اسے طاقت عطا کی، ہمت و حوصلہ دیا تبھی وہ سرخرو ہوئی۔ قیس کے لبوں پر تبسم آیا تھا۔

”آپ کو بھی محتاط رہنا چاہیے۔“ وہ اپنے بیٹے کی محویت کہیں اور محسوس کر رہے تھے اس لیے چپ ہو گئے، بلا آخر تھک کر دس منٹ بعد انہوں نے قیس کو خود کی جانب متوجہ کیا تھا۔ جس کے چہرے کا رنگ انجانا تھا اور جس کے ہاتھوں کی مٹھیاں کھل کر بار بار بند ہو رہی تھیں۔ جہانگیر نے اسے پکار ڈالا۔

”قیس کہاں ہو آپ۔۔۔ قیس؟“ وہ یکنخت چونکا، جوتے کے اندر موجود پاؤں کی انگلیوں کو اس نے موڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب سی سچویشن میں تھا۔ عجیب سی انجانی سچویشن میں۔ ”جی بابا۔“ جہانگیر نے اس کے چہرے کو اچھے سے کھوجا، اس کی آنکھیں اس کی غائب دماغی کا پتہ دے رہی تھیں۔

”آپ نے سنا ہے جو میں نے کہا۔“ اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلایا۔ ”بالکل بھی نہیں بابا۔“ اس نے ایسے انداز میں کہا کہ جہانگیر کو اس پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ انہوں نے لبوں پر آئی مسکان روک دی۔

”آپ الجھے الجھے سے لگ رہے ہیں سب ٹھیک ہے۔“ ”ہوں۔۔۔ بابا۔“ وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا، ان کا ہاتھ اپنے بازو پر رکھا۔ ”دیکھیں میں ٹھنڈا ہو رہا ہوں نا۔“ پھر اس نے ان کے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ دیا، دل کی دھڑکن معمول

سے ہٹ کر تیز تھی۔“ اور میری ہارٹ بیٹ بھی فاسٹ ہے۔ بابا مجھے لگ رہا ہے۔“ اس نے جہانگیر کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں میں مرچیں لگنے لگیں۔“ کچھ ہو رہا ہے۔“ جہانگیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھایا ساتھ ہی میز پر رکھا بٹن بھی دبا دیا۔

”آپ پریشان ہو رہے ہو، ڈونٹ وری میں سب فکس کر دوں گا۔“ قمیض شلوار میں موجود کم بالوں والا ایک آدمی اندر اجازت لے کر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جو نہی اس نے بریف کیس کھولا قیس کو پتا چل گیا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ یہ ان کا فیملی ڈاکٹر نہیں تھا۔ وہ کچھ عرصے قبل ہی فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بابا نے نیا ڈاکٹر رکھا ہے ایسا اس نے سن رکھا تھا اور آج دیکھ بھی لیا۔

”اوپر کا دوسواور نیچے کا ایک سو دس۔“ وہ قیس کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کہہ رہا تھا۔ جہانگیر نے دلبرداشتہ انداز میں اپنے بیٹے پر نظر ڈالی جو ڈاکٹر کی دی ہوئی گولیاں کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سرخ دھاگے، اس کے وجود کی بے چینی، پہلے ہٹ دھرم بن کر کھڑے رہنا پھر اچانک جا کر بیٹھ جانا اور اس کی غائب دماغی، وہ کیوں نہیں سمجھے تھے۔ انہوں نے کیوں نہیں جانا تھا کہ ان کے بیٹے کی ٹانگیں اس کے وزن کو برداشت نہیں کر رہی تھیں اس لیے اپنی ضد سے ہٹ کر وہ بنا اصرار کیے خود بیٹھ گیا ہے۔ اس کی بدلتی رنگت سے وہ کیوں نہیں سمجھے تھے کہ اسے کچھ پریشان کر رہا ہے۔ کیا؟ وہ اچھے سے جانتے تھے۔

”ٹینشن نہیں لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے کہا نا سب ٹھیک کر دوں گا۔ آپ آرام کرو اب، اتنا ہائی بلڈ پریشر آپ کی صحت کیلئے اچھا نہیں ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو، کسے فون ملا رہے ہو، قیس واپس آؤ، قیس۔۔۔“ گولیوں کو نگلنے کے دو منٹ بعد ہی وہ فون نکال کر اسٹڈی سے باہر آیا اور شینزل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ بیل جا رہی تھی مگر وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس کے قدم

پہلے ہلکے تھے پھر ان میں غیر معمولی سی تیزی آئی۔ وہ کار میں بیٹھنے تک اس کا نمبر ڈائل کرتا رہا تھا۔ وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھی۔ بدترین خدشات اس کے دل میں جگہ بنانے لگ گئے تھے۔ اسٹیرنگ تھا مے لبوں کو کاٹتے ہوئے اس نے ایک آخری بار اس کا نمبر ٹرائے کیا تھا۔ اس بار دستک رو نہیں کی گئی۔ اس بار آواز کا در کھل گیا۔

”ہاں قیس، میں اس وقت بہت بڑی ہوں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“ عجلت میں الفاظ اس کی سماعت میں چھوڑ کر لائن کاٹ دی گئی تھی۔ ٹوں ٹوں کی آواز پر اس نے سر اسٹیرنگ پر ٹکا دیا۔ اسٹیرنگ پر جسے ہاتھ کی انگلیاں اس کی تھوڑی سے مس ہو رہی تھیں۔ فون تاہنوز کان سے لگا تھا۔ کچھ دیر اسی پوزیشن میں گزارنے کے بعد وہ پھر سے حویلی کے اندر گیا۔ اس بار وہ ڈاکٹر کے روم میں تھا اور اس سے اپنا بلڈ پریشر چیک کروا رہا تھا۔

”نارمل ہے، ٹیمپلٹس نے اپنا اثر دکھا دیا۔“ قیس ہولے سے مسکرا دیا۔

”صحیح کہا، اثر ہو گیا ہے۔“ وہ ایک اچھلتی نظر اس پر ڈال کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کی سیٹی کی مخصوص دھن حویلی کی درود یوار سے ٹکرا رہی تھی۔



رات کے سایوں میں ہاسٹل میں خاموشی کا راج تھا۔ قدموں کی آہٹیں بھی سنائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھی جب اس کے سیل فون کی بیپ بج اٹھی۔ اس نے اپنی متورم آنکھیں کھول کر دائیں جانب گردن کو ڈھلکایا۔ اس کے فون کی اسکرین پر ایک نام بار بار جگمگا رہا تھا۔ نام پڑھ کر اس کے گردن کی ہڈی اوپر نیچے ہوئی۔ اس نے گہرا سانس لیا تو تکلیف کی ایک لہر اس کی پسلیوں کے نیچے سے اٹھ کر پورے بدن میں پھیل گئی۔ اسے رونا آیا مگر وہ روئی نہیں آنسو پی گئی۔ اس نے خود کو بٹھایا تھا۔ وہ فون کر رہا تھا بار بار کر رہا تھا۔ وہ جانتی

تھی وہ اس کیلئے پریشان ہو رہا ہے۔ وہ جب اس کی طرف سے بہت زیادہ پریشان ہو جایا کرتا تھا تو یونہی اس کو فون کیا کرتا تھا۔ اس کی بے چینی اس کی مستقل مزاجی سے چھلکتی تھی۔ اس نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ یہ کال نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے گلا کھنکھارا اور خود سے بولنا شروع ہوئی۔ اس کی آواز نحیف اور لرزا ہٹ سے پر تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ یہ وہ نہیں تھی۔ یہ اس کی آواز نہیں تھی۔ فقط ایک گولی اس کو یوں کمزور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دوبارہ بولنے کی پریکٹس کی پھر وہی آواز، پھر ویسا ہی انداز۔ وہ جانتی تھی اچھے سے جانتی تھی کہ قیس سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے پکڑ لے گا۔ وہ جان لے گا کہ اسے کوئی مصیبت پیش آئی ہے اور اس وقت کی صورتحال میں اسے قیس اپنے ارد گرد ہرگز نہیں چاہیے تھا۔ اس لیے وہ بالکل بھی اس کا سامنا کیا اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بلا آخر فون اٹھا کر بار بار کی پریکٹس کے بعد وہ کہا جو وہ کہنا چاہتی تھی۔

”ہاں قیس، میں اس وقت بہت بڑی ہوں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“ کال منقطع کر کے اس نے فون بیڈ پر رکھا۔ دو تین گہرے سانس بھرے۔ خود کو ایک بار پھر سے نارمل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کچھ سوچ کر احد کو میسج کر دیا۔

”آریو اپ۔“ جواب فوراً سے آیا تھا۔

”ہم خیریت۔“ ایک نرس ٹرے میں دوائیں لے کر آئی تھی۔ شیزل نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر ہسپتال کے اصول توڑتے ہوئے موبائل نہیں رکھا۔

”تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“ میسج ٹائپ کر کے وہ نرس کو دیکھ رہی تھی جو اسے ہدایت کر رہی تھی۔ ”میم، بہتر ہوگا آپ آرام کر لیں۔ یہ آپ کی صحت کیلئے ضروری ہے۔“ وہ ان ڈائریکٹ موبائل کے استعمال کو ترک کرنے کا کہہ رہی تھی۔

شینزل نے موبائل کی میسج ٹون پر نظر اسکرین پر ڈالی جس پر لکھا نظر آرہا تھا۔

”صبح ملتے ہیں ابھی میں لاہور۔“ آگے کا جملہ کٹا ہوا تھا۔ وہ اتنا ہی پڑھ سکی تھی جتنا نوٹیفکیشن میں نظر آیا تھا۔ اس نے سیل فون تکیے کی سائیڈ پر رکھا پھر نرس کے ہاتھ سے ڈوز لے کر کھانے لگی۔ سر واپس تکیے پر رکھ کر اس نے چھت کو گھورنا شروع کیا تھا۔ وہ احد کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔ وہ اس واحد بچے لڑکے سے ملنا چاہ رہی تھی جو ابھی قتل نہیں ہوا تھا۔ اس کیلئے اس نے نشاء کا ساتھ لیا تھا۔ کمال نے بھی اسے جوائن کر لیا۔

”نشاء کی اچانک چھٹیوں کی درخواست وہ بھی پورے ہفتے کی نے مجھے ٹھٹھکا دیا تھا۔ یہ کبھی اتنی چھٹیاں نہیں کرتی پھر میں نے کنٹرول روم سے اسے ویڈیو کلپ کاپی کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے اس نے مجھے ساری بات بتادی۔ میم، بھلے آپ معطل ہیں مگر ہماری ٹیم ہمیشہ سے ہی ہے۔ مجھے افسوس ہے آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اس بات کی رازداری رکھوں گا اور۔“ اس نے گردن موڑ کر اپنے برابر کھڑی نشاء کو دیکھا پھر شینزل کی جانب رخ موڑ کر عزم سے کہنے لگا۔

”آپ کے ساتھ کام کروں گا، سچ اور جھوٹ کا پردہ ہم تینوں مل کر فاش کریں گے۔“ اس نے ان شاء اللہ کہا تھا۔

”اور اس لڑکے سے ملاقات کا ذمہ میرا، آپ کل اس سے مل رہی ہیں۔“ وہ مسکرا دی۔ اسے احساس ہوا جب وہ ناحق کسی کے پیچھے پڑی تھی تو کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے معطل کر دیا گیا اور اب جب اس کے دماغ نے ایک انجانے موڑ کی طرف قدم بڑھائے تھے تو رستہ خود بخود بنتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کہاں سے آرہی تھی وہ نہیں جانتی تھی معلوم تھا تو اتنا کہ بس وہ چلے جا رہی ہے۔ اگلے دن اس نے

ڈسچارج لے لیا تھا۔ ایک کافی شاپ میں وہ احد کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کا منہ کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو گیا۔ فارل سی ڈرینگ میں بالوں کو بکھیرے وہ اس کے عین سامنے موجود تھا اور اس کی بات سن کر بری طرح گنگ تھا کہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ اس کیلئے فکر مند ہوا، بے حد فکر مند۔

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا اور اتنی جلدی ڈسچارج کیوں لے لیا۔ تمہارا زخم تو ابھی کچا ہوگا۔ تم کیا کرتی پھر رہی ہو شیزل۔“ وہ اس کی آنکھوں کے نیچے پڑتے حلقے اور پہلی رنگت سے خائف ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کے بولنے کے انداز سے کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ فریمیسن یا پھر ایلومنائی ہو سکتا ہے لیکن اس کے کمرے میں موجود ڈرائے اینگل جس میں ایک آنکھ بنی ہوئی تھی اور شیطان کے پجاریوں کی عبادت گاہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔ وہ گمراہوں میں سے ہے۔ وہ صم، بکم عیسیٰ میں سے ہے۔ شیزل نے گلا کھٹکھارا اور کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں مضبوط ہوں اور یوں بھی کسی کے آگے میں نے دل ہلکا کرنا تھا سو کر دیا۔ تمہارا شکریہ تم میرے لیے آئے۔“ احد اٹھ کر اپنی کرسی اس کے قریب لایا یہی تو وہ چاہتی تھی۔ شیزل نے واٹس ایپ کھولی ہوئی تھی۔ اس نے نشاء کے نمبر پر انگوٹھے کا نشان بھیجا پھر واٹس ایپ کو نا محسوس انداز میں بند کر دیا، اتنے میں احد اپنی کرسی سے اٹھ کر اسے شیزل کی کرسی کے قریب لا رہا تھا۔

”تمہارے لیے کہیں سے بھی آ سکتا ہوں میں، کبھی بھی آ سکتا ہوں میں اور یہ ہم دونوں کے بیچ میں شکریہ وغیرہ کہاں سے آ گیا۔ تم مجھے حق سے کچھ بھی کہہ سکتی ہو شیزل۔“ شیزل کے دل نے مدھم لے میں دھڑکنا شروع کیا تھا۔ وہ لفظوں کا جادو گر تھا ایک لمحہ میں اپنے طلسم میں

کسی کو بھی جکڑ لیتا تھا۔ شیزل بھی اس کی قید میں جانے والی تھی مگر اس نے خود کو روک لیا۔ آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا اور حتمی انداز میں گویا ہوئی۔

”احد مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”ہاں پوچھو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ وہ پبلک پلیس میں بیٹھے تھے پھر بھی نا جانے کیوں شیزل کو تھوڑی سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے احد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور سوال کیا۔ اس نے نظریں نہیں ہٹائیں تھیں تاکہ آنکھوں میں چھلکتا تاثر ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔ وہ پوچھ رہی تھی جو وہ پوچھنا چاہتی تھی۔

”تمہارے کمرے میں دجال سے متعلق کتابیں کیا کر رہی ہیں اور وہاں ایک عبادت گاہ بھی ہے، کیوں؟“ وہ جو اس کی آنکھیں پکڑے بیٹھی تھی یکدم مایوس ہوئی کیونکہ وہاں نہ تو کوئی چونکاہٹ کا تاثر تھا اور نہ ہی بوکھلاہٹ کا عنصر وہ بہت عام سے انداز میں بہت نارمل طریقے سے اسے جواب دے رہا تھا۔

”کیونکہ وہ میری ریسرچ ورق کا حصہ ہے۔ تمہیں میں نے بتایا تھا نا ایک دفعہ کہ مجھے ماورائی دنیا اور ماورائی طاقتوں میں دلچسپی ہے۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کھوجنا چاہتا ہوں۔ میں نے صرف دجال پر ہی وقت صرف نہیں کیا بلکہ گوتم بدھ، ٹیان شینگدی، ازانامی، موگوائی، ابلیس اور بہت سارے ہیں جن پر میں کام کر چکا ہوں۔ آج کل دجال پر کام کر رہا ہوں اس لیے میرا روم اس حساب سے کنورٹ ہے۔ میں جس کے بارے میں ریسرچ کرتا ہوں اپنے کمرے کے اس حصہ کو اسی حساب سے ڈھال دیتا ہوں یہ میرے لیے بہت زیادہ نارمل ہے۔“ وہ اس کی لمبی تاویل پر دل کو ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ جو بوجھ اس کے کمرے کے حلیے کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا تھا وہ قدرے سرکا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا

کہ وہ احد کی طرف سے بالکل بری الذمہ ہو گئی ہے۔ وہ جس طرح قیس کے پیچھے پڑی تھی اب اس کے پڑ گئی ہے۔ بات کی گہرائی تک پہنچنا اس کی عادت تھی اور اپنی عادت کے ہاتھوں بری طرح مجبور تھی۔

”ہمم، تم نے بتایا تھا میں بھول گئی لیکن مجھے دھچکا ضرور لگا تھا۔ اس لیے تم سے یہ بات سن کر نا میں نے بہتر سمجھا لیکن میں پھر بھی پوچھنا چاہوں گی کہ دلنر ہی کیوں؟“

”کیونکہ وہ ڈارک ہوتے ہیں لیکن گہرے ہوتے ہیں۔ برائی، برائی کیوں ہے یا جاننا بھی تو ضروری ہوتا ہے نا۔“

احد کے واٹس ایپ پر میسجز آرہے تھے۔ ایک دو، دس اس نے زچ آ کر اپنا واٹس ایپ کھولا اتنے میں شیزل گلاس اٹھا کر منہ سے لگا چکی تھی۔ اس نے اپنا فون ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ میسج کھول کر پڑھنے کیلئے احد نے اسے گود میں ہاتھوں کے درمیان رکھا، رکھنے کے بعد لاک کھولنے لگا۔ شیزل نے گلاس میں پانی کے بہاؤ کو اپنے منہ کی جانب کیا اور گلاس کے شیشے میں سے ان ہندسوں کو دیکھنے لگی جو وہ فون پر لگا رہا تھا۔ وہ اکثر اپنا فون بجنے پر شیزل کو کہتا تھا کہ وہ اٹھالے کہ کس کی کال ہے۔ اکثر وہ شاپنگ کیلئے اس کے فون پر ویب سائٹس کو چیک کیا کرتی تھی مگر تب تک اس کے دماغ میں یہ نہیں تھا کہ اس نے واٹس ایپ کو لاک کیا ہوگا اور اس کے نوٹیفکیشن میوٹ کیے ہوں گے۔ آج اس نے قسمت آزمائی تھی۔ اس کا موبائل بیپ تو کر رہا تھا مگر اس پر کوئی بھی میسج نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کیلئے اسے واٹس ایپ کو کھولنا تھا۔ اس نے واٹس ایپ کا پاس ورڈ اینٹر کیا۔ شیزل نے گلاس کی سطح میں سے دیکھ لیا۔ اس نے وال اوپن کی شیزل نے ایک اور گھونٹ بھرا وہاں اسے نشاء کے میسجز کے بعد دو چیٹس چھوڑ کر ٹرائے اینگل کی ڈی پی والا گروپ دکھا تھا۔ اس نے گلاس کو میز پر واپس رکھ دیا۔ احد دو منٹ تک موبائل

میں مصروف رہا پھر واپس اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”پتہ نہیں کون ہے، صبح سے میسج کر کے پریشان کر رہی ہے کہ اسے سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بننا ہے۔ میں اسے گروپ میں ایڈ کر دوں۔ بھئی کوئی پوچھے کوئی سیکرٹ سوسائٹی کونسا گروپ اور کونسے ممبر، نان سینس۔“ اس نے فون میز پر پٹخ دیا۔ شیزل کا دل جھاگ کی طرح بیٹھا تھا۔ اگر وہ ذہین تھا تو بلا کا تھا اگر شاطر تھا تو انتہا کا۔

”تم ان باتوں کو چھوڑو بس اس پر غور کرو جو میں کہنا چاہ رہی ہوں۔ مجھے تمہاری کمپنی میں نوکری چاہیے۔ میری جاب کب تک بحال ہو کوئی پتا نہیں، میرے بہت سارے اخراجات ہیں جو اس وجہ سے رک چکے ہیں۔ تم نے ایک بار کہا تھا تم مجھے جاب دلواؤ گے تو کیا اب بھی تم ایسا کر سکتے ہو۔“ وہ اس کی نئی اور غیر متوقع بات پر متحیر ہوا۔ آج سے پہلے وہ جب جب اپنی کمپنی میں جاب کی بات کرتا تھا تو وہ بری طرح رد کر دیتی تھی مگر آج وہ خود اپنے منہ سے کہہ رہی تھی۔ اسے تعجب ہوا، تعجب سے زیادہ افسوس۔

”اس سے بہتر حل ہے میرے پاس۔“ اس نے کرسی مزید قریب سرکائی۔ اس کی آستین کو کلائی کے پاس سے تھام کر اس پر انگوٹھا پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم مجھ سے شادی کر لو۔“ اس نے شیزل کے کھلتے لبوں کو ہاتھ کھڑا کر کے بند کروایا وہ مزید کہہ رہا تھا۔

”وقت گزر رہا ہے ہمارا، وقت کے ساتھ ساتھ عمر بھی، ہم نے ہمیشہ جوان نہیں رہنا ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہ وقت نہیں دیکھنا ہے۔ زندگی بہت چھوٹی ہے اور معیاد بہت کم تو بہتر نہیں ہم اسے سکون سے گزاریں۔“ وہ باتوں کا جادو گر تھا وہ اس کے سحر میں آ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے پر۔“ وہ رک گئی۔ اس کے دماغ میں قیس آیا تھا اس کے دماغ میں اس کا کیس آیا تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو رہی تھی وہ اس کے لفظوں میں جکڑ رہی تھی۔

”پرور چھوڑ دو شیزل، یہ خون خرابہ، قتل و غارت، عداوتیں ذلتیں، ڈیوٹیز تم اس سب کیلئے نہیں ہو، یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ شک و شبہ چھوڑ دو، کون کس کو ختم کر رہا ہے۔ کون کلپرٹ ہے اس سب کو چھوڑ دو۔ تم ایک بہترین لڑکی ہو اور ویسی ہی زندگی ڈیزرو کرتی ہو۔ میں آج ماں سے بات کروں گا پھر کل صبح ہم شادی کر لیں گے۔ ٹھیک ہے؟“ وہ اثبات میں سر ہلا گئی تھی کیوں یہ وہ اچھے سے جانتی تھی۔

”میں ہاں تو کر دوں مگر۔“ اس کی بات ایک بار پھر سے رد کی گئی تھی۔ قطع کی گئی تھی۔

”تمہاری زندگی میں اتنے 'مگر' کیوں ہیں شیزل، یقین کرو جس دن تم نے ان وسوسوں کو ہٹا دیا اس دن تمہاری زندگی شیشے کی طرح صاف ہو جائے گی۔“ اس نے نامحسوس انداز میں پانی کا ایک اور گھونٹ بھرا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر، اس کی آواز کا اثر، وہ سراپا طلسم تھا۔ طلسم، کیا وہ واقعی شیطان کا پیروکار نہیں ہے۔ اتنا شائستہ، اتنا مہذب، اتنا نرم دل انسان اور شیطان کا پجاری۔ اس نے سوچا۔ دل نے بھرپور مذمت کی۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ جھٹک دو اس سوچ کو۔ ایک اور انسان پر بہتان نہیں لگاؤ۔“ اپنی سوچوں کو جھٹک کر وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔“ اس کے دماغ میں بہت سی سوچیں چل رہی تھیں۔ وہ سوچیں احد کی پہنچ سے بہت دور تھیں۔

بہت زیادہ دور۔

☆.....☆.....☆

کچھ سال پہلے۔

مارس مشن پر چار لوگ پرواز کرنے والے تھے۔ ان میں ایک پاکستانی بھی تھا باقی تین

دوسرے ملکوں کے تھے۔ اسپیس سوٹ میں خالی دماغ کے ساتھ وہ سیٹ بیلٹ باندھے بیٹھا تھا۔ ایک ہال کی دیواروں پر لگی بہت ساری اسکرینز پر وہ چاروں بڑے واضح نظر آرہے تھے۔ ان کی باڈی لینگویج سے لے کر پلکوں کی موومنٹ تک کونوٹ کیا جا رہا تھا۔ اسکرینز کے آگے بیٹھے ایک ایکسپرٹ نے کمپنی کے مینیجر کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اس نے چونک کر اس پاکستانی لڑکے کو دیکھا پھر ہاتھ کو جھلاتے ہوئے گویا ہوا۔

”تمہیں اس کا نہیں پتہ سر پھرا ہے وہ، کچھ نہ کچھ پلان کر رہا ہوگا اس لیے ایسے بیٹھا ہے۔ چل کرو۔“ وہ جس کے بارے میں چل کرنے کا کہہ رہے تھے وہ کچھ پلان نہیں کر رہا تھا۔ اس بار نہیں کر رہا تھا۔ اس بار وہ واقعی پریشان تھا۔ دلبرداشتہ تھا۔ سپانس اس کو لے کر مطمئن تھے مگر وہ نہیں تھا۔ یہ سفر اس کا آخری سفر ہوگا اور اس کے بعد وہ کبھی بھی ناسا کے ساتھ نہیں جڑ سکے گا۔ یہ بات وہ اچھے سے جانتا تھا۔ وہ اس وقت جذباتی اور جسمانی طور پر بری طرح تھکا ہوا تھا۔ اس کی تھکن اس کی ماں کی دین تھی ہاں اس کی ماں کی۔ اس کی بہن نے کہا تھا وہ سب جا کر مصباح سے پوچھے۔ اس نے پوچھا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھا تھا۔ اس نے سوال کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کیا تھا۔

”وہ لڑکی سراسر بہتان کا پیکر ہے۔ جھوٹ ہے۔ گناہ ہے۔ آپ اس کے جھانسنے میں نہیں آسکتے سیٹھ صاحب۔“ وہ اپنی شائستہ سی ماں کے منہ سے اتنے کڑوے الفاظ سن کر ششدر تھا۔ وہ عورت تھیں جتنی مرضی گھاک ہو جاتیں، بوکھلاہٹ عود پڑی تھی۔ عورت جذباتی یا دماغی طور پر جتنی بھی مضبوط ہو۔ اسے چاہے اپنے آپ پر بہت کنٹرول حاصل ہوتا ثرات اس کے چہرے پر چھلک ہی پڑتے ہیں۔ چاہے وہ لاکھ چھپانا چاہے سچ بول پڑتا ہے۔ آنکھیں چیختی ہیں اور چہرہ چلا اٹھتا ہے۔ یہی سب مصباح کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ قیس کو یقین نہیں آیا۔ وہ

جس نے کبھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب حقیقت کی گہرائی تک جانا چاہتا تھا۔ وہ سب سننا چاہتا تھا۔ خواہ وہ سچ ہو یا جھوٹ۔ اس نے مزید سچ اگلوانے کیلئے شعوری طور پر جینز میں انکی پائل نکالی اور اسے لوڈ کر کے کنپٹی پر رکھ دی۔

”حقیقت کیا ہے ماما یہ آپ مجھے بتائیں گی۔ اس نے کیوں نڈر ہو کر آپ کا نام لیا آپ سمجھائیں گی ورنہ سچ کہہ رہا ہوں یا تو آج یہ گولی چلے گی۔ نہیں تو ٹھیک تین دن بعد آپ کو فون آئے گا کہ آپ کا بیٹا خلاء میں کہیں کھو گیا ہے۔ میرا وجود بھی نہیں ملے گا آپ لوگوں کو اور یہ دھمکی نہیں ہے آپ اچھے سے جانتی ہیں مجھے۔“ نم آنکھیں، تیزی سے دھڑکتا دل، وجود کا ارتعاش۔ اس نے اپنے عقب میں جہانگیر کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔ وہ اپنی ماں کے آنسو سے بھی نہیں پگھلاتا تھا۔

”سیٹھ صاحب۔“ وہ بلی تھیں۔ قیس نے ٹریگر پر انگلی مضبوطی سے جمائی۔ ماں تھیں ماں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اپنی عزت سے زیادہ بیٹے کی زندگی عزیز تھی اس لیے جھٹ سے بول اٹھیں۔

”وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اسے بچپن میں بھی میں نے ہی اس گھر سے نکالا تھا اور بڑے ہو کر بھی میں نے ہی اسے بھیجا تھا۔“ منہ پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے انہوں نے اعتراف کیا تھا۔ قیس کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کے ارد گرد دھماکے ہونے لگے تھے۔ کان سائیں سائیں ہوئے اور وقت جیسے تھم گیا۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا۔ بالکل بھی نہیں آرہا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی بے حد دشواری۔

”وہ کسی کو پسند نہیں کرتی تھی کسی کو بھی نہیں، جب مجھے پتہ چلا جہان اس کی اس لڑکے سے شادی کروا رہے ہیں جسے میری بھانجی چاہتی ہے تو آپ سے پہلے میں اس تک پہنچی تھی۔ میں

نے اسے کہا تھا تم اس رشتے سے انکار کر دو یا اس لڑکے کا نام لے دو جو میری بھانجی کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ آوارہ ہے۔ اوباش ہے۔ کبھی بھی سیٹھ صاحب آپ کی اس سے شادی پر نہیں مانیں گے اور زبردستی بھی کسی سے نہیں کریں گے یوں تمہیں بھی وقت مل جائے گا اور وہ رشتہ بھی یہاں سے ٹل جائے گا پھر میں اپنی بھانجی کا نام لے دوں گی۔ اس نے ایسا ہی کیا، اس نے میری بات مانی۔“ پستول چھوٹ کر اس کے ہاتھ سے نیچے گری تھی۔ پستول کے ساتھ ہی وہ بھی گھٹنوں پر آگیا کہ اس کے پاؤں میں کھڑارہنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے عقب میں موجود جہانگیر پتھر کا بت بن گئے تھے۔ جو سانس لے سکتا تھا اور نہ ہی کوئی حرکت کر سکتا تھا۔ بے جان پتھر کی مورت۔

”پر آپ لوگ نہیں مانے، میں نے اسے کہا تم نکاح کے وقت انکار کر دینا وہ نہیں مانی، میں نے کہا سیٹھ صاحب سے یہ سب کہو اس نے کہہ دیا۔ اس رات میں نے اسے گھر سے جانے کیلئے بہت اکسایا تھا۔ وہ نہیں گئی۔ اسے تمہاری اور اپنے جہان بابا کی عزت میری لعنت ملامت سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے کہا وہ مرجائے گی مگر ان دونوں کی عزتوں پر آنچ نہیں آنے دے گی۔“ مصباح نے اپنے گال رگڑے۔ آج اعتراف کا دن تھا۔ آج سزا کا دن تھا۔ قیس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سب جیسے پانی ہو گیا۔

”پھر میں نے رات کے آدھے پہر اسے بات کرنے کیلئے بلایا۔ میرے وفادار ملازموں نے جہانگیر کے وفادار ملازموں کو کچھ وقت کیلئے منظر سے ہٹا دیا تھا۔ حویلی کے کیمرے بھی بند کر دیے تھے تاکہ سارا مدعا نین پر ہی آئے۔ وہ حویلی کے باہر آئی تھی مجھ سے بات کرنے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی اس کے یہ قدم پھر کبھی اس حویلی میں نہیں پڑیں گے۔ میں نے میری بھانجی کا پیچھا چھوڑنے پر اس اوباش لڑکے کو نین سپرد کر دی تھی۔ اس روز نین بھاگی نہیں تھی بلکہ اغواء ہوئی تھی۔“

اسے بری طرح جھٹکا لگا تھا۔ وہ خیالوں سے چونک اٹھا۔ دس سے لے کر الٹی گنتی شروع ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے برابر بیٹھے ساتھیوں کو دیکھا پھر کان میں پڑتی آواز سنی۔
 ”قیس آریو او کے؟“

”لیس سر۔“ جواب دینے کے بعد اس نے آنکھیں پھر سے غیر مرئی نقطہ پر جمالیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ خطوط آرہے تھے جو اسے مصباح نے دیے تھے۔
 ”میرے پیارے بھائی، میں گھرے سے نہیں بھاگی ہوں، نہیں جانتی تم یقین کرو گے یا نہیں پھر بھی تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے مصباح ماما نے کسی غنڈے کے حوالے کر دیا ہے۔ اس نے زبردستی مجھ سے نکاح کر لیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت ظالم ہے۔ بہت برا ہے۔ مجھے بہت مارتا ہے۔ اس کے پاس اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہیں۔ نہیں جانتی وہ کون ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ ہے۔ تم بس مجھے اس سے بچالو، مجھے ایسی زندگی نہیں چینی۔“ اس نے سر کو جھٹکا وہ اپنے حواسوں میں رہنا چاہتا تھا مگر رہ نہیں پا رہا تھا۔ گنتی اب دو تک پہنچ چکی تھی۔ تین پر راکٹ نے برق رفتاری سے زمین کو چھوڑا تھا۔ جھٹکا اتنا زیادہ تھا کہ دماغ ہل کر رہ گیا تھا۔ اسپید کے زیر اثر ان چاروں پر غنودگی چھانے لگی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے قیس کے دماغ کو اسکرین پر دیکھ کر صدا لگائی۔

”زیرو نائن کا دماغ اس وقت جذباتی طور پر بہت الجھا ہوا لگ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ اس سفر کیلئے ابھی تیار نہیں ہے۔ اسے ری پلیس کر دینا چاہیے۔“ سپانسر کے ایک ممبر نے گردن موڑ کر ہوا میں برق رفتاری سے اڑتے راکٹ کو دیکھا پھر اس نے اپنے الفاظ منتشر کیے۔

”اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ کل تک کی اس کی میڈیکل رپورٹ بالکل ٹھیک تھی یہاں تک کہ کچھ گھنٹوں قبل تک کی بھی ہم نے اسے ہی لے کر چلنا ہے۔ سمجھے۔“ اس پر ڈھیر سارا پیسہ لگا

تھا وہ کیونکر اسے اباٹ کر دیتے یوں بھی اس لڑکے کی قابلیت سے ہر ایک واقف تھا۔ جذباتی طور پر ایسے سفر پر جانے سے پہلے انسان کمزور ہو جاتا ہے تو کیا ہوا اگر وہ ہو گیا۔ اس میں کوئی بڑی بات تو نہیں تھی۔

”پیارے بھائی۔“ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے دماغ میں پھر سے الفاظ ابھرے تھے۔

”میں نہیں جانتی تھی مصباح آنٹی مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہیں کہ مجھے یوں گند میں پھینک دیں گی۔ میں نے تمہیں ہزار خط لکھے مگر مجھے کسی کا جواب نہیں ملا۔ تم نہیں جانتے کتنے کانٹوں پر چل کر میں یہ خط پوسٹ کرواتی ہوں۔ اس کے بعد کتنی مار کھاتی ہوں۔ اب تو مجھے لگتا ہے جیسے میں زندہ ہی نہیں ہوں۔ تم نہیں جانتے پر میں یہاں کی اذیت جانتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم مجھے یہاں سے آزاد کروالو۔ میں تمہاری بری طرح منتظر ہوں۔ میرے بھائی مجھے آکر یہاں سے چھڑوالو۔“ اس کی آنکھ سے ایک قطرہ ٹپکا تھا۔ اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔

”قیس، پلیز قیس مجھے یہاں سے لے جاؤ، مجھے یہاں سے بچالو، یہ لوگ انسان نہیں ہیں۔ یہ شیطان کے پجاری ہے۔ یہ سب ایلو منائی ہے۔ مجھے بھی وہی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کل مجھے پاکستان سے لے جائیں گے۔ میں نے بہت مفرور ہونے کی کوشش کی مگر ہر راہ بند ہے۔ جو عورت میری خطوط پوسٹ کروانے میں مدد کرتی تھی انہوں نے اسے بھی غائب کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے مگر میں اتنا جانتی ہوں تم ضرور آؤ گے، پلیز میرے اس خط کا جواب دے دینا۔ فون تمہارا بند ہے۔ جہانگیر بابا کا نمبر بھی بند ہے اور گھر کا نمبر بھی نہیں لگ رہا۔ آنٹی کا فون بھی بند ہے پلیز مجھ پر زندگی بند نہیں کرو۔ پلیز میری مدد کیلئے آ جاؤ۔“ اس کی آنکھیں آدھی سے زیادہ بند ہو چکی تھیں۔ دماغ مکمل طور پر سکون میں آ گیا تھا۔ وہ اپنے

ساتھیوں کی نسبت بہت بعد میں بے ہوش ہوا تھا۔ لیکن جب وہ ہوش میں آیا تھا تو سب جاگے ہوئے تھے۔ وہ اپنے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ اس کی ایک کلنگ نے مسکراتے ہوئے اسے دس کیا تھا جس کا جواب مسکراہٹ سے ہی دینے کے بعد وہ فریش ہونے گیا۔ فریش ہونے اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد وہ اپنے دو کلنگز کے ساتھ اسپیس شپ سے باہر کسی چیز کو فکس کرنے گیا تھا۔ اس کے ساتھی نے اسے کہا۔

”مجھے لگتا ہے تم کچھ پریشان ہو، کیا میں درست ہوں؟“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ہک اٹکا کر وہ اس کے سہارے شپ پر قدم مضبوطی سے جما کر چل رہا تھا۔ اسے اپنا دماغ اپنے قابو میں رکھنا تھا مگر اس سے یہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک تو خلاء کا بھاری پن اوپر سے پچھتاؤں کی چنگاریاں۔ اسے اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ میں پھر سے الفاظ گونج اٹھے۔

”قیس یہ کل مجھے بوہمن گروولے کر جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنادیا ہے۔ میں شرک نہیں کر سکتی۔ مجھے مشرکین میں شامل ہونے سے بچالو۔ پلیز اب تو میری مدد کردو۔ میری التجا سن لو۔ میں کس کو پکاروں۔ کسے کہوں۔“ کتنی آس تھی اس کے لفظوں میں۔ کتنی بیچارگی تھی اس کی پکار میں۔ اس نے ایک بار پھر سے سر کو جھٹکا۔ اسے پتہ نہیں کیوں کم نظر آنے لگ رہا تھا۔ ہک کو کھول کر وہ اگلی راڈ میں لگا رہا تھا مگر لگا نہیں پار رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی جو اس سے کافی دور تھا اسے یوں دیکھ کر اچنبھے میں مبتلا ہو گیا۔ یہ وہ قیس نہیں تھا جس کے ساتھ وہ پہلے بھی کام کر چکا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی قیس تھا جو بالکل اناڑی لگ رہا تھا۔

”قیس الہی اور جہانگیر الہی اگر آپ دونوں میں سے کوئی بھی یہ خط پڑھ رہا ہے تو میں آپ دونوں سے کہنا چاہوں گی کہ آپ دونوں میرے لیے مر چکے ہو۔ مجھے آپ دنوں سے شدید

نفرت ہے۔ میں نے آپ دونوں کو ہر مشکل دور میں پکارا مگر کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے اندر آپ جیسے بے حس لوگوں کا خون ہے خیر میں آج خودکشی کر رہی ہوں کیونکہ جتنے گناہ مجھ سے سرزد ہو گئے ہیں وہ سب جہنم میں جانے کیلئے کافی ہیں تو پھر میں عذاب بھری شرک والی زندگی کیونکر بسر کروں۔ میں اس سے نجات حاصل کر رہی ہوں۔ آج ایک آخری بار میں بھاگنے کی کوشش کر رہی ہوں یا تو ماردی جاؤں گی یا خود مر جاؤں گی لیکن ہاں تم لوگوں کو معاف نہیں کروں گی۔ میری موت کے ذمہ دار تم سب ہو گے۔ میں تم سب پر فاتحہ پڑھ چکی ہوں میرے لیے تم سب مر گئے اور جان لینا آج کے بعد میں بھی مر گئی۔“

اس سے ہک ٹھیک نہیں لگا تھا اس لیے اس نے جیسے ہی اپنا وزن ڈالا ہک راڈ سے باہر نکل آیا۔ حادثہ ایک سیکنڈ میں پیش آیا تھا۔ ڈھنی خلفشار کے باعث اسے سمجھنے میں خود کو سنبھالنے میں، جھنجھوڑنے میں وقت لگا۔ جب تک وہ حواس میں آیا تھا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ برق رفتاری سے خلاء کی گہرائی میں گر رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے چلا کر اس کا نام پکارا تھا۔

☆.....☆.....☆

لا رغبۃ لہ فی الامن والسلام

فمقصده ہوا الفوضی فحسب

”امن اور آشتی سے اس کو کیا،

اس کا مقصد تو انتشار میں ہے۔“

”کہاں ہو؟“ رات کی گہری تاریکی میں جب جھینگروں کی آواز بڑی واضح سنائی دیتی

ہے۔ جب چاند غائب ہوتا ہے اور تارے افسردہ ہاں اسی رات میں وہ سیاہ آسمان تلے زخمی زخمی سی بیٹھی اسے میسج کر رہی تھی جس سے وہ بے انتہا محبت کرتی تھی۔ جواب فوراً آیا تھا۔ سنگی

بیچ پر وہ تنہا بیٹھی تھی۔ سڑک ویران تھی بالکل اس کے دل کی طرح، درخت خاموش تھے بالکل اس کے لبوں کی طرح، فون کی اسکرین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ کر اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی کو واضح کر رہی تھی۔ جواب آیا تھا جو یہ تھا۔

”گھر، تم کہاں ہو۔ آؤں؟“ آنسو مسکراہٹ کے ساتھ گال پر پھسلا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا پھر ٹائپ کرنے لگی۔

”نہیں۔“ میج بھیجنے کے بعد اس نے پھر سے ٹائپ کیا۔ ”تمہاری یاد آ رہی تھی۔“

”سچ میں؟ حیرت ہو رہی ہے۔“

نمکین پانی کی بوندیں مسلسل اس کے گال پر ٹپک رہی تھیں۔

”میں تمہیں یاد کر سکتی ہوں یہ بات تم جانتے ہو۔“

”اوکے، میں بہت خوش ہوا ہوں یہ سن کر انفیکٹ بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ تم بتاؤ آئی

کیوں نہیں آج، میں نے تمہارا کمرہ بھی صاف کر دیا تھا۔“

شیزل نے لبوں کو دانتوں میں جکڑا۔ یہ آنسو روکنے کی ایک معمولی سی فضول سی سعی تھی۔

”میں اب وہاں کبھی نہیں آؤں گی۔“ اس کے آنسو فون کی اسکرین پر گر رہے تھے۔ وہ

اپنی بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر موجود اس بیچ پر بیٹھی تھی جس پر اکثر آ کر بیٹھا کرتی تھی۔ آج اس

کی روح زخمی ہوئی تھی۔ آج وہ بری طرح ٹوٹی تھی۔

”کیوں؟“ تھوڑے سے توقف کے بعد جواب دیا گیا تھا۔ اس نے لکھا جو وہ کبھی نہیں

لکھنا چاہتی تھی۔

”کیونکہ میں شاید شادی کر رہی ہوں، احد کے ساتھ۔“ طویل وقفے کے بعد اس نے میج

بھیجا تھا۔ جیسے وہ اس بات کا یقین نہیں کر پا رہا ہو جیسے وہ اپنے آپ کو یقین دہانی کر رہا ہو کہ

یہ بات اس نے ہی کہی ہے۔ اس کا جواب آیا تھا۔ دلدوز جواب۔

”اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ وہ فون پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ دلجمعی سے رونے کے بعد اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جو سیاہ اور تاریک تھا۔ اس کی تھوڑی کانپ رہی تھی اور آنکھوں میں شکوہ تھا۔

”روکو گے نہیں مجھے۔“ جواب اس بار بھی فوراً ہی آیا تھا۔

”کوشش کی تھی مگر شاید۔۔۔“ سیل رواں جاری تھا۔ اس کا دل کٹنے لگا۔

”میں مذاق کر رہی تھی۔“ اس نے روتے روتے لکھا پھر متورم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔“ ہاں یہ بات سچ ہے کہ اس نے مجھے پرپوز کیا تھا۔ اس نے کہا تھا میں کل اس سے نکاح کروں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، میں ایسا نہیں کروں گی۔“

”حد ہوتی ہے۔ تمہارا سینس آف ہیومردن بہ دن بہت گھٹیا ہوتا جا رہا ہے اب مجھے کال یا مزید میسج نہیں کرنا۔ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے اور اس سے زیادہ نیند سوشٹ اپ اینڈ شب بخیر۔“ شب بخیر، اس کی نگاہیں شب بخیر پر تھم گئیں۔ کیا اس کی زندگی میں مزید کوئی ”خیر“ آ سکتی تھی۔ کیا وہ کبھی ایک نارمل زندگی جی سکتی تھی۔ ایک بالکل سادہ عام لڑکیوں والی زندگی؟ شاید نہیں کیونکہ وہ شیرل تھی۔ اس کی زندگی میں کچھ بہتر اور اچھا نہیں ہونے والا۔ وہ ہمیشہ مشکلوں میں ہی گھری رہے گی اسے یقین تھا اس بات کا، وہ مایوس ہو رہی تھی سخت مایوس، آنسوؤں کے سیلاب کے ساتھ مایوسیوں کی سونامی نے اس کو خود میں غرق کر دیا۔ رات کے دو بجے سنسان سڑک پر تنہا بیٹھی وہ قیس کو یاد کر رہی تھی۔ اپنے دوستوں کو یاد کر رہی تھی۔ اپنی بیٹی کو یاد کر رہی تھی۔ اپنی موت کو یاد کر رہی تھی۔ شام ہوئی اس آخری لڑکے کے ساتھ ملاقات کو یاد کر رہی تھی۔ جس نے اس کے آگے اس کی موت کا باب کھول کر رکھ دیا تھا۔ جس نے بتا دیا تھا کہ

اب اس کی زندگی کی معیاد بہت تھوڑی ہے۔ وہ گھورا اندھیرے میں اپنے گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اس سوچ میں وہ لڑکا اور وہ خود ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ لڑکے سے پوچھ رہی تھی۔

”ہم دونوں پہلے بھی ملے تھے لیکن اس وقت تم خوف کے باعث چپ تھے۔ مگر میں چاہتی ہوں اس بار ایسا نہ ہو۔ اس بار تم میرے ساتھ کا پریٹ کرو کیونکہ یہ تمہاری زندگی کیلئے بے حد ضروری ہے۔ دیکھو میں اب جو سوال کرنے والی ہوں تم سے اس کا تم نے بہت سوچ سمجھ کر صحیح جواب دینا ہے۔“ اس نے اس لڑکے کی طرف دیکھا جو پہلے تو اس سے ملاقات پر راضی نہیں تھا پھر جب راضی ہوا تو بہت تذبذب کا شکار لگا۔ یہ ان دونوں کی خفیہ ملاقات تھی جو کمال نے ارنج کروائی تھی۔ آئی جی یا کسی کو بھی اس ملاقات کا علم نہیں تھا۔ اس لیے وہ بہت محتاط تھی حد سے زیادہ محتاط۔

”تمہارے چار دوست مر چکے ہیں۔ ان چاروں کا سارا ریکارڈ صاف تھا۔ کوئی ایف آئی آر ان کے نام نہیں کٹی تھی۔ وہ ہر قسم کی بد امنی سے دور تھے فقط ایک کے کہ تم لوگوں نے نہرین کا ریپ کیا تھا اور اس کے خلاف بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ تم اس چیز کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ یہ ضرور تم لوگوں کا کام نہیں ہے۔ کوئی بہت بڑی طاقت ہے جو تمہاری پشت پناہی کر رہی تھی۔ وہ طاقت کون ہے بتا سکتے ہو۔“ لڑکے نے پہلو بدلا، سردی میں اس کے ماتھے پر پسینہ چمک اٹھا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے ہکلا گیا۔

”کک، کوئی طاقت؟“

”میسن یا پیرامٹ؟“

(میسن یعنی فریمیسن ایک بین القوامی یہودی تنظیم ہے۔ یہ لوگ نعوذ باللہ دجال کو ماننے

والے ہوتے ہیں۔ پہلے اس کے ممبرز بیس برس سے زیادہ عمر کے لوگوں پر مشتمل ہوتے تھے مگر اب اس تنظیم کو بڑھانے کیلئے طاقت ور پارٹیوں یعنی کسی بھی ملک کے امراء چاہے ان کا شمار سیاست دانوں میں ہو، بینک سے ہو یا پھر کسی بھی بڑے عہدے سے، ان سب کو اس کمیونٹی کا ممبر بنایا جا رہا ہے۔ یعنی آپ لوگ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ امریکہ کا صدر جارج واشنگٹن اور گوئٹے، ونسٹن چرچل، موزارٹ، پیٹر، آسکر وائلڈ اور والٹ ڈزنی بھی اس تنظیم کا حصہ رہ چکا ہے۔ بظاہر تو یہ سوشل رابطوں اور فلاحی کاموں، فلاحی اداروں، خیراتی اداروں اور یتیموں کی تعلیمی اداروں کی تنظیم ہے۔ بظاہر یہ خفیہ سلسلہ اخوت ہے۔ خیرات کرنے کا ان کے اراکین نے اوتھ لیا ہوتا ہے۔ ان خیراتی اور فلاحی اداروں کی آڑ میں مسلم دشمنی نبھانا ان لوگوں کا وطیرہ ہے۔ یعنی وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے مشن پر ہوتے ہیں۔ ان کا قتل عام کرتے ہیں اور ان کا جینا حرام کرنا سانس لینے کے برابر ہے ان کیلئے۔ یہاں تک کہ سی آئی اے میں بھی میسن کافی تعداد میں موجود ہیں۔ عراق، چینیا، افغانستان اور بوسنیا میں جتنے بھی فوجی دستے بھیجے جا رہے ہیں۔ ان میں کافی تعداد میں فریمین شامل ہوتے ہیں تاکہ یہ مسلمانوں کے ساتھ دل کھول کر ظلم کر سکیں اور آپ اور ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایسا کر رہے ہیں۔ گوانتانامو بے میں جو ظلم مسلمانوں کے ساتھ ڈھائے جا رہے ہیں وہ انہیں لوگوں کی نفرت کا ثبوت ہیں جو دجال کو اپنا خدا مانتے ہیں۔ جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ دنیا بھر کے یہودی اور ان کا ایک مقصد یعنی بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کیلئے مسجد القصی کے احاطے کو تباہ کرنا ہے۔ اپنے عہد نامے کے آرٹیکل 28 میں حماس کا کہنا ہے کہ ”فری میسنری، روٹری اور اسی طرح کے دیگر گروہ صہونیت کے مفاد میں اور اس کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں۔“

ان کی ہدایت کیا ہے؟ یہی کہ وہ مسلمانوں پر جتنا سانس ہوا اتنا ظلم ڈھائیں۔ انہیں مارنے میں بالکل بھی کوتاہی نہ کریں اور وہ ایسا کر رہے ہیں۔ فلسطین آپ لوگوں کیلئے اس چیز کی جاویدہ مثال ہے۔ اس کے آگے کچھ ہے ہی نہیں جو بیان کیا جائے۔ جس کا حوالہ دیا جائے۔ فری میسن آج تک اپنے ڈھائے گئے مظالم میں رنگے ہاتھوں نہیں پکڑے گئے ہیں۔ وہ دہشت گردوں اور افواج کے کندھوں پر بندوق رکھ کر اپنا ہدف حاصل کرتے ہیں۔ ان لوگوں کیلئے یہ فارسی شعر پر فیکٹ فٹ جاتا ہے کہ ”چورا تا دیدہ دلیر ہو چکا ہے کہ ہاتھوں پر چراغ رکھ کر پھرتا ہے اور پھر بھی پکڑا نہیں جاتا۔“

لیونیکسل نامی پادری نے 1885 میں اپنے عبادت کے دن یعنی کہ اتوار والے دن فری میسن کے خلاف چرچ میں تقریر کی تھی۔ انہوں نے میسنری کو شیطان کا آلہ کار کہا تھا۔ جو بکری کے سروالے جنگلی جانور کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے لاج میں ”کول“ کا نشان بنائے وہ دو سینگوں والی انسانی جسم نما بکری ان کا خدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ درمیان کی دوا انگلیوں کو فولڈ کر کے باقی چھوٹی اور شہادت کی انگلی کو کھڑا نہیں کرنا چاہیے کہ یہ شیطان کے پجاریوں کا سمبل ہوتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے سروں کو ڈھانپ کر اور مرد داڑھی رکھ کر یہ بات دنیا کے سامنے واضح کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی کول کا سائن بنا کر بتاتے ہیں کہ وہ کس کو ماننے والے ہیں۔

صحیح حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے جب کوئی شخص سایہ میں بیٹھا ہو پھر وہ سایہ جاتا رہے (یعنی اس پر دھوپ آجائے) اور اس کے جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ سائے میں ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ (وہاں سے) اٹھ کھڑا ہو (اور بالکل سایہ میں جا بیٹھے یا بالکل دھوپ میں) اس لیے کہ کچھ سایہ اور کچھ دھوپ میں بیٹھنا شیطان کا کام ہے۔“

یہ کول کے سائن میں جو دو سینگ ہیں وہ شیطان کو ظاہر کرنے کیلئے ہیں کہ وہ برسوں قبل جب کھڑا ہوا تھا تو اس کے سینگوں کے درمیان میں سے سورج پھوٹ رہا تھا۔ اسی وجہ سے ہی فجر کی نماز پوپھٹنے کے بعد پڑھنے سے منع فرمائی گئی ہے۔ اچھا ہم پادری کی طرف تھے۔ تو ہوا یوں کہ اپنی اس تقریر کے بعد وہ بہت مشہور ہو گیا اتنا کہ اس وقت کے پاپائے اعظم نے اسے خود سے ملنے کے دعوت پیش کی۔ بارہ سال گزر گئے۔ پادری صاحب کیا کر رہے تھے کہاں تھے کچھ نہیں پتا۔ ٹھیک بارہ سال بعد پاسا پلٹا۔ ہوا یوں کہ ٹیکسل نے ایک مذہبی اجتماع میں یہ اعتراف کیا کہ اس نے فری میسن پر جتنے بھی الزام لگائے تھے وہ سب فرضی تھے۔ من گھڑت تھے اور اس کے دماغ کی تشکیل تھی۔ یعنی بارہ سال تک وہ اتنا نارچہ میں رہا۔ اسے اتنا مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی 4380 دن قبل کی تقریر کے سارے موقفوں سے پیچھے ہٹ گیا۔ اگر اس کے دوست اور خیر خواہ اسے ہال سے باہر نہ نکالتے تو ضرور غیظ و غضب سے مغلوب ہجوم اسے مار ڈالتا۔ یہ واقعہ سنانے کا مقصد صرف اتنا ہے تاکہ آپ یاد رکھ سکیں فری میسن اور ایلو منائی اپنے ممبر یا فرد کو کبھی نہیں بخشتے چاہے بارہ سال گزر جائیں یا بارہ صدیاں۔

یاد رہے فری میسن کی شناخت ”ایپرن“ ہے۔ امریکہ، برطانیہ، روس، جرمنی، بھارت یا کوئی بھی ملک ہو وہاں کسی بھی قسم کی مذہبی مجلس ہو، پارلیمنٹ کا اجتماع ہو، کوئی بھی رویال گید رنگ ہو اور اس میں بوڑھا، جوان، مرد یا عورت نے کپڑوں کے اوپر ایپرن پہنا ہو اور گلے میں چین کے ساتھ لٹکتا ٹرائے اینگل کے درمیان ”جی“ کا حرف ہو تو سمجھ جانا یہ بندہ یا بندی شیطان کے پیروکار ہیں اور اس بات کا برملا اظہار بھی کر رہے ہیں۔

اب آتے ایلو منائی کی طرف، یہ ایک روشنیوں کی تنظیم ہے جس میں شمولیت اختیار کرنے کیلئے اس تنظیم کے ممبران کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ یعنی اگر اب آپ کسی کا انٹرویو سنیں جس

میں وہ کہہ رہا ہو کہ بھی مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ مجھے تو میسج آیا تھا کہ کیا تم نے سیکرٹ سوسائٹی کا حصہ بننا ہے تو میں نے کہہ دیا ہاں وائے ناٹ، تو یہ سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے۔ کیونکہ سیکرٹ سوسائٹی کبھی بھی خود کسی کو نہیں بلاتی جو بھی جاتا ہے اپنی مرضی سے اس کا ممبر بننے جاتا ہے۔ اور اس کا ممبر بھی صرف وہی بنتا ہے جو تھوڑا انگڑا ہو یعنی مال و دولت ہو یا پھر معاشرے میں اس کی اچھی ساکھ ہو، عزت ہو، اثر و رسوخ ہو۔ پہلے اس کا ممبر بننے کیلئے تین درجے پار کرنا ہوتے تھے۔ ان درجات میں کیا ہوتا تھا یہ میں یہاں نہیں لکھ سکتی۔ بعد میں یہ درجات بڑھا کر تیرہ کر دیے گئے۔ اب ان درجوں میں کیا کیا ٹاسک دیے جاتے ہیں یہ بھی قلم بند کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ وہ بہت ہی غیر اخلاقی اور روح کو جھنجھوڑنے والے ٹاسک ہوتے ہیں۔ جب تک ایلومنائی کا فرد تیرہ شرائط پوری نہیں کرتا تب تک وہ مکمل طور پر اس تنظیم کا حصہ نہیں بنتا ہے۔

ایلومنائی میں شامل ہونے کیلئے انہیں ان کا لٹرچر مہیا کیا جاتا ہے جن کی رپورٹ انہیں بعد میں مرتب کرنی ہوتی ہے۔ اور ہر اس لٹرچر کے بارے میں بتانا ہوتا ہے جو وہ پڑھ چکے ہیں۔ اپنی تمام کمزوریاں بتانی ہوتی ہیں۔ اپنے دشمنوں کے نام لکھنے ہوتے ہیں۔ اپنا ہر گناہ قلم بند کر کے انہیں تھمانا ہوتا ہے اور اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ شیطان یعنی ابلیس نئے ممبر کا ہر جھوٹ پکڑ کر تنظیم کے پرانے ممبرز کو بتا دیتا ہے۔ پھر آگے کھائی ہوتی ہے اور پیچھے کنواں، اوتھ آف سیکری یعنی رازداری کا حلف لیا جاتا ہے اور جو زبان کھول دیتا ہے پھر وہ اور اس کا خاندان لقمہ اجل بن جاتا ہے۔ یہ ہے ایلومنائی دی سیکرٹ سوسائٹی، آئی آف پروویڈننس ان کا علامتی نشان ہے جس میں ایک تگون کے اندر آنکھ بنی ہوتی ہے۔ یہ نشان مختلف گر جاگھروں، فری میسن عمارتوں اور یہاں تک کہ امریکا کے ایک ڈالر کے نوٹ پر بھی بنا

ہوتا ہے۔ یہ نشان فری میسن کے ساتھ ساتھ ایلومنائی کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس گروپ کی دنیا بھر میں نگرانی کرنے اور سب کو قابو میں رکھنے کا علامتی نشان ہے۔ ہمارے ایمو جیز میں نیلے رنگ کی ایک آنکھ جو ہے وہ شیطان کی آنکھ ہی ہے۔ بعض کم علم لوگ اس کو نظر نہ لگنے سے تشبیہ دیتے ہیں جبکہ یہ دجال کو ریپرینٹ کرتی ہے۔ اس لیے اس ”کول“ والے ایمو جی کی طرح اس ایک آنکھ والے ایمو جی کا استعمال بھی نہیں کرنا چاہیے۔

”کک، کونسی طاقت؟“ لڑکا ہکھلایا۔

”میسن یا پیرامٹ؟“ اس نے دوبارہ سوال کیا تھا۔ لڑکے کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے گھبرا کر پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ آدھا اس کے گریبان میں گر رہا تھا اور آدھا حلق میں۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے۔ تم جواب نہیں دو گے تو میں تمہیں بچاؤں گی کیسے۔“ لڑکے نے پانی ختم کر کے گہرا سانس لیا۔ گلاس کو مضبوطی سے تھامے وہ کہہ رہا تھا۔

”تم مجھے ویسے بھی نہیں بچا سکتی۔ بہت عرصے تک میں ویسے بھی نہیں بچ سکتا۔“ اس نے آواز کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھے پھر قدرے آگے کوچھکی۔

”فری میسن یا ایلومنائی؟“ ایک لفظی جواب آیا، شرمندگی و ندامت میں ڈوبا جواب۔

”ایلومنائی۔“ شینزل کے گلے میں کچھ پھنس گیا۔ اس نے اپنی کمر کو واپس کرسی کی پشت پر ٹکایا تھا۔ پر تعش کمرے میں وہ دونوں اس وقت تنہا تھے پھر بھی تنہا نہیں تھے کیونکہ خاموشی کچھ دیر کیلئے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وقت سرکا، ایک منٹ، دو منٹ، چار منٹ، چوتھے منٹ کے اینڈ پر شینزل نے خود پر قابو پالیا تھا۔ وہ اس سے سوال جواب کرنا شروع ہو چکی تھی کہ آخر وہ یہی کرنے آئی تھی۔

”مجھے تفصیل جانی ہے۔ دیکھو تم مجھ پر یقین کر سکتے ہیں۔“ وہ اس پر یقین کر چکا تھا تبھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع ہوا۔

”میں اور میرے دوست چھٹیاں منانے کیلی فورنیا گئے ہوئے تھے۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ شیزل نے چپکے سے ریکارڈنگ کا بٹن آن کیا اور اسے سننے لگی جو مزید کہہ رہا تھا۔

”ہمارا پلان اگلے سال جانے کا تھا لیکن مہران کی منگیتر قدرتی طور پر مر گئی تھی۔ وہ اس وجہ سے بہت ڈپر یسڈ تھا۔ دونوں کی منگنی بچپن میں طے ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر اس کی اچانک موت نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ ہماری کمپنی یوں بھی اچھی نہیں تھی مگر اس واقعے کے بعد مہران اور زیادہ بھٹک گیا۔ ایک دن اس کے ڈیڈ نے ہمیں بلا کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کو کہا۔ ہم نے ویسا ہی کیا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں مہران کی ملاقات ایک ڈچ لڑکے سے ہوئی جو اس کی طرح ہی بہت زیادہ ڈرنک کرتا تھا۔ ہم کیلی فورنیا میں خوش تھے۔ آزاد گھوم رہے تھے اور مہران کو بھی اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے لیکن ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ مہران ہمارے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کے ساتھ بھی رہنے لگا ہے۔ ایک دن جب وہ بہت رات تک واپس نہیں آیا تو ہم اس بار میں گئے جہاں وہ اپنا غم غلط کرنے جایا کرتا تھا۔ وہ اور ڈچ لڑکا دونوں کہیں جانے کی تیاریوں میں تھے۔“

”تم لوگ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے سوال کیا تھا جبکہ وہ کی بیک پیک کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”تم لوگ کہیں دور جا رہے ہو؟“ اس نے اسی تجسس میں سوال کیا، عبید کے ماتھے پر ہل پڑ گئے وہ مہران سے کہہ رہا تھا۔

”یار تم دو دن کے ملے لڑکے پر کیسے یقین کر سکتے ہو، تم نے ہمیں بتانا گوارا نہیں سمجھا جبکہ

ہمارا ساتھ عرصوں پر مشتمل ہے۔“ وہ آگے آیا تھا۔ اس عجیب و غریب پھیکے شلجم جیسی رنگت، چھوٹی چندھی ہوئی آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹوں والا لڑکا چیونگم چباتا ہوا ان مشرقیوں کو دیکھ رہا تھا جو ماڈرن تو تھے مگر بے وقوف بھی تھے۔ الٹی کیپ پہنے چیونگم چباتے ہوئے وہ بالکل بھی وقت کے ضیاع سے محفوظ نہیں ہو رہا تھا۔

”دیکھو میری بات غور سے سنو، اس نے کہا ہے وہ مجھے تباہ (مہران کی منگیترا) سے ملوا سکتا ہے۔ اس کیلئے مجھے اس کے ساتھ تھوڑا لمبا سفر کرنا ہوگا۔“ عبید اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بیچ میں کود پڑا، اس نے شدید تردید کی۔

”یار تو پاگل ہو گیا ہے۔ تباہ مرچکی ہے۔ یہ کیسے تجھے اس سے ملوا سکتا ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے لوٹ لے گا تجھے۔“ مہران کے چہرے پر یکخت سنجیدگی پھیلی، اس نے آنکھوں میں ان دیکھا قہر ڈال کر چبا چبا کر کہا۔

”دنیا کیلئے مر گئی ہے لیکن میرے لیے زندہ ہے اور اگر اسے دیکھنے اس سے بات کرنے کیلئے مجھے خود کو لٹوانا بھی پڑے تو میں ہچکچاؤں گا نہیں۔ تم لوگ چل رہے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں جا رہا ہوں۔“

شینرل لبوں پر قفل لگائے اس لڑکے کو سنے جا رہی تھی۔ اس کا ہر لفظ فون میں محفوظ ہو رہا تھا۔ ہر واقعہ حفظ ہو رہا تھا۔

”اس رات ہم اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ بہت لمبا سفر طے کیا تھا ہم نے، چھوٹے جنگل پائے، نہر اور پہاڑی کراس کی اس کے بعد ہم وہاں پہنچے تھے۔ وہ جگہ جو جنگل کے بیچ و بیچ پہنچنے سے قدرے پہلے تھی۔ وہاں درختوں پر الوؤں کے لکڑی کے مجسمے بنا کر لٹکائے گئے تھے۔ وہاں تختوں پر انجانی زبان میں نا جانے کیا کچھ درج تھا۔ وہاں کچھ لوگ موجود تھے جو

چرچ کی طرز کے بیچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بیچ کافی بوسیدہ شکل کے تھے مگر حقیقت میں بہت مضبوط تھے۔ جلی ہوئی لکڑی کو چھیل کر انہیں بنایا گیا تھا۔ چار ایک سائیڈ پر تھے اور چار دوسری سائیڈ پر اور ایک اسٹیج کے عین سامنے۔ اسٹیج پر ایک مرد سیاہ چوغے میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے سیاہ پردہ تھا۔ اس مرد نے چوغے سے اپنے سر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد سفید تھیں یہاں تک کہ ریٹینا کے رنگ میں بھی سفیدی چھلک رہی تھی۔ ماتھے پر اس نے ایک تار باندھ رکھی تھی۔ وہ تار قدرے موٹی تھی تبھی سلور رنگ کی اس تار پر سیاہ حروف سے کچھ لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی کی ناک میں باریک تار تھی اور انگلیاں پتلی پتلی دراز جیسے کہ لڑکیوں کی ہوا کرتی ہیں۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بتا رہا تھا۔ شیزل نے اس کا استغراق محسوس کر لیا۔ اسی وجہ سے وہ دل میں اٹھتے سوال اگلے وقت کیلئے ٹال رہی تھی۔ وہ اسے سن رہی تھی جو محویت سے کچھ بتانے میں مگن تھا۔

”وہ جس اسٹیج پر بیٹھا تھا وہ بھی جلی ہوئی لکڑی سے بنا تھا۔ اسٹیج کے اوپر ایک بڑا سارا الو پر پھیلائے آنکھیں نکالے بیٹھا تھا۔ ویسا ہی پرندہ ہر ایک کے بیچ پر بنا تھا اور وہاں کچھ تحریر تھا۔ میں نے اور وہی نے جب اس تحریر پر انگلیاں پھیریں تھی تو ہمیں جھرجھری محسوس ہوئی تھی۔ ہم اس آدمی کو سن رہے تھے جو کسی کا مدعا بڑے غور سے سننے کے بعد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ فریاد کرنے والا اسٹیج کے عین سامنے موجود بیچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

”تمام طاقتیں مسیحا کے نام، تمام عظمتیں مسیحا کے نام۔“

”یہ شاید اس کا ڈائیلاگ تھا۔ اس نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو پردے پر سوال کیلئے حاضر آدمی کی زندگی فلم کی طرح چلنے لگی۔ ہم سب حیران تھے۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا یہ سب ہو رہا ہے۔ مگر وہ سب ہو رہا تھا۔ وہ اس کی پچھلی زندگی دکھانے کے بعد اگلی پانچ منٹ کی زندگی دکھا

گیا تھا جس میں خرم چھینکتا ہوا نظر آ رہا تھا تب جب وہ بندہ واپس اپنی سیٹ سنبھال رہا تھا تو وہی ہوا، خرم عین اسی لمحے چھینکا جب وہ آدمی اپنی سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ ہم نئے تھے کچھ اور بھی نئے تھے۔ وہ سب حیران ہوئے باقی کوئی نہیں ہوا۔ مہران جا کر مدعے والے بیچ پر بیٹھ گیا۔

”اپنی منگیتر سے ملنے آئے ہو، ٹھیک ہے میں تمہیں اس سے ملوا دیتا ہوں۔“ وہ آدمی کیسے جانتا تھا کہ ہم اتنی دور سے اتنی مشقت اٹھا کر مہران کی منگیتر سے ملنے آئے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کچھ پڑھ کر مہران پر پھونک دیا۔ اس کے بعد وہ پردے کی اور نظر کر بیٹھا۔ ہمارا اضطراب اس وقت شک میں بدلا جب تباہ پردے کے پیچھے سے نکل کر آئی تھی۔ اس سے باتیں کر کے اسے اپنے ساتھ لے کر کہیں چلی گئی۔ ہمیں یقین نہیں آیا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے مگر یہی حقیقت تھی۔ ہم شیطان کے بہکاوے میں آ گئے تھے اور مزید آنے والے تھے۔ مہران وہاں روز جانے لگا۔ وہ تباہ سے روز ملتا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ حقیقت میں ہے۔ وہ پاکستان واپس نہیں جاسکتی تھی۔ وہ یہیں رہ سکتی ہے اس لیے مہران نے بھی وہیں رہنے کی ٹھانی۔ اس نے کہا تھا وہ اس کے ساتھ ہر قسم کا رشتہ استوار کر چکا ہے۔ اب وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ پھر ایک دن ہمیں کہا گیا۔“

”اگر تم لوگ دنیا میں مالدار، شہرت یافتہ اور معاشرے میں اپنا ایک اعلیٰ مقام پانا چاہتے ہو تو خود کو شفاف کرلو، ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“ وہی کو بھی یہاں لت لگ گئی تھی۔ یہاں ہر قسم کی آسائش تھی۔ شراب شباب سب تھا تبھی سب سے پہلے وہ مانا تھا اور اس کے بعد ہم سب بھی۔

”سیٹن کو بے باکی پسند ہے، سیٹن (شیطان) کو آزادی پسند ہے۔ سیٹین کو آسمان، زمین، جھرنے، پہاڑ، چرند پرند پسند ہیں۔ سیٹین کو بہار، بار، شراب، شباب پسند ہے۔ ڈیمنز اپنی

کرنا جانتے ہیں۔ اپنی ذات میں خوش رہنا جانتے ہیں۔ یہ دنیا اور آسائشات ہمارے لیے بنائی گئی ہے۔ عورتوں پر ہمیں پورا حق حاصل ہے جیسے چاہیں انہیں استعمال کریں۔ یہ زمین ہمارے قدموں کیلئے ہی بنائی گئی ہے جیسے چاہیں اسے روندیں۔ ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ ہر حدود کو کراس کریں، ہر بند توڑ دیں کہ رکاوٹ ہماری خلقت کا شیوا نہیں ہے۔ کہ کوئی پیر ہمارے لیے نہیں ہے۔ کہو کہ ہم آزاد ہیں۔ کہو کہ ہم آزاد ہیں۔“

”اس روز ہم پانچوں شیطان کے پیروکار بن گئے تھے۔ ہمارے جذباتوں کو ابھارا گیا۔ ہمیں باور کروایا گیا کہ ہم ہر قید و بند سے آزاد ہیں اور وہ کم عمر لڑکے جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے تھے۔ بہک گئے۔ ہمارے گلے میں ایک چین پہنائی گئی تھی جس پر ایک آنکھ بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ابھی ہم ناپاک ہیں۔ ہمیں سیٹن کو راضی کرنے کیلئے تیرہ درجے پار کرنے ہیں۔ اگر ہم نے وہ کر لیے تب ہمیں وہ ایک خاص پانی سے نہلا کر صاف کریں گے اور اس کے بعد ہماری ملاقات حقیقی ابلیس سے کروائیں گے تب تک ہم اس دنیا کی طاقت و شخصیت بن چکے ہوں گے۔“ اس لڑکے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو چکے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے گھناؤنے اعتراف کر رہا تھا۔ شیزل کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ لب آپس میں پیوست تھے اور چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ۔

”وہ تیرہ درجے بہت غلاظت بھرے تھے۔ ہم نے، ہم نے بہت سی معصوم جانوں کی بلی شیطان کے مجسمے کو چڑھائی۔ بہت عزتیں لوٹیں بہت تباہی مچائی۔ ہم گند میں اتر گئے مزید اترتے اگر جو ہمیں دسویں درجے پر جھٹکانہ لگتا۔ ہم سب بوہمن گروو (وہ جگہ جہاں ہر سال جولائی کے اوائل یا آخری دنوں میں پوری دنیا کے فریمینس اور ایلومنائی اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس روز تقریب رکھی جاتی ہے جس میں شیطان کو انسانی خون چڑھایا جاتا ہے۔ انسانی جان کا

نظرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ تھرڈ درجے کے گناہ کیے جاتے ہیں۔ غلیظ حرکتیں ہوتی ہیں اور عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اگلے سال پھر سے اسی جگہ اکٹھے ہوں گے۔ بارک اوباما اور امریکا کے بڑے بڑے پالیمنٹران، میوزک انڈسٹری کے بہت بڑے بڑے نام، فلم انڈسٹری کے لوگ، سیاستدان، بزنس مین، ورلڈ بینک غرض ہر امیر کبیر وہاں موجود ہوتا ہے) کی تقریب میں شامل تھے۔ ہم نے شیطان کو خوش کرنے کیلئے وہاں برے برے کام کیے مگر صبح وہاں سے جانے کے بعد جو ٹاسک ہمیں دیا گیا اس نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ انہوں نے کہا ہم اپنی بہن اور ماں کے ساتھ۔“ وہ چپ ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا پھر بات وہیں سے جوڑی۔

”وہ چاہتے تھے ایسا کرنے کے بعد ہم اپنی ماں اور بہن کو ان کے سامنے پیش کریں۔ مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ مر کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہر ٹاسک کو مکمل کرنے کے بعد ہمیں ہزاروں کی تعداد میں ڈالرز دیے جاتے تھے۔ بے تحاشہ دولت سے نوازا جاتا تھا یہ کہہ کر کہ شیطان ہم سے خوش ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سوشل میڈیا پر ایک سیلبرٹی کی طرح مشہور ہو گئے۔ واثق امید تھی ہمیں ہالی ووڈ سے پیشکش آتی۔ مگر سویں ٹاسک کو کرنے بعد جو دی جانے والی رقم انہوں نے ہمیں بتائی تھی وہ آدھی دنیا خریدنے کیلئے کافی تھی۔ بقول ان کے پاکستانی خاص کر مسلم بیمار ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کو یہ ٹاسک اس لیے بہت اینڈ میں دیا جاتا ہے تاکہ باقی ٹاسک پورے کر کے وہ اس چیز کے عادی ہو جائیں مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مہران کو تباہ چاہیے تھی مگر وہ اس ٹاسک کو کرنے کا اہل بھی نہیں تھا۔ بلا آخر وہ ہم سب کے فورس کرنے پر وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ وہاں سے بھاگ کر آنے کے ٹھیک چالیس دن بعد ہمیں بلیک میل کیا جانے لگا۔ ہمارے سارے گناہوں کی ریکارڈنگ

ان کے پاس تھی۔ وہ ان کے پاس کیسے تھی کس طرح سے انتہائی خفیہ جگہوں پر کئے گناہ کا ثبوت ان تک پہنچا ہم نہیں جانتے تھے۔ مگر ہم ان کے ڈراوے میں نہیں آئے۔ کیونکہ ہم جانتے تھے وہ ہمیں منانے کی آخری حد تک کوشش کریں گے تبھی انہوں نے ہمیں ہماری برائیاں اور خامیاں گنوائی شروع کیں۔ سوشل میڈیا کا ڈر دیا۔ اکاؤنٹس فریز کر دیے۔ شہرت ختم ہو گئی۔ منٹوں میں ہم خاص سے عام ہو گئے۔ ایسے جیسے کبھی کہیں تھے ہی نہیں، ہمارے فینز جانے کہاں چلے گئے۔ ہماری بلندیاں جانے کہاں چلی گئیں۔ ہم نے اپنے فون بند کر دیے بلکہ بدل لیے۔

مہراں تباہ سے ملنے کیلئے پاگل ہو رہا تھا تب ہم اسے نارمل کرنے کیلئے ایک مفتی کے پاس گئے۔ اسے سب ماجرہ بتایا۔ اس نے جو کہا جو دکھایا وہ یقین سے کہیں پرے تھا۔
 ”جس لڑکی سے تم ملے ہو وہ دراصل تمہاری منگیتر نہیں ہے۔ وہ ایک شیطان ہے جو چاہتی ہے تم اس کی قید میں آ کر راہ راست سے ہٹ جاؤ، تمہاری منگیتر اس وقت مٹی تلے ہے تو سوچو جب وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے مری ہے تم نے ہی اسے قبر میں اتروایا ہے تو وہ واپس کیسے آ سکتی ہے۔ وہ شیطان کے پیروکار ہیں۔ وہ تمہارے سامنے تمہیں بھی لا کر کھڑا کر سکتے ہیں۔ ان کیلئے یہ بہت نارمل بات ہے۔“

”یہ حقیقت تھی ایسا ہی ہوتا۔ ہم نے باہمی مشاورت سے گھر آ کر اپنے والدین کو سب سچ بتا دیا تھا۔ ان سے معافی بھی مانگی تھی بس مہراں سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے خود کے ساتھ ہوئی ہر چیز کو سوشل میڈیا پر شیر کر دیا۔ اس نے تباہ اور اپنی ملاقاتوں کے بارے میں بتایا۔ وہ جس کی وجہ سے تباہ سے ملا تھا ان کے بارے میں بتایا۔ شیطان کے پیروکار کیا کرتے ہیں کیا کیا کرواتے ہیں۔ بوہمن گرو میں کیا کیا ہوتا ہے سب بتا دیا۔ اس نے تو سب کہہ دیا تھا مگر وہ

یہ نہیں جانتا تھا اس کے اس عمل سے ہماری جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔“ شیزل نے پہلی بار مداخلت کی۔

”لیکن تم لوگوں کے بارے میں تو کوئی بھی ایسا مواد سوشل میڈیا پر نہیں ہے۔“ وہ لڑکا مجروح مسکان لبوں پر لے آیا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ ان چیزوں کا بانی اس طرح کا مواد رہنے دے گا۔ آپ کو لگتا ہے وہ لوگ اپنی باتیں اچھلنے دیں گے؟“ سوال میں جواب تھا۔ شیزل نے آنکھیں بند کر کے گردن ٹیڑھی کر لی۔

”تم نے کہا تم نے ان کی سرمنی اٹینڈ کی تھی اور وہاں ہر ایک سے ملے تھے۔ میں تمہیں کچھ تصاویر دکھاتی ہوں اگر ان میں سے کوئی ہوا تو کیا تم مجھے بتا پاؤ گے؟“ اس لڑکے نے حامی بھری۔ شیزل اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھی اور موبائل میں سے ایک ایک کر کے تصاویر نکال کر اسے دکھانے لگی۔ وہ ہر تصویر کو رد کر رہا تھا مگر ایک پر چونک گیا، جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں خوف ملے اچنبھے کا عنصر غالب تھا۔

”یوں تو ہم ایک دوسرے کے حقیقی ناموں سے واقف نہیں ہوتے نہ ہی درجوں سے بس فرضی نام سنتے ہیں مگر، مگر میں نے اسے اس سرمنی میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑے رینک والے بندے کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس بندے کے کندھے پر رینک کا جو بیج تھا اس سے ایک رینک کم اس کے بھی تھا۔ مجھے اس لیے یاد ہے کیونکہ یہ واحد مشرقی تھا جو مجھے وہاں ملا تھا۔ ہم سب کو ملا تھا۔“ شیزل کے کان میں سیٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ الفاظ غیر مفہوم سے لگے۔ اس کے دل نے بری طرح ہچکولا لیا تھا۔ حلق سے لفظ غائب ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر گنگ رہی، افسردہ رہی پھر کانپتی انگلی کا اشارہ تصویر کی جانب کر کے بولی۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ تصویر کو زوم کر رہی تھی۔ انگلیوں کی لرزاہٹ واضح تھی۔ لڑکے نے اپنی بات پر زور دے کر دوبارہ کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ یہی تھا کیا تھا اس کا فرضی نام۔“ وہ دماغ پر زور ڈال رہا تھا پھر یاد آنے پر جھٹ سے کہنے لگا۔

”ہاں یاد آیا جیری، جیری تھا اس کا فرضی نام۔“ شینزل کو لگا وہ پاتال میں جا گری ہے۔ اس کے آس پاس، دائیں بائیں ہر جگہ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کے دل میں گھٹن بھر چکی تھی سانس روکنے والی گھٹن۔

”وہی قتل کر رہا تم سب کو اور اس لیے کیونکہ یہ لوگ صدیوں بعد بھی یاد رکھتے ہیں۔“

اس نے سرگوشی کی تھی۔ بہت مدھم سی سرگوشی۔

☆.....☆.....☆

رات کے پہرہ شینزل کے میج پڑھ کر تھوڑا چونکا تھا مگر خیر تھی۔ یہ چھوٹا سے ہی تھی کہ وہ جب چاہے اسے بلا سکتی ہے۔ آواز دے سکتی ہے۔ تنگ کر سکتی ہے۔ اسے ناک تک عاجز کر سکتی ہے۔ یہ ڈھیل فقط شینزل کیلئے ہی تھی کیونکہ وہ اسے بہت عزیز تھی۔ اس کے دل کا حصہ تھی۔ اس کی روح تھی۔ اس کی زندگی تھی۔ اس کا سب کچھ تھی۔ میج پڑھنے کے بعد اس نے خود کو بیڈ پر لٹایا۔ چھت پر نگاہ ڈالے وہ بے خبر سا مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ جاتی۔ اس کی دھڑکن رک جاتی۔ اس کی نبض تھم جاتی گرا سے معلوم ہو جاتا آج کیا ہوا ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔

”یعنی برف پگھل رہی ہے۔“ دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی تھی۔

اس نے تکیہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچا ہوا تھا۔

”میڈم بدل رہی ہیں۔ بدلتی بھی کیوں نا ایک میں ہی تو ان کے سب سے قریب ہوں۔“ ایک خیال آنے پر اس نے برق رفتاری سے خود کو سیدھا کیا اور فون اٹھا کر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

”آپ نے کہا تھا بابا وہ کبھی نہیں لوٹے گی۔ وہ لوٹ آئی ہے۔“ میسج بھیجنے کے بعد اس نے اپنے سینے میں خوشی کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر شیزل کی باتیں اسے سونے نہیں دے رہی تھیں۔ ٹھیک ہے وہ شادی والی بات پر حقیقت میں ڈسٹرب ہو گیا تھا مگر وہ جانتا تھا۔ یہ فقط ایک مذاق ہے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ مذاق ہی ثابت ہوا۔

”اف ف شیزل، تم کبھی نہیں سدھرنے والی۔“ اس نے آنکھیں بند کیں تھی کاش وہ نہ کرتا۔ وہ اسے سوچتے سوچتے غنودگی میں چلا گیا تھا۔ کاش وہ نہ جاتا۔ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ کاش کے نہ ہوتا۔

اس کی بند آنکھوں جتنا اندھیرا شیزل کی آنکھوں میں بھی تھا بس فرق اتنا تھا کہ ان میں احساس کا سیاہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ فون پر سر رکھے رو رہی تھی جب اسے غیر معمولی سا احساس ہوا۔ فون پر سر کو گرائے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔ نم دھندلی آنکھوں سے اس نے سیاہ بوٹ دیکھے تھے جو اس کے سنیکرز کے ساتھ جڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی سانس کو نارمل رکھا اور نظروں کو تھوڑا سا گھمایا، سیاہ گلوڑ والے ہاتھوں میں باریک سی ہتھوڑی تھی جس پر سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ شیزل نے تھوک نگلا پھر توقف کے ساتھ سر کو سست روی کے ساتھ اٹھالیا۔ وہ انسان جو ہمیشہ نقاب میں ہوتا تھا آج بے نقاب کھڑا تھا۔ بغیر خوف کے بغیر ہچکچاہٹ کے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے، عین سامنے۔

”تو یعنی جیری ہی تم سب کو مار رہا ہے۔“ اسے اپنے کچھ دن قبل کے الفاظ سنائی دیے تھے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہی ہم سب کا قاتل ہے۔“ شیزل کی متورم آنکھیں اس ایک

چہرے پر جم گئی تھیں جس کے یہاں یوں ہونے کا تصور اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔
”جیری یعنی قیس الہی؟“ دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا گیا۔

”امم، ہم جیری یعنی احد خان۔“ وہ اسے تکتی رہی کئی ٹائیپ، کئی لمحے پھر اس نے خود کو
بولنے پر آمادہ کیا۔

”تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟“ وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ دماغ میں اس لڑکے
کی آواز گونجنے جا رہی تھی۔

”ہمارے ساتھ ساتھ آپ بھی اس کا ٹارگٹ ہیں۔ وہ آپ کے ذریعے قیس اور جہانگیر
الہی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں قیس الہی اس کی مرحوم بہن رتبہ کا شوہر رہ چکا
ہے۔ اس کی بہن نے قیس سے یکطرفہ محبت کر کے شادی کی تھی مگر قیس کے سرد رویے اور
تاریکی کی وجہ سے وہ بہت بیمار ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی اولاد دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس
بیماری کی وجہ سے مر گئی تھی۔ پھر اس حادثے کے بہت بعد قیس نے رتبہ کو طلاق دے کر گھر سے
نکال دیا تھا جس کے سبب وہ چند اوباش لڑکوں کے ہاتھ لگ گئی اور پھر اس نے خودکشی کر لی۔
اسے مرے ہوئے بہت سال ہو چکے ہیں۔“

اس کے پاؤں کے ساتھ پاؤں ملائے کھڑا انسان بچوں کے بل بیٹھا اور اس کی روئی روئی
سی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔

”یہی سوال میں تم سے کروں تو؟“ شیزل کے دل کو دھڑکا ہوا تھا۔ یہ احد کی آنکھیں نہیں
تھیں۔ یہ احد نہیں تھا۔ وہ نرم خوشا انسان، وہ نرم گرم سی چاشنی رکھنے والا، ناہ یہ بالکل بھی وہ
نہیں تھا۔

”اس نے جس طرح میرے دوستوں کو مارا ہے اسی طرح مجھے بھی مار دے گا اور آپ کو

بھی، ہم دونوں بہت لمبے عرصے تک اس سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ وہ شیطان کا پجاری ہے۔ سیٹن سے محبت رکھتا ہے۔ جو شخص اپنی ماں کو ان درندوں کے حوالے کر سکتا ہے اور اپنی بہن کے ساتھ خود ہی غلط کروا سکتا ہے تو سوچو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ جی بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہیں آپ، مرضی کے خلاف بغیر بتائے شادی کرنے کی وجہ سے اور ملے ہوئے ٹاسک کو پورا کرنے کیلئے اس نے یہ گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ ہمیں بھی یہ کرنے کو کہا گیا۔ ہم نے نہیں کیا اس لیے ہم مر رہے ہیں۔“

شینزل نے لبوں کو تر کیا۔ اسے آج بہت زیادہ عرصے کے بعد خوف آرہا تھا اور آ بھی کس سے رہا تھا جس سے کبھی اس نے شادی کرنے کا سوچا تھا۔
 ”میں اداس تھی۔“ وہ خون آلود ہتھوڑی اور اس کے چلیے کو نظر انداز کر رہی تھی، بھرپور کر رہی تھی۔

”میری حقیقت سن کر؟“ وہ پردہ رکھ رہی تھی۔ اس نے کھینچ کر پھاڑ دیا اب چاک میں سے سب واضح تھا۔ سچ، جھوٹ سب سامنے تھا۔
 ”تو یعنی تم اعتراف کر رہے ہو؟“ اس کے دل میں ٹھنڈا سا ڈراٹھا۔ اس نے محتاط انداز میں فون کو ٹراؤزر کی پاکٹ میں ڈالا اور زپ بن کر دی۔ احد نے اس کے ہاتھ کی جنبش دیکھ لی تھی وہ خطرناک مسکراہٹ لبوں پر لے آیا۔

”ہاں بالکل۔“ پھر اس نے شینزل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”چلو نکالو فون اور ڈیلیٹ کرو ویڈیو اور فائل وہ جو تم نے میرے بارے میں بنائی ہے۔ کرو شاہاش۔“ اس نے خون آلود ہتھوڑی شینزل کے گھٹنے پر ٹکائی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

”تمہیں لگتا ہے میں ڈر جاؤں گی ہونہ میری ڈھال تمہاری کھال ادھیڑ دے گی۔“ وہ ہنسا

شروع ہوا تھا۔ بے ڈھنگا سا اونچا اونچا، شینزل کے دل نے پھر سے بیٹ مس کی تھی۔ اسے خطرے کی گھنٹی محسوس ہو گئی۔ اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی کوئی بھی ذی روح وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ احد کو دھکا دے کراٹھنے کی کوشش کرنے والی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہتھوڑی کو بری طرح سے پوری قوت کے ساتھ اس کے گھٹنے پر مارا گیا۔ اتنی زور سے کہ وہ درد سے بلبلا اٹھی۔ گھٹنے سے اٹھتی سنسناہٹ سینے تک گئی تھی۔ وہ جان گئی کہ اس کے گھٹنے کی ہڈی چکنا چور ہو چکی ہے۔ خون سے بھگتے ٹراوڑ اور تکلیف دہ تاثرات کے ساتھ وہ اسے سن رہی تھی جو کہہ رہا تھا۔ ”اور اگر میں نے ایسا کر دیا تو، میں کسی کو بھی مار سکتا ہوں۔ تمہیں بھی، حالانکہ بہت آسان موت سوچی تھی تمہارے لیے لیکن مشکل تم نے خود کھڑی کی ہے۔ تو پھر اب بھگتو بھی۔“ گلوڑ میں چھپے ہاتھوں کے ساتھ اس نے اس کی گردن کی پشت پکڑی تھی۔ شینزل فوری طور پر مزاحمت نہیں کر سکی کہ جو ضرب لگی تھی وہ بہت گہری اور پردرد تھی۔

”مجھے افسوس ہے احد، اپنے اس ہر لمحے پر افسوس ہے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارا تھا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے تھے، کیسے؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ شدید تکلیف دہ دور سے گزر رہی ہے۔ اتنی تکلیف کہ اس کی ہمت پہلے ہی مرحلے پر جواب دے گئی۔

”کہا تھا ناشادی کرنی ہے۔ ماں سے بات کرنے والا ہوں پھر کس قسم کی جلدی تھی تمہیں کیوں میرے خلاف ثبوت اکٹھے کیے، کیوں؟“ کہتے ساتھ ہی وہ پھر سے اسے مارنے والا تھا لیکن اس بار شینزل نے ہتھوڑی کو پکڑ لیا مگر احد کی گرفت زیادہ تھی۔ شیطان جب طاری ہوتا ہے تب حقیقت میں انسان انسان نہیں رہتا اس کا چیلا بن جاتا ہے۔ اس میں غیر ماورائی سی طاقت آ جاتی ہے۔ وہ زور جو عام انسان میں بالکل بھی نہیں ہوتا وہ اس میں آ جاتا ہے۔ احد

کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اس نے شیزل کے ہاتھ سے ہتھوڑی جھٹی اور کھینچ کر اس کی گردن پر مار دی۔ پھوٹتے خون کے ساتھ وہ سنگی بیچ سے نیچے گری تھی۔ اس کی گردن دائیں جانب سے لمبائی میں کٹ چکی تھی۔ آنکھیں پھاڑتے ہوئے، درد سے بے حال ہوتے ہوئے اس نے احد کو دیکھا جو ایک اور وار کرنے والا تھا۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہاری قدر کرتا ہوں۔ میرے لیے دنیا میں تم سب کچھ ہو۔ تمہارا بال بھی بیکا ہو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“ اسے اس کا اظہار یاد آیا تھا۔ یقین دہانیاں یاد آئی تھیں۔ اس کی پوزیٹو نیس یاد آئی تھی۔ اس کا نشانہ شیزل کا گال تھا۔ وہ ہتھوڑی کو اس کے گال پر کھینچ کر مارنے ہی والا تھا جب وہ چلا اٹھی۔

”احد۔“ پکار بہت زوردار بہت جاندار تھی۔ جھنجھوڑ دینے والی، روک دینے والی، تھما دینے والی، احد کا ہاتھ راستے میں ہی فریز ہو گیا۔ وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ اسے تک رہا تھا جو کہہ رہی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم، مت کرو۔ میں، میں شیزل ہوں۔“ وہ اسے یاد کروا رہی تھی جسے اچھے سے اس کی حقیقت پتہ تھی۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی جو اپنی ذات کو ابلیس کے ہاتھوں سوئپ چکا تھا۔ خون میں لت پت ہوتی شرٹ والی لڑکی کو دیکھ کر اس نے ابرو اچکائی۔

”او اچھا، کیا میں بھول گیا تھا۔ چلو بہتر ہو گیا تم نے یاد کروا دیا، اب مزید مزا آئے گا مارنے میں۔“ اس کے چہرے کے تاثرات پھر سے بدل رہے تھے۔ وہ پھر سے جنونی و خطرناک ہو رہا تھا۔

”تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ تم ایسے تو نہ تھے۔“ گردن کے کٹنے کی وجہ سے اس کی آواز میں فرق آ گیا۔ اسے کھانسی آرہی تھی مگر وہ کھانا نہیں چاہ رہی تھی کیونکہ ایسا کرنے کی وجہ سے

خون اور تکلیف اپنی رفتار کو بڑھا لیتے تھے۔

”تم نے معلوم تو کر لیا ہے کہ میں شیطانی طاقتوں کو گلوری فائے کرتا ہوں، مزید کیا جاننا ہے ہاں؟“ اس نے ہتھوڑی کو اس کے سرے سے پکڑا اور پھر شیزل کا ہاتھ کھینچ لیا۔

”یعنی تم وہ انسان بن چکے ہو جس سے گھن کھائی جائے۔ جسے کتے کی موت مارا جائے۔“ قبل اس کے وہ مزید اسے چوٹ پہنچاتا شیزل نے سنگی بیچ کے قریب پڑا پتھر اٹھا کر اس کی آنکھ پر دے مارا، یہ دفاع فوری طور پر ہوا تھا اور اتنی برق رفتاری سے کیا گیا کہ احد کو سنبھلنے کا موقع تک نہیں ملا۔ اس کی آنکھ پھٹ چکی تھی۔ اس میں سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ کراہتے، چلاتے ہوئے اپنی آنکھ کو پکڑ کر پیچھے ہوا۔ شیزل ہتھوڑی اٹھا کر اپارٹمنٹ کی طرف بھاگی تھی۔ اس دوران وہ کئی بار زمین پر منہ کے بل گری تھی۔ اس کا گھٹنا شدید زخمی تھا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے قدم اٹھنے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ مگر یہاں بات زندگی کی تھی۔ زندگی کو بچانا تھا تو اسے سرپٹ دوڑنا تھا۔ زندگی کی حفاظت کیلئے تو مردے بھی جاگ اٹھتے ہیں پھر وہ تو جیتی جاگتی انسان تھی۔ بلڈنگ کے گیٹ کو دھکیل کر وہ اندر آئی۔ گارڈ اسے ایک طرف گردن لڑھکائے بیٹھا نظر آیا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ وہ جان گئی اسے مار دیا گیا ہے۔ ہتھوڑی پر جو خون پہلے لگا تھا وہ اسی کا تھا۔ اس نے بہت دقتوں کے ساتھ خود کو اندر کی طرف بڑھایا۔

”میم یہ احد کی معلومات ہیں۔“ کچھ دن قبل نشاء نے اس کو ایک سیاہ فائل تھمائی تھی۔ اس فائل کو تھماتے ہوئے وہ ناخوش سی نظر آ رہی تھی۔ تفکر تھا اس کے چہرے پر ویسا ہی تفکر شیزل کے چہرے پر بھی پھیل چکا تھا جب اس نے احد کے متعلق پڑھا تھا۔ اس فائل کے مطابق احد اپنے قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا جس کے انتقال کے بعد گدی نشین اسے بنا دیا گیا تھا۔ مگر وہاں کی

روایات اور رہن سہن اس کیلئے قطعی موزوں نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن سے محبت کرتا تھا اس لیے بخوبی گھر کی اور زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ مگر اسے یہ زندگی نہیں چاہیے تھی۔ اسے پڑھنا تھا خوب سارا پڑھنا تھا۔ پڑھ لکھ کر کچھ بنانا تھا۔ اسے زمینیں نہیں سنبھالنی تھیں۔ اسے بیٹھ کر نہیں کھانا تھا۔ وہ جاب کرنا چاہتا تھا۔ باہر ملک جانا چاہتا تھا۔ یہ اس کا خواب تھا۔ اس کے خواب کو اس کی ماں نے پورا کیا۔

”تمہیں جانا چاہیے بلکہ ہم دونوں تمہارے ساتھ چلیں گے۔ باہر کے ہائی اسکول سے تمہاری بہن پڑھے گی تو اس کا بھی بہتر مستقبل ہوگا۔ یہاں کی روایتی زندگی سے اس کی بھی جان چھوٹ جائے گی۔“

اس نے ماں کی بات مان لی تھی۔ خاندان والوں سے ہزار مخالفت مول لے کر وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بیرون ملک چلا گیا تھا۔ وہ یہاں پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے آیا تھا۔ اسے بزنس میں دلچسپی تھی۔ وہ یہاں یہی سبجیکٹ پڑھ رہا تھا۔ اس دوران ایک روز ایک پروفیسر نے ان کے سبجیکٹ سے بالکل ہٹ کر انہیں ایک ٹاسک دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا دوسری یونیورسٹیز سے مختلف پروفیسرز اور بڑی بڑی کمپنیز کے مالک ان کی ریسرچ ورک آ کر پڑھیں گے اور اگر کسی کا کام ان کے دل کو چھو گیا تو وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے کریئر کا آغاز بھی ان کے ساتھ کرے گا۔ احد کے دل کو یہ بات لگی تھی۔ اس نے بنا کسی باریکی کے، بنا کسی نظر ثانی کے حامی بھر لی تھی۔ وہ نہ بھی بھرتا تب بھی ہر صورت اسے یہ ریسرچ ورک کرنی ہی تھی ورنہ یونیورسٹی اسے آؤٹ کر دیتی پھر پورے ویسٹ میں اسے کوئی بھی یونیورسٹی قبول نہ کرتی۔ اندر کی بات ہے۔ یہاں کے کچھ گروہ سالوں کے وقفے سے زیادہ تر مسلمان اور امیر طبقے کے لوگوں کو ٹارگٹ کے طور پر چنتے ہیں اور اپنی اسکیم چلواتے ہیں۔ سب جانتے ہیں مغرب میں

اسلام دشمن عناصر بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مغرب مسلمانوں کو کافر کرنے میں اپنی سانس سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ اس لیے وہ امیر سے لے کر غریب طبقے تک کے مسلمانوں کو ٹارگٹ کرتے ہیں۔ انہیں بدھ مت، عیسائیت، ہندومت اور ڈچ جیسے کئی مذاہب میں کنورٹ کر دیتے ہیں۔ تبھی تو یونیورسٹیز اور سینز کیلئے اتنے پراجیکٹس نکالتی ہیں۔ اتنی سیٹیمیں ہوتی ہیں جن پر اگلے کیا جاتا ہے۔ اسکا لرشپس دی جاتی ہیں۔ اچھی مراعات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کام کیلئے اسٹوڈنٹ طبقہ ان کا نمبر ون آپشن ہوتا ہے۔ اچھے نمبر، پوزیشن اور زبردست کریئر کیلئے کم عمر لڑکے لڑکیاں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو صحیح غلط کے فرق کو مٹا دیتا ہے۔ انہیں فقط نام چاہیے ہوتا ہے۔ وہ نام جو آخری ہچکی کے آتے ہی لمحوں میں زندگی کے اوراق سے مٹ جاتا ہے۔ بے نام ہونے میں سیکنڈ لگاتا ہے۔

ایلو منائی اور فریمسن، یہ دو ٹاپک تھے جن پر احد کوریسرج ورک کرنی تھی۔ اسے دجال کے بارے میں پڑھنا تھا۔ ابلیس کے بارے میں پڑھنا تھا۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں لکھنی تھیں۔ ان کے کرامات بتانے تھے۔ ان کی پاور کو قلم بند کرنا تھا۔ ان کی خانقاہوں، عبادت گاہوں کو دیکھنا تھا۔ انہیں فیری ٹیل کی دنیا بنا کر پیش کرنا تھا یعنی اپنا ایمان بچ کر شیطان کے رستے پر چلنا تھا۔ احد یہ سب کرنے کیلئے تیار ہو گیا۔

”بالکل بھی نہیں، میں تمہیں اس چیز کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔ تم یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو وہ کرو فضولیات میں پڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“ رحمت نے دو ٹوک انکار کیا تھا۔ انہیں تو یہ سوچ کر ہی جھرجھری چڑھی تھی کہ ان کا بیٹا شیطان پر ریسرج ورک کرنے والا ہے۔ نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دیں گی بالکل بھی نہیں۔

”ماں یہ میرے سبجیکٹ کا حصہ ہے۔“ رحمت نے درشتی سے اس کی بات درمیان میں

سے قطع کی۔

”شیطان کسی بھی سیجکٹ کا حصہ نہیں ہوا کرتا احد، کم از کم اپنے نام کی ہی لاج رکھ لو۔“
رحمت ناراض ہونے کے ساتھ ساتھ غصہ تھیں۔ احد کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنی ماں کو کس طرح سمجھائے۔ اس کی فطرت میں بحث کرنا نہیں تھی مگر آج اپنے کریر کیلئے اسے ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ ضد کر رہا تھا۔

”ماں یہ صرف ایک ریسرچ ورک ہے اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو یونیورسٹی مجھے نکال دے گی پھر میں کہیں بھی اپلائے کرنے کے قابل نہیں رہوں گا۔“ رحمت کی آنکھوں میں جسمگی اتر آئی۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کھر دے انداز میں اس سے کہہ رہی تھیں۔

”نکالتی ہے تو نکالتی رہے، پاکستان کی سرحد ہمارے لیے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔“ اس نے طویل سانس چھوڑا پھر ان کے گھٹنوں میں بیٹھتا ہوا گویا ہوا۔

”ماں، آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے۔“ رحمت اب کے نرم پڑی تھیں۔ انہوں نے صلح جو انداز میں کہا۔

”مجھے تم پر یقین ہے احد مگر شیطان پر نہیں ہے۔ اس نے اللہ سے کہا تھا وہ اس کی مخلوق کو آخری سانس تک بہکائے گا۔ اس نے گستاخی کی تھی اور تم اس گستاخ کے رستے پر چلنے کا کہہ رہے ہو۔ میں کیسے اجازت دے دوں۔“ احد کا دل کیا وہ دیوار میں سر پھوڑ لے۔ شیطان کے رستے پر چلنا اور اس پر ریسرچ کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ رحمت کو کیسے سمجھاتا یہ بات جو انتہائی باریکی میں اتر کر اس کے ایمان پر شک کر بیٹھی تھیں۔

”اچھا کول ڈاؤن جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔“ مگر ویسا نہیں ہوا تھا جیسا رحمت نے چاہا تھا۔ ان کا ہونہار بیٹا تاریکی میں اتر چکا تھا۔ برائی کے رستے پر چلنے کیلئے ایک قدم

ہی کافی ہوتا ہے۔ رستہ پھر خود بخود نکلتا رہتا ہے یوں بھی شیطان کا تو وعدہ ہے وہ انسان کو بھٹکائے گا اور اس نے بھٹکا دیا۔ وہ جو سمجھا بیٹھا تھا کہ یہ فقط کچھ عرصے کا کام ہے تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے شیطان اور اس کی حرکتوں میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ اس کے چیلے اس کو راحت دینے لگے تھے۔ وہ دنوں میں اپنی یونیورسٹی کا مقبول ترین اسٹوڈنٹ بن گیا۔ وہ ہفتوں میں لڑکیوں میں مشہور ہو گیا۔ اس کے انٹرویوز آنے لگے۔ اس پر کالم بننے لگے۔ اسے ٹی وی شو پر بلایا جانے لگا کیوں؟ کیونکہ وہ زمین کا آدم تھا جس نے ماں کے روپ میں منع کرنے والی حوا کی بات کو رد کر کے خود کے سر پر خاک ڈال لی تھی۔ وہ خاک اسے سونا لگ رہی تھی۔ وہ خاک اسے تسکین دے رہی تھی۔ احد خان جو مسلم کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا راتوں میں بنا پڑھے ذہن ترین انسان بن گیا۔ اعزاز لینے لگا۔ آدم کو تو زمین پر پھینکا گیا تھا مگر احد آسمان پر اڑ گیا۔ بلندیوں کا چھو گیا۔ اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ ہونا بنتا بھی تھا۔ جب دولت، شہرت اور عورت ہاتھ میں ہو تب اچھے سے اچھوں کے دماغ اٹتے ہیں وہ تو پھر ایک نوعمر لڑکا تھا کیونکر نہ بہکتا۔



وہی رات تھی۔ چاند بھی پورا تھا مگر آسمان خالی تھا۔ اڑھائی بجے کا وقت تھا جب جہانگیر ایزی چیر پر بیٹھے سگار کے کش بھر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا میسج پڑھا تھا۔ انہوں نے ایک سرخ ساکت نگاہ اپنی شریک حیات پر ڈالی جو بیڈ کے کنارے گود میں ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔

”کتنی راتیں جاگیں گے آپ؟“ انہوں نے جھجھکتے ہوئے سوال داغا تھا۔ شوہر رقابت کے زہر سے نیلے پڑتے اپنے رشتوں پر ماتم کناں تھا۔ نالاں تھا۔ فقط ان کی یک طرفہ محبت،

بے جا حسد و جلن نے ان کے گھر کے گلشن کو خزاں رسیدہ بنا دیا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا تھا نا ان کا چھوٹا سا گھر، جس میں حلیمہ تھیں، وہ تھے اور ان کی نین تھی۔

”نین۔“ بے ساختہ جہانگیر کی آنکھوں کے کناروں پر سرخی دوڑ گئی۔ ان کی نین، جسے یہ نام اس کی ذہن، چمکدار اور معصوم آنکھوں کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ ان کی زندگی، ان کی حیات، ان کی پہلی پہلی محبت کی پہلی نشانی، ان کے سینے میں ہوک سی اٹھی تبھی طویل سانس لبوں کے ذریعے پھیپھڑوں تک پہنچایا۔

”اب کیا میں سوال کی مستحق بھی نہیں رہی۔“ وہ شکوہ کناں تھیں کیا فائدہ وقت تو بیت چکا۔
 ”آپ کی ناراضگی دل جلاتی ہے۔“ اب کی بار متورم آنکھوں نے ڈھلتے مگر شاداب چہرے کو دیکھا۔

”میرا فیصلہ بھی آپ کا دل جلائے گا کیونکہ۔“ پھر انہوں نے نظروں کا مختصر سا سفر پورے کمرے میں طے کر کے واپس ان کو دیکھا اور اپنا جملہ مکمل کیا۔ ”میں یہ حویلی کسی اور کے نام کر چکا ہوں۔“ مصباح نے احتجاج کیا۔

”دولت نے مجھے کبھی مرعوب نہیں کیا تھا جہان، میں تو شراکت سے بلبلا اٹھی تھی۔ آپ کی محبت روز اول سے دل میں مقیم تھی پھر کس طرح میں بٹوارہ برداشت کرتی۔ کیسے تہی داماں رہتی۔ مجھے تو اپنی راہ ہموار کرنی تھی نا۔ مجھے تو آپ کو حاصل کرنا تھا نا۔“

”اس طرح؟“ جہانگیر کے لبوں سے قرب پھسلا۔ ”ایسے؟“ ان کا درد دیدنی تھا۔ ”میری بیٹی کو بے نام و نشان کر کے، ہمارے گھر کا سکون برباد کر کے، کیا کبھی میں نے آپ کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی؟ کوئی کمی پیش ہوئی آپ کو؟ کہیں کوئی کوتاہی؟ نہیں نا تو پھر کیوں مجھے اجاڑ دیا۔ میری اولاد کو برباد کر دیا۔“ وہ لب کھولنے لگی تھیں مگر جہانگیر نے ہاتھ کھڑا کر کے

انہیں بولنے سے روک دیا۔ وہ تھم گئیں کہ حکم عدولی اب ممکن نہیں تھی۔

”نہیں مصباح، آپ محبت میں گرفتار نہیں تھیں آپ حسد کی شکار تھیں اور حاسد کبھی بھی ناتو خود سکون سے رہتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو رہنے دیتا ہے۔“ پھر وہ رک گئے کافی دیر، مصباح گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگیں کہ اب یہ تو ہر رات کا معمول تھا۔ روز کی روٹین تھی۔

”آپ سے نکاح کیا تھا میں نے، ہاں دل میں حلیمہ تھیں مگر کبھی بدیانتی آپ کے ساتھ بھی نہیں کی، آپ کو عزت بنایا۔ فوقیت دی۔ نام و مقام دیا۔ جبکہ وہ جو دل میں بستی تھی وہ تو بے نام تھی۔ زمانے کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میری شریک حیات تھی۔ سب آپ سے آشنا تھے۔ اس سے نہیں تھے۔ وہ تو بس خاموشی سے ایک گوشے میں پڑی پڑی چلی گئی۔ آپ کو تو اسی بات سے سکون آ جانا چاہئے تھا مگر نہیں آپ کو فانی پھول کے گرد بچھا وہ قیمتی پتھر چھینے لگا۔ وہ پتھر فنا ہو کر بھی بقار ہا مگر آپ ہو کر بھی نہیں ہیں۔ اب بس ایک ذمہ داری ہے۔ ایک فرض ہے جو پورا کرنا ہے باقی سب ختم۔“

مصباح کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے مگر بے مول تھے۔ وہ روز یونہی تڑپتی تھیں۔ بلکتی تھیں۔ جو گناہ کر چکی تھیں اس کے آگے یہ تڑپ، یہ محرومی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس سے زیادہ کی مستحق تھیں۔ بہت زیادہ کی، کتنی بدنصیب ہو گئی تھی نا وہ عورت جس کا اب شوہر رہا تھا اور نہ ہی بیٹا۔ ان کی بند گیلی آنکھوں میں قیس کا چہرہ تھا جو اس وقت پر سکون نیند کی آغوش میں تھا۔ اس کی سانسوں کی تیزی، پلکوں کا توازن بتا رہا تھا کہ وہ ایک بھر پور نیند لے رہا ہے۔۔۔ دفعتاً اس کی نیند میں خلل پیدا ہوا۔ ماتھے پر دو بل نمودار ہوئے اور دھڑکن بڑھ گئی۔ اس نے کروٹ لی تھی لینے کے ساتھ ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

”یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ وہ خود سے دست سوال تھا۔ دل بہت تیزی سے ڈوب کرا بھرا۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ دل کے مقام پر رکھ دیا۔

”ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کیا پھر سے بی پی شوٹ ہو رہا ہے میرا۔“ اس کے ماتھے پر پینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ حلق میں سختی و چھین سی محسوس ہوئی۔ اس نے بستر سے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہیں پایا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں یکجہت بے جان ہوئے۔ اس نے طویل سانس لیا۔

”یا اللہ آج نہیں، ابھی نہیں، ابھی مجھے اسے منانا ہے۔ اس کے ساتھ وقت بتانا ہے۔ اسے خوش دیکھنا ہے۔ اس کے ساتھ کھل کر جینا ہے۔“ دل کے مقام پر ہاتھ رکھ کر وہ بے ربط سے جملوں کے درمیان بول رہا تھا۔ اسے یاد آیا۔ اس کے فیملی ڈاکٹر نے اسے ایک دوا تجویز کی تھی جو وہ ایسی حالت میں لے سکتا تھا۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی۔ اس میں چیزوں کے نیچے اسے وہ چنے کے دال کے برابر سفید گولیوں کا پتا نظر آیا تھا۔ قیس نے بنا سوچے سمجھے عجلت کی حالت میں اس میں سے گولی نکالی اور اس کو نگل لیا کہ اس وقت اس کا یہ عمل حالیہ حالت کو سنبھالنے کیلئے بہت بہتر تھا۔ پورے دس منٹ بعد اس کی حالت میں سدھار آیا تھا۔ طبیعت خرابی کے دوران اس کے فون کی دو بیپ بجی تھی دونوں ہی ای میل کی آمد کا بتا رہی تھیں۔ قبل اس کے وہ ہاتھ بڑھا کر فون اٹھاتا مین ڈور کی بیل بج اٹھی۔ اس نے متحیر انداز میں دروازے کی جانب اور پھر گھڑی کو دیکھا۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“



اس کے قدم لفٹ کی جانب تھے جب اسے اپنے عقب میں کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ احد اس سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا۔ اس کی ایک آنکھ پھٹ

چکی تھی جس کے سبب اس کا آدھا چہرہ خون آلود تھا۔ وہ وحشی لگ رہا تھا۔ وہ خوف ناک لگ رہا تھا۔ شیزل نے جلدی سے لفٹ کا بٹن دبایا۔ احد کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کھینچ کر ہتھوڑی اس کی طرف پھینکی تھی جو اس کے شانے سے ٹکرا کر دور جا گری۔ لفٹ کا دروازہ تیزی سے بند ہوا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے تم بچ جاؤ گی تم آج مرو گی۔“ لفٹ کی جھری میں سے اس کی آواز اندر آ رہی تھی۔ وہ دھاڑ رہا تھا ساتھ میں اس کا دروازہ بھی پیٹ چکا تھا۔ شیزل کا دل پسلیوں میں دھڑکنے لگا۔ نیچے موت تھی تو اوپر خوف مگر اسے جلدی کرنی تھی۔ اسے احد کے سیڑھیوں کے ذریعے یہاں تک پہنچنے سے پہلے اپنے اپارٹمنٹ میں جانا تھا۔ وہ نیم تاریکی میں ڈوبی راہداری میں آئی۔ احد کے گھر کا دروازہ بس کچھ قدموں کی دوری پر تھا۔

”احد کی ماں یعنی رحمت خاتون آج سے آٹھ سال پہلے مر چکی ہیں۔ احد ہی ان کی موت کا ذمہ دار ہے۔ اس نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنی ماں کو زہر دے دیا تھا بعد ازاں اس نے انہیں اپنی کمیونٹی کے حوالے کر دیا۔ ان کی لاش کے ساتھ کیا ہوا کوئی نہیں جانتا۔“ اس کے قدم کپکپا رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا ٹوٹا ہوا گھٹنا پکڑ کر خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ اس کی سانس تیز تھی۔ حلق میں پھندا سا تھا۔

”مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں، ہماری بلڈنگ کے لوگ سب رحمت آنٹی سے واقف ہیں۔ ان سے ملتے ہیں۔“ وہ اپنے دروازے تک آ چکی تھی۔ اس نے جلدی سے پاسورڈ اینٹر کیا۔ سیڑھیوں سے کسی کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آج راہداری اتنی سرد تھی جیسے مردہ خانہ ہوا کرتا ہے۔ آج وہاں ایسی خوشبو تھی جو ناقابلِ بیاں تھی۔

”تم لوگ جس سے مل چکے ہو وہ کوئی جاویدہ عورت نہیں ہے۔ وہ شیطان ہے جو انسان کا

روپ دھارے ہوئے ہے۔“ دروازہ وا ہونے سے پہلے اسے اپنے عقب میں کسی کے ہونے کا احساس ہوا تھا۔

”شیزل، بچے تم آگئیں۔“ بھاری، خوفناک زنانہ آواز۔۔۔ شیزل رو پڑی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ جانتی تھی۔ وہ مڑی تو ان کے سحر میں آ کر پتھر کی ہو جائے گی۔ وہ اس وقت خود کو مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس نے ہمت کی۔ اگنور کیا اور جلدی سے اندر آ کر پھر سے پاسور ڈلگا لیا۔

”ایسا ممکن نہیں، وہ بہت پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون ہیں وہ کیسے اتنی بری ہو سکتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔ اس کے دروازے کو بری طرح پیٹا جانے لگا۔

”کیا وہ عبادت تمہارے سامنے کرتی تھیں۔ کیا کبھی تم نے ان کے منہ سے قرآنی آیات سنیں۔“ ٹوٹے ہوئے گھٹنے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس نے صوفے کو گھسیٹ کر دروازے پر لگایا اور خود دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”مگر مولانا صاحب، میں انہیں چھو سکتی تھی۔ ان کا لمس یاد ہے مجھے۔“ وہ مسکرائے۔

”بیٹے، شیطان دنیا میں کن کن روپوں میں اور کن کن حالتوں میں ہے آپ کو کیا معلوم، میں نے کہا وہ گناہ ہے اور گناہ ہر روپ دھار لیتا ہے۔“ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

ایک لمحے کو اس کا دل کیا وہ قیس کو بلا لے، نشاء اور کمال کو بھی، وہ جانتی تھی سب دوڑتے ہوئے اس کی مدد کو آئیں گے مگر کب تک، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو کسی بھی دن وہ ان کا نشانہ بن جائے گی، ماری جائے گی کیونکہ وہ بھی تو کبھی انہیں کے چنگل سے بھاگ کر آئی تھی۔ بھلے اس نے ایک بھی درجہ پار نہیں کیا تھا۔ بھلے وہ بس آنکھوں دیکھا جانتی تھی۔ بھلے اسے کمیونٹی کا ممبر بنایا جانے والا تھا۔ جو بھی تھا وہ کسی نہ کسی طرح سے ان سے منسلک رہی تھی۔ وہ اسے شیطان کا

پیروکار بنانے والے تھے۔ وہ تبھی وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ اور حیرت انگیز طور پر بچ نکلی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ اس کے بعد جب کافی وقت گزر جائے گا اور وہ بے فکر ہو جائے گی تب اسے یوں اس طرح ٹارگٹ کیا جائے گا۔ یوں موت کے گھاٹ اتارنے کیلئے کھیل رچایا جائے گا۔ جب مرنا اس نے ہے ہی۔ تباہی مچنی ہی مچنی ہے تو کیوں نایہ قصہ آج ہی ختم ہو، سب آج ہی طے ہو جائے۔

”تم نہیں بچو گی آج، لکھ لو تمہاری موت ہے۔“ دروازے پر جانے کس طرح کی ضرب لگائی گئی تھی کہ صوفہ ایک انچ جتنا آگے کو لڑھک گیا۔ شیزل خود کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس کو لاک کر کے وہ بیڈ کے ساتھ والی دیوار پر زمین پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد اس نے برق رفتاری سے اپنا فون نکالا، نکالنے کے بعد اسے آن کیا تو دھک سے رہ گئی۔ وہاں سنگل نہیں تھے۔ اس کے فون کے سنگل سلب تھے۔ اس نے احد کے متعلق بنائی ہوئی ویڈیو قیس اور نشاء کو میل کر دی۔ اس کے بعد اس نے کیمرہ آن کیا۔ اپنے زخمی چہرے کے ساتھ ویڈیو ریکارڈ کر کے دونوں کو میل کر دی۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ راستہ نکالے گا۔ اللہ اس کی مدد کرے گا۔ اس کا مین ڈور کھل چکا تھا۔ دھپ دھپ کی آواز کے بعد کمرے کے دروازے کو پیٹا گیا۔ کام نہیں بنا تو اسے ہتھوڑی کے ذریعے توڑا جانے لگا۔

”میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔“ اس نے روتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں خود سے کہا۔ ”یہاں تک کہ موت بھی مجھے نہیں ڈرا سکتی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سائیڈ میز پر لیمپ کے پیچھے رکھی پستل اٹھائی۔ اس کی گولیاں چیک کیں پھر اسے لوڈ کر کے الٹے ہاتھ میں پکڑا۔ سیدھے ہاتھ سے اس نے دوبارہ سیل فون کو روشن کیا۔ اس کے سنگل اب بھی ختم تھے۔ اس نے فون بیڈ کے پیچھے گرا دیا تا کہ سنگل کے آتے ہی قیس کو وہ ویڈیو میل ہو جائے۔ احد آدھا دروازہ

توڑ چکا تھا وہ اس کی خوفناک شکل اس میں سے دیکھ سکتی تھی۔

”مجھ سے بچنا ممکن نہیں۔“ آدھے ٹوٹے ہوئے دروازے سے ٹیڑھا ہو کر اندر آتے ہوئے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ پھٹی ہوئی آنکھ، بد صورت چہرہ۔ کراہیت آمیز آواز۔۔

”یہی میں بھی کہنا چاہوں گی۔“ اس نے جونہی ہاتھ بلند کر کے ٹریگر دبایا احد نیچے ہو گیا اور اس بار اس نے شیزل کی پنڈلی کا نشانہ لیا تھا۔ ہتھوڑی لگنے کے سبب وہ گھٹنے کے بل زمین پر گری۔ اس کی تکلیف دھری ہو چکی تھی۔ وہ چیختی تھی مگر کون تھا جو اس کی چیخ سنتا۔ کون تھا جو گولی کی آواز پر یہاں آتا۔ یہاں تو سب کے گھر ساؤنڈ پروف تھے۔ یہاں تو موت بھی ہو جائے تو کسی کو علم نہ ہو، کوئی جانے نا۔

”آسان زندگی کو مشکل بنا دیا تم نے۔“ وہ ایک جست میں اس تک پہنچا۔ بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کر رہا تھا۔ شیزل کے لب سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ ”اب پاؤ اس مشکل پن کی سزا۔“ کہتے ساتھ ہی اس نے اس کے سر کو کئی بار دیوار میں مارا تھا۔ اتنا زیادہ کہ دیوار کا وہ حصہ شیزل کے خون سے بھر گیا۔

”تمہیں لگتا ہے اس سب کے بعد تم بچ جاؤ گے، تم کتے کی موت مرو گے۔“ خون کے بوجھ سے لرزتی ہوئی پلکیں، نیم بے ہوش سا انداز، اکھڑتا ہوا سانس۔ مدہم آواز۔

”واقعی، مگر صورتحال تو کچھ اور ہے۔“ اس نے اس بری طرح اس کے بال کھینچے کے پورا گچھا مٹھی میں آگیا۔ اس بار وہ بلبلا نہیں سکی تھی کیونکہ اس بار ضرب لگنے کی وجہ سے دماغ سن ہو چکا تھا۔

”اور تکلیف نہیں سہنی، آسان موت مرنی ہے تو چپ چاپ فون دے دو اور اس میں سے ویڈیوز ڈلیٹ کر دو ورنہ تمہاری روح ابھی کے ابھی ڈیلیٹ کر دوں گا میں۔“ جمتے ہوئے خون

کے نیچے موجود اس کے لب پھیلے تھے۔

”وہ ویڈیو تو کب کی اپنے اصل مقام تک پہنچ گئیں۔ اب تم کیا کرو گے اس فون اور اس ثبوت کا۔“ اس کی بات نے اشتعال برپا کر دیا تھا تبھی وہ بری طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے اسے اتنا زخمی کیا تھا کہ اللہ کی پناہ، شیزل کی گردن لمبائی کے رخ کٹ چکی تھی اس میں سے رگیں نظر آرہی تھیں۔ اس نے کھانستے ہوئے دھندلی نگاہوں سے احد کو دیکھا جو منہ سے کف نکالتے ہوئے اسے مغلیظات بک رہا تھا۔ کیا وہ وہی تھا۔ وہی ہنس مکھ، شائستہ سنجیدہ سا احد۔۔۔

”تمہارا کام تمام کر کے میں تمہاری ڈھال کی کھال ادھیڑوں گا ابھی مجھے فون ڈھونڈنا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں۔ تمہارے فون کے سگنلز ہم لوگوں نے کھائے ہوئے ہیں اس لیے طفل باتوں میں، میں نہیں آؤں گا۔“ وہ اس کے کمرے کا حشر نشر کر چکا تھا۔ فائل تو وہ کب کی اس کے کمرے سے اڑا چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب شیزل رات کی تاریکی میں تنہا بیٹھی قیس سے میسج پر بات کر رہی تھی۔ اس فائل کو حاصل کرنے کے بعد ہی احد کا دماغ پھرا تھا۔ وہ شاید اسے اتنی جلدی نہ مارتا مگر شیزل کی اس پر نظر، شک اور اس کے متعلق تفتیش نے اس کا دماغ الٹا دیا تھا۔ مارنا تو اسے تھا ہی مگر یہ فیصلہ اسے ابھی اور جلدی میں کرنا پڑا اور نہ شاید وہ مزید وقت اسے دے دیتا۔ جب وہ مصروف تھا تب شیزل نے ہمت مجتمع کر کے قدرے دور پڑے ہسٹل کو اٹھا کر اپنے ٹراؤزر میں اڑسایا اور خون آلود شرٹ اس پر برابر کر دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں درد جبکہ بدن بالکل بے حس ہو چکا تھا، سن ہو چکا تھا۔ اس نے دیکھا احد ایک بار پھر دیوانہ وار اس کی طرف لپکا ہے۔ اسے گردن سے پکڑ کر اس نے اٹھایا اور پوری قوت سے دھاڑا۔

”کہاں ہے تمہارا فون، بولو کہاں؟“ احد کی انگلیاں اس کی کٹی ہوئی گردن کے اندر تھیں۔ اس کی کوئی رگ دب گئی تھی جس کے سبب اسے لگا اس کی آواز بند ہو چکی ہے۔ اس نے بولنے کی کوشش کی، اس پر ہنسنے کی کوشش کی مگر نہ بولا گیانہ ہنسا گیا۔ وہ اسے کہنا چاہتی تھی۔

”کیوں تم لوگوں کے ایکسپرسٹ ناکارہ ہو چکے ہیں جو وہ فون سے ایک ویڈیو ڈیلیٹ نہیں کر پار ہے۔“ مگر وہ نہیں کہہ پائی، وہ نہیں بول پائی۔ اس کے آنسو ابل پڑے تھے۔ چہرہ مزید تر ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پھر مرو تم۔“ اس نے اسے بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف لے جانے لگا۔ اس کے خون کی لکیر بنتی جا رہی تھی۔ کمرے سے باہر، پھر لاونج میں، پھر راہداری میں جہاں اس نے رحمت کو تنکون ابرو کے ساتھ کھڑے پایا تھا۔ وہ اس پر ہنس رہی تھیں بری طرح ہنس رہی تھیں۔ وہ اسے سیڑھیوں سے گھسیٹتا ہوا پارکنگ لاٹ تک لایا۔ پارکنگ لاٹ میں لانے کے بعد وہ اسے اب اس کی گردن سے دبوچ کر گھسیٹتا ہوا لے کر جا رہا تھا۔

”میرا ارادہ تھا تمہیں بے درد موت دینے کا مگر تم نے خود ہی دردناک موت کو دعوت دی ہے۔ تم کیوں وہ کام کرتی ہو جس سے تمہیں منع کیا جاتا ہے۔“ شیزل کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ حتی المقدور خود کو چھڑوانے کی سعی کر رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو پر تھپڑ مار رہی تھی۔ نوچ رہی تھی۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ناخن نہیں بڑھاتی تھی کیونکہ اس کی منطق کے مطابق جانوروں کے ناخن بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ آج اس انسان کو اس حد تک زک نہیں پہنچا پا رہی تھی جس حد تک اسے پہنچانی چاہیے تھی۔ سانس رکنے کی وجہ سے اس کی مزاحمت کم ہو رہی تھی۔ وہ اسے زمین پر رگڑتے ہوئے کھینچتے ہوئے ایک ستون کے پیچھے لے کر آیا۔ لانے کے بعد اسے کھڑا کر کے وہ اس کے پیٹ کے گرد سیاہ نائلون کی رسی کو لپیٹنے لگا۔

”وقت یاد رکھے گا تمہاری موت کو دیکھنا تم۔“ اس کا پیٹ باندھنے کے بعد اس نے اس کے منہ پر سیاہ ڈکٹ ٹیپ لگا دی تھی لگانے کے بعد وہ اس کی نیم وا آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اپنی ان ادھ کھلی آنکھوں سے موت کو دیکھنا تم، لطف آئے گا تم۔“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی تھی۔ کیونکہ ایک کے بعد دو، دو کے بعد تین اور تین کے بعد چار جھٹکے لگے تھے اسے، اتنی اچانک کہ وہ سنبھل بھی نہیں پایا۔ پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنے دل سے تھوڑا نیچے ہاتھ رکھ کر آنکھوں کے سامنے کیا تھا۔ وہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ زمین پر گرا تھا۔ شیزل کے بے جان ہوتے ہاتھ سے پستل بھی چھوٹ گئی۔

”تم، تم اتنی آسانی سے نہیں بچ سکتیں، میں، میں نہیں مر سکتا، مجھے شیطانی طاقتیں میسر ہیں۔ میرا ہدف کبھی نہیں بچتا، ناممکن۔“ اس کا بدبودار خون اطراف میں پھیل رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے اس نے خود کو زمین پر گرا رہے دیا اس کے بعد وہ پتہ نہیں کیسے اور کس طرح سے کھڑا ہوا تھا۔ شیزل نے ڈھلکے ہوئے سر کے ساتھ دھندلے دھندلے سے منظر میں اسے لڑکھڑاتے ہوئے، کھانتے ہوئے جیپ کی سمت بڑھتے دیکھا تھا۔

”احد کو اپنی بہن سے بے پناہ محبت تھی۔ اسے مروانے کے بعد وہ پچھتاوے کی نذر ہو گیا تھا۔ اس دوران وہ کافی دماغی طور پر ڈسٹرب رہا تھا۔ وہ کافی حد تک سائیکو ہو گیا تھا۔ اس کا ایک دوست تھا عارف، اس نے اس کا علاج کیا تھا۔ وہ اس کی بہن کو بھی چاہتا تھا جو اپنی پسند سے شادی کرنے کے بعد تباہ ہو چکی تھی۔ ایک رات احد نے نشے کی حالت میں اسے اپنے بارے میں سب بتا دیا تھا۔ صبح جب عارف اس کے راز کو ڈسکلوز کرنے جا رہا تھا۔ اس سے نفرت کا اظہار کر رہا تھا تب احد نے اسے بھی مار دیا تھا۔ وہ مغرب میں اس کا اکلوتا اور مخلص

دوست تھا جسے اس کے گھر کے واش روم میں ہی دفن دیا گیا تھا جو کہ انڈر کنٹرول رکنشن تھا۔“

اپنی جیب میں بیٹھنے کے بعد وہ اسے اشارت کر رہا تھا۔ اس کے لبوں سے سیٹی کی ٹوٹی ٹوٹی سی دھن پھوٹ رہی تھی۔ شیزل کو جیب کی ریس سنائی دی۔

”یعنی تھرڈ فلور پر وہ اپنی خیالی بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ انسان جس کا کوئی وجود نہیں۔“

”صرف بہن ہی نہیں میم، اس کا دوست بھی خیالی ہی ہے۔ تھرڈ فلور کے اس گھر میں مکڑیوں کے جالوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور وہ دوسرا کمرہ جس کو کنٹرول روم کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے وہ بھی کباڑ خانہ ہے۔ اس فائل میں ریکارڈنگز موجود ہیں۔ وہ انجانے وجود کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور کافی حد تک مذہبی باتیں کرتا ہے۔ خیانت و منافقت کرتا ہے کیونکہ اس کی بہن اپنے دین سے نہیں پھری تھی اس لیے وہ اس کی بعد میں امنڈ آنے والی محبت میں اور اپنے پچھتاوے کے سبب اس سے مذہبی باتیں کر جاتا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو اپنی ماں کو بھی مار دیا۔ وہ کسی کو بھی مار سکتا ہے کیونکہ وہ بہت ظالم ہے۔“

”لیکن میں نے تو سفید کوٹ ہاتھ پر ڈالے کسی انسان کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید وہ سعد ہو۔“ ٹائروں کی آواز قریب آرہی تھی، بے حد قریب۔

”مجھے لگتا ہے آپ کو گمانوں میں ڈالنا اور شاید بھٹکانا اس نے سوچ رکھا ہو۔“

جیب بہت زور سے اس کے پیٹ پر آ کر لگی تھی اتنی زور سے کہ اسے لگا اس کی آنتیں اندر سے پھٹ گئی ہیں۔ اس کے منہ سے خون ابلنا تھا مگر ٹیپ کی وجہ سے وہ ناک اور کان میں سے برق رفتاری سے بہنے لگا۔ اسے لگا اس کی روح نکلنے والی ہے۔ آخری سانس جو تھا اکھڑنے والا ہے۔ اسے قیس یاد آیا تھا۔ شدت سے آیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب قیس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ نیند سے جاگا تھا۔

”ریسٹ ان پیس۔“ مردانی آنکھوں میں سرخی دوڑنے کے ساتھ ہی پانی بھی بھرا تھا۔ اس کے لب مدھم آواز میں ہلے کیونکہ وہ بھی گولیاں لگنے کی وجہ سے غنودگی میں جا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر جیپ کو ریورس کر رہا تھا۔ اس بار اس نے اسپید بڑھائی پورے پارکنگ لاٹ میں اس کے ٹائروں کی آواز گونج گئی تھی۔ اس نے ریس پر رکھا پاؤں مزید دبایا اور جیپ کو اس بندھے ہوئے وجود کی طرف جانے دیا جو ادھ موا ہو چکا تھا۔ اسٹیرنگ کو چھوڑ کر وہ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ کان اور ناک سے خون جاری تھی۔ جیپ تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہ آخری وار تھا جس کو سہتے ہی اس لڑکی کی روح پرواز کر جاتی، وہ دو سیکنڈ کے اندر مرجاتی، نا جانے کیا ہوا تھا کہ اچانک تیز اسپید کی وجہ سے جیپ بل کھاتی ہوئی دوسری جانب گر گئی۔ اس میں سے پٹرول نکلا اور ایک زوردار دھماکا ہوا اتنا تیز کہ پوری بلڈنگ کی بتیاں جل اٹھیں۔ دوڑتے قدموں کی آواز ہر سو پھیل چکی تھی۔ ☆

☆.....☆.....☆

سلیپر ز پہن کر وہ دروازے کی سمت بڑھا۔ کھولنے سے پہلے بھی بیل ہوئی تھی۔ اس نے جونہی دروازہ وا کیا تو نہی چند پولیس افسران پر اس کی نگاہ گئی تھی۔ وہ سول والے تھے قیس انہیں جانتا تھا۔

”سر ہمارے پاس آپ کے اریسٹ وارنٹ ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔“ قیس نے خاموش نظر ان سات آٹھ لوگوں پر ڈالی پھر توقف کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں فریش ہو جاؤں پھر آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں تب تک آپ لوگ اندر آجائیں۔“ اسے جہانگیر نے بتا دیا تھا کہ وہ آج یا کل میں گرفتار ہو جائے گا۔ یہ اس کیلئے معمولی بات تھی۔ وہ جانتا تھا وہ ایک رات میں ہی بری ہو جائے گا کیوں؟ کیونکہ وہ بے قصور

تھا اور دوسرا پاؤں باپ کا بیٹا تھا۔

”بہت شکریہ سر، ہم یہیں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ فریش ہو کر اس نے بیڈ کے قریب رکھے اسٹینڈ پر سے جیکٹ اتار کر پہنی پھر جھک کر اس نے سیل فون اٹھا لیا۔ اس کا سائیڈ بٹن غیر ارادی طور پر اس سے دب گیا تھا۔ وہ نوٹیفکیشنز کو اگنور کر دیتا اگر اس میں شیزل کا نام نہ ہوتا۔

”شیزل نے دو ای میلز کیوں کیں وہ بھی اس وقت۔“ فون تین بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ اس نے ای میل کھولی۔ ایک ویڈیو میں شیزل کے خون آلود چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی تھیں۔ اس نے یکدم دل میں پھلتے ٹھنڈے ڈر کے ساتھ اس ای میل کو آن کیا تھا۔ وہ سن رہا تھا۔ سننے کے ساتھ ساتھ اپنے حواس کھو رہا تھا۔

”میں تمہیں اس وقت جس حال میں میل کر رہی ہوں یہ میرا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ آج سے ہفتہ قبل مجھے نشاء نے پارسل لا کر دیے تھے کہ یہ جاسمین میم نے دیے ہیں۔ وہ پارسل میں نے آرڈر نہیں کیے تھے۔ جاسمین میم کو جس کمپنی نے یہ پہنچائے ان کا بار کوڈ بھی فیک ہے۔ میں نے جب انہیں کھولا تو ایک میں، میرے خون آلود کپڑے تھے اور دوسرے میں تمہارے، میں جان گئی کہ اب میری زندگی خطرے میں ہے مگر فکر نہیں کرو۔ میں تم تک خطرے کا سا یہ بھی پڑنے نہیں دوں گی۔ میں۔“ اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ قیس کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچا۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ کرتی ہوں۔“ وہ اچانک بری طرح ڈری تھی۔ اس کے کمرے کے دروازے کو توڑا جا رہا تھا۔ قیس وہ آواز بخوبی سن سکتا تھا۔

”اس لیے میں آج سب ختم کر رہی ہوں۔ تم بے قصور ہو۔ تمام فائلز میں نے تمہیں اور

نشاء کو میل کر دی ہیں۔ اپنا اپنی بیٹی کا اور جہانگیر بابا کا خیال رکھنا۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ تمہیں قصور وار ٹھہرایا حالانکہ اس سب کے پیچھے احد تھا۔ مجھے اس پر اسی دن شک ہو گیا تھا جس دن وہ تم سے الجھا تھا اور تم نے مجھے دھکا دیا تھا۔ اس نے جب مجھے تھاما تھا میں تب ہی جان گئی تھی کہ مجرم احد ہے۔ کیونکہ میں اس کے لمس کو پہچان گئی تھی۔ اس کے پکڑنے کا انداز، ہاتھوں کا سرد پن اور گرفت ویسی ہی تھی جیسے پارکنگ میں اس نے مجھے پکڑا تھا۔ بس تبھی میں نے تمہارا دل توڑ کر اس کا ساتھ دیا تھا تا کہ میں اس کا یقین مزید جیت سکوں اور اس پر نظر رکھ سکوں۔ تم۔۔۔ مجھے اس کیلئے معاف کر دینا اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا میرے دل میں پہلا مقام صرف تمہارا ہے۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر وقت نہیں ہے۔ شاید مزید زندگی بھی نہیں ہے۔ اس لئے اللہ حافظ۔“ اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی یہ سب کیا ہے۔ وہ ہاتھ میں سیل فون تھا مے بیڈ پر گر سا گیا۔ ای میل دس منٹ پہلے آئی تھی۔ یعنی وہ زندہ تھی۔ مری نہیں تھی۔ اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ سائیں سائیں کانوں اور پھٹتے دماغ کے ساتھ وہ یکدم کھڑا ہوا اور دیوانہ وار باہر کی سمت لپکا۔

”سر آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے، سر آپ کہاں جا رہے ہیں۔“ پولیس اہلکار اسے روکنے کے جتن کر رہے تھے۔ وہ حلق کے بل ان کے سامنے دھاڑا۔

”میری زندگی جا رہی ہے اور تمہیں گرفتاری کی پڑی ہے۔ میں جہانگیر خان الہی کا بیٹا ہوں ہمت ہے تو ہاتھ لگاؤ۔“ کالا، اندھا، بکاؤ قانون تھا۔ ایک دھمکی پر قدم روک گیا۔ قیس انہیں آنکھیں دکھانے کے بعد اپنی کار میں آکر بیٹھا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے باعث اس سے چابی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے بار بار کوشش کی مگر نہیں لگی۔ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ عجلت میں اس کار سے نکلا اور دوسری میں جا بیٹھا۔ بٹن دباتے ہی وہ چل پڑی تھی۔ اس کے فون پر مسلسل

کالز آر ہی تھیں۔ ریش ڈرائیونگ کر کے وہ شینزل کی بلڈنگ میں آیا تھا جہاں چند پولیس والے اور میڈیا والے مرے ہوئے گارڈ کی تصاویر اتار رہے تھے۔ قیس کا دل رواٹھا۔ اس نے کار وہیں چھوڑی۔ وہ سڑک پر اس بیچ کے قریب جہاں شینزل بیٹھا کرتی تھی خون دیکھ چکا تھا۔ اس کو سانس دشواری سے آنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنا خوف زدہ ہوا تھا۔ اس کا پورا وجود ٹھنڈا ہو گیا۔ جیسا خون بیچ پر تھا ویسا ہی خون لفٹ کے قریب بھی گرا ہوا تھا مگر زیادہ سیڑھیوں پر تھا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا خون سے بچتے ہوئے اوپر آیا۔ شینزل کے مین گیٹ کے قریب بھی پولیس کھڑی تھی۔ دروازہ ٹوٹا ہوا تھا گھر بکھرا ہوا تھا۔ جا بجا خون ہی خون تھا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہوا جیسے اس کے بدن سے خون نکال کر ہر طرف بکھیر دیا گیا ہو۔ اس میں اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ وہیں سے دروازے میں کھڑا دریافت کر رہا تھا۔

”شینزل؟“ اس نے حواس باختگی کے عالم میں سرگوشی کی تھی۔ اس کا مخاطب ایک پولیس اہلکار تھا جو نیچے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میم پارکنگ میں ہیں مگر آپ اس وقت وہاں نہیں جاسکتے، سر، کیے سر۔“ وہ الٹے پیر دوڑتا ہوا پارکنگ میں آیا تھا۔ بہت دور، لوگوں کے ہجوم کو چیر کر وہ پبلی پٹی کے نزدیک آیا۔ نشاء، کمال اور سعد اسے دیکھ چکے تھے۔ ڈپٹی کمیشنر بھی وہاں موجود تھے۔ قیس نے پبلی پٹی پر ہاتھ رکھا۔

”سر آپ اندر نہیں جاسکتے۔“ وہ اس کی بات کو ان سنی کرتا ہوا ستون سے لٹکی لڑکی کو زومی کی طرح تکے جا رہا تھا۔ اس نے جونہی پبلی پٹی اوپر کوئی اس کے ہاتھ کو روک دیا گیا۔

”سر، آپ کا وہاں جانا منع ہے۔“ قیس حلق کے بل چیخا تھا۔

”وہ میری بہن ہے۔“ نشاء، کمال اور سعد اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کی آواز سن کر کھم گئے۔ تینوں کو جھٹکا لگا تھا جو کہ بہت زوردار تھا۔

”اور وہ زندہ ہے۔ تم لوگوں کا باپ بھی مجھے اندر جانے سے نہیں روک سکتا، ہٹاؤ اسے۔“
 اس نے پہلی و سیاہ پٹی کو کراہیت کے ساتھ توڑ کر ایک سائیڈ پر پھینکا اور چھوٹے چھوٹے قدم چلتا اس کے قریب آگیا۔

”میں نے تمہیں ہر مشکل میں پکارا مگر تم نہیں آئے یہاں تک کہ تم نے مجھ سے میری اولاد بھی چھین لی۔ اس لیے مجھے اب تم سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ یہ عدالت نامہ ہے جس میں درج ہے کہ اب سے میں تمہاری بہن اور جہانگیر الہی کی بیٹی نہیں رہوں گی۔ اس لیے بہتر ہوگا تم اس پر دستخط کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری زندگی سے دور چلے جاؤ۔“

وہ اس کے قریب آیا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹائی تھی جو نہی ٹیپ ہٹی خون کا فوارہ قیس کے اوپر گرا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا بالکل ویسے جیسے بچے روتے ہیں۔

”میرا شناختی کارڈ بننا ہے۔ میں اٹھارہ سال کی ہو گئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں میری ولدیت میں تمہارا نام لکھا جائے۔“

اس نے نائلون کی رسی اپنے ہاتھ زخمی کر کے کاٹی۔ کوئی اسے نہیں روک رہا تھا۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا۔ پہلے جو قدغن تھی وہ بھی اس کی جذباتیت کی وجہ سے ہی تھی۔ ورنہ کون تھا جو اسے منع کر سکے۔ رسی کٹنے کے بعد شیزل ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح اس کی گود میں گری تھی۔

”میرا فیصلہ غلط تھا۔ تمہارا نام میرے نام سے جڑا ہے۔ کوئی بھی ولدیت کے خانے پر غور نہیں کرتا سب کو فقط اتنا پتہ ہے کہ میں شیزل قیس الہی ہوں۔ میں لوگوں کی غلط سوچ سے عاجز آگئی ہوں جلد ہی میں تمہارے اور اپنے رشتے کو سب پر واضح کر دوں گی اور بہتر ہوگا تم بھی اس چیز میں محتاط رہو۔“

اس کی کٹی ہوئی گردن، اس کا زخمی وجود قیس کا دل چھلنی کر رہا تھا۔ دونوں بازو اس کی کمر کے گرد باندھ کر وہ اس کے بالوں میں منہ چھپا کر دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔

”تم نے اس انسان کا قتل کر دیا جس نے مجھ پر بہت ظلم کیے، کاش تم مجھ پر ظلم ہونے سے پہلے ہی مجھے بچا لیتے تو ایسا نہ ہوتا۔“

حیدر اس کے پاس آئے تھے۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

”جاسمین نے اسے پالا تھا۔ بڑا کیا تھا۔ اس نے صبر کر لیا۔ تم بھی کر لو بچے۔“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے خود کو اس میں چھپا رہا تھا۔ بری طرح دھاڑ رہا تھا۔

”میں نے تمہیں سیکرٹ سوسائٹی کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ مجھے لگا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ رہی ہوں تو ماری جاؤں گی لیکن خوش قسمتی سے میں بچ گئی اور جب خود مرنے کا سوچا تو اللہ نے ایک اور زندگی کی نوید سنا کر مجھے حرام کام سے روک دیا۔ اب بس یہ خوف ہے کہ کہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں کیونکہ اب تم میرے راز میں شامل ہو چکے ہو اور وہ اپنے عیاں رازوں کو جان لیتے ہیں۔ کاش کبھی کوئی مشکل آئے تو مجھ پر آئے تمہیں کچھ نہ ہو۔“

وہ تاہنوز اسے مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا۔ وہ تاہنوز کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر بلکے جا رہا تھا۔

”قیس، ایسبولینس آگئی ہے۔“

وہ دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا جب اچانک سے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ ایسے جیسے کسی نے شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔ درد اتنی شدت سے اٹھا کہ وہ اپنی بہن کے بالوں میں منہ چھپائے ہی ڈھلک گیا۔ حیدر نے دھڑکتے دل کے ساتھ چیخ کے سے انداز میں اس کا نام پکارا تھا۔



تین سال بعد!

کھلے آسمان تلے وہ اپنی بیٹی کو تیر چلانا سکھا رہا تھا۔ اس کی بیٹی ابھی ابھی چار سال کی ہوئی تھی۔ وہ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو صحیح پوزیشن میں رکھ کر تیر کو چھوڑ رہا تھا۔ اور وہ اس ٹوائے کے ساتھ کھیلتے ہوئے تالیاں بجائے جا رہی تھی جب ہما چائے کا مگ لے کر اس کی طرف آئی۔ اس نے ابھی دوسرا تیر نکالا ہی تھا۔ کہ اس نے قیس کو پکار لیا۔

”بس کر دو۔ آج کی پریکٹس بہت ہو چکی، اب تم تھوڑا آرام کر لو، ڈاکٹرز نے یوں بھی تمہیں زیادہ تھکنے سے منع کیا ہے۔“ آدھے سے زیادہ سفید بالوں والا انسان مسکرایا تھا۔ مسکرانے کے سبب اس کی آنکھوں کے نیچے جھریاں بہت زیادہ پڑ گئی تھیں۔ ہونٹوں کے کناروں کے قریب بھی تو عمر کی امم، ہم غم کی لائین کافی زیادہ بڑھ گئی تھیں۔

”فکر نہیں کرو ابھی بائی پاس نہیں ہوا میرا۔“ اس کے ہاتھ سے کپ تھام کر وہ مسکراتے ہوئے اسے ٹال رہا تھا۔ ہما یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

”ایسی باتیں نہیں کیا کرو قیس، تم ہمارا سائبان ہو، ہماری نین کے باپ۔“ اس نے ایک نگاہ اپنی بیٹی پر ڈالی جو ہو بہو اپنی خالہ کی کاپی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چہل قدمی کے سے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ ہما نے بھی اس کے قدم سے قدم ملائے تھے۔

”سائبان تو میں کسی اور کا بھی تھا۔ حفاظت ہی نہ کر سکا۔“ اس کی آنکھوں میں پانی چمک اٹھا تھا۔ گزرے مہ و سالوں میں اس کا دل کسی ننھے پرندے کی مانند چھوٹا ہو گیا تھا جو بات بات پر بھرتا تھا لیکن پھر بھی اپنے دکھ کو عیاں ہونے نہیں دیتا تھا۔ اسے اپنے جذبات پر کمال حاصل تھا مگر ہما اس کی شریک حیات تھی۔ وہ اس کے سامنے خود کو روک نہیں پاتا تھا۔

”خود کو بلیم مت کیا کرو، تم ایک بہترین مثال ہو۔“ چلتے چلتے وہ دونوں فاؤنٹین کے قریب آ گئے تھے۔ قیس نے خود کو اور ہما کو پانی کے عکس میں دیکھا۔ اس کے لبوں پر مجروح مسکان دوڑ گئی۔

”بوڑھا لگنے لگا ہوں میں اور تم ابھی تک ویسی کی ویسی ہو، تمہیں اپنے سرکل میں شرمندگی ہوتی ہوگی۔ ہے نا۔“ ہمانے اسے دلبرداشتہ انداز میں ٹوک دیا۔

”قیس۔“ اسے برا لگا تھا واقعی برا لگا تھا۔“ کس طرح کی عجیب باتیں کرتے ہو تم، تم نے میرے بارے میں ایسا سوچا بھی کیسے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا ہے۔ پسند سے شادی کی ہے اور ایسا نہ بھی ہوتا تو تب بھی مجھے تم پر ناز ہوتا کیونکہ تم ایک اچھے شوہر، ایک اچھے باپ، ایک اچھے بھائی اور بیٹے ہو۔“ اس نے اپنی چائے کے کپ کو فوارے کے قریب کچھی میز پر رکھ دیا۔

”مجھے کہنے دو، تمہیں دل رکھنا آتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔“ اس کے لبوں پر مسکان تھی مگر آنکھوں میں ویرانی، اس ویرانی کا ڈیرہ تو بہت سالوں سے اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہ اس کا گھر تھا۔ اس کی جائے پناہ، جو کبھی بھی آسانی سے نہیں چھوٹی۔

”تم قنوطیت کا شکار ہو اور بس۔“ اس نے اپنی ناک پر غصہ سجایا تھا۔ قیس نے مسکراتے ہوئے سر کو جھکا لیا۔

”تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔“ اس کے فون پر میسج آیا تھا جسے پڑھ کر اس نے واپس اسے ٹراؤزر کی پاکٹ میں ڈالا پھر ایک بھر پور نظر سے ہما کو دیکھ کر وہ ایکسکیوز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”ان کی سانسیں تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ آپ کو صبر کرنا ہوگا۔“

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گھاس کے قطعہ کو عبور کر گیا۔ ہما اسے گردن جھکائے چلتا

دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی سوچوں کا گردباد اس کے گرد اکھٹا ہو چکا ہے۔ مگر کوئی نہیں وہ اسے سنبھال لے گی جس طرح گزرے سالوں سے سنبھالتی آرہی ہے۔

”بابا کچھ کریں، بابا اسے بچالیں پلیز، میں، میں مر جاؤں گا اس کے بغیر۔“

گرے پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے وہ رکا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہا میز پر دائیاں ہاتھ جمائے اسی پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ دوسفید کپ میز پر بھاپ اڑاتے ہوئے پڑے تھے۔ قیس کے دیکھنے پر وہ مسکرا دی۔

”تمہیں اس ٹراما سے نکلنا ہوگا قیس، اب تو تین سال ہو گئے ہیں اس حادثے کو۔ وہ جل کر خاک ہو گیا، ختم ہو گیا۔ تم بھی سب ختم کر دو۔“

اس نے بھی اسے مسکراہٹ پاس کی تھی۔ اس کی بیٹی تاہنوز تیر اندازی میں مصروف تھی۔ قیس نے طویل سانس لیا اور اپنے بھورے بوٹوں کو پتھروں پر جماتا آگے کو چلنے لگا۔

”انسان کی زندگی میں نہ چاہتے ہوئے بھی کاش رہ جاتا ہے۔ کسی بھی صورت میں، کسی بھی شکل میں۔ یہ بھلے ہی ممنوع ہو مگر پھر بھی ہر ایک روح میں رچا بسا ہے۔ میں اب تک سوچتا ہوں کہ کاش میں اس رات نہ سویا ہوتا کہ کاش میں ان کے میسجز کو الارم سمجھتا۔ انہیں اپنے پاس بلا لیتا یا خود ان کے پاس چلا جاتا۔ کم از کم میں اتنی جلدی وہاں پہنچتا کہ اپنی شینزل کو اس درندے سے بچا پاتا نہیں تو اس انسان کے بری طرح جلنے سے پہلے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔“

پورچ عبور کر کے اس نے دوا سٹپس چڑھے۔ گارڈ نے اس کیلئے مین ڈور کو وا کر دیا۔

”میں چاہتا ہوں تم سیاست میں آ جاؤ کب تک تم بزنس کرتے رہو گے۔“

اس نے لاؤنج میں قدم رکھا جہاں بھرپور سناٹا تھا بالکل ویسے جیسے اس کے دل میں تھا۔

”میرادل اس قابل نہیں رہا ہے بابا، بلکہ میرادل تو کسی بھی قابل نہیں رہا۔“

اس نے سبز صوفوں کو پیچھے چھوڑا۔ لاؤنج کے وسط میں اترتی دائیں جانب کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے سے پہلے اس کی ریلنگ کو تھام لیا۔

”تمہیں خود کو مضبوط کرنا چاہیے۔ تمہاری بیٹی بھی ہے تم کب تک یوں خود سے خفا رہو گے۔“

اس نے زور دے کر خود کو پہلے اسٹیپ پر چڑھایا تھا۔

”مجھ سے جتنا ہو سکتا ہے کر رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کی مجھ میں سکت نہیں۔“

سیڑھیوں کے اختتام پر دو کمرے تھے۔ اس نے پہلا کمرہ چھوڑ کر خود کو دوسرے کے سامنے کھڑا کیا۔

”اللہ انسان کو اس کے صبر کا اجر ضرور دیتا ہے۔ تم سنجیدہ ہو گئے ہو اچھی بات ہے مگر اتنے سنجیدہ بھی مت ہو کہ تم پر سے مایوسی ٹپکنے لگے۔“

کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر آیا جہاں ایک نرس نے اس کا استقبال مسکراہٹ کے ساتھ کیا تھا۔

”پیشدہ کی انگلیوں میں حرکت ہوئی ہے۔ یہ دیکھیں چھوٹی انگلی ہل رہی ہے۔“ مشینوں اور نالیوں میں جکڑی ہوئی وہ بیڈ پر چت لیٹی تھی۔ یہ ایک گھر کا کمرہ تھا مگر اب اس کی ظاہری حالت ایسی تھی جیسے وہ کسی ہسپتال کا روم ہو۔ قیس نے شادی مرگ کی حالت میں اس چھوٹی انگلی کو ہلتے دیکھا۔ اس کے دل نے بہت زوردار انداز میں ایک بیٹ مس کی تھی۔

”یہ، یہ ٹھیک ہو رہی ہیں یعنی۔“ نرس چپ نہیں رہی، توقف کے بعد مسکراہٹ گھلی آواز میں بولی۔

”بالکل، یہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔ مگر فی الحال دماغ کے خلیے کمزور ہونے کی

وجہ سے کام کرنے سے قاصر ہیں تو شاید اس لیے کچھ عرصے کیلئے وہ نارمل نہ رہیں مگر جلد ہی یہ مکمل صحت یاب ہوں گی۔ معجزہ ہوا ہے ان کے ساتھ۔“ نئی رپورٹس ہاتھ میں تھیں۔ گزشتہ تین برس سے وہ مایوسی کی خبریں سن رہا تھا۔ مگر آج، آج اسے دنیا میں ہی خوش خبری سنا دی گئی تھی۔ اس کا دل بری طرح سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آن ٹھہرے تھے۔ کپکپاہٹ کے سبب اس سے کھڑا نہیں رہا گیا تو وہ بیٹھ گیا۔ رپورٹ ہاتھ میں تھی اور سوال زبان پر۔

”مجھے سن اور دیکھ بھی سکیں گی نا۔“ کتنی آس تھی اس کے سوال میں، کتنی عجلت و بے صبری تھی۔ کتنے اندیشے اور ابہام تھے۔ جیسے اگر ’ہاں‘ سنے گا تو جی اٹھے گا اور ’ناں‘ سنے گا تو۔۔۔

”ہاں بالکل۔“ اور وہ جی اٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں یکلخت کم ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ یہ نئی رپورٹس اس کیلئے زندگی کی نوید لائی تھیں۔ زرس اسے یوں رو ہا نہادیکھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ قیس نے آنکھیں بند کیے لیٹی اس لڑکی کو دیکھا۔ جو آنکھوں میں موجود نمی کے باعث اسے جھلمل کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”یہ لوگ کہتے تھے۔“ اس نے روز کی طرح بولنا شروع کیا۔“ آپ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ مجھے اور بابا کو چھوڑ جائیں گی مگر میں پر امید تھا۔ میرا ایمان پختہ تھا۔ میں شروع سے جانتا تھا آپ جاگیں گی اور نارمل رہیں گی۔ آپ، آپ کو تکلیف نہیں ہو رہی ہوگی، کیا ہو رہی ہے؟“ لرزتے ہوئے سوال کا جواب نہیں آیا تھا۔ اس نے نچلے لب کو سختی سے دانتوں میں بھینچ کر اپنی تھوڑی کی کپکپاہٹ پر قابو پایا۔ وہ خوشی کی جس اسٹیج پر تھا۔ وہ بیان نہیں ہو رہی تھی۔ اسے اچانک ہی آج خود میں زندگی دوڑتی ہوئی نظر آئی تھی۔ وہ پھر سے جی اٹھا تھا۔

”آپ میرے لیے ہمیشہ میرے وجود کا حصہ رہی ہیں ایسے جیسے میرے لیے میری بیٹی

ہے۔ میں کیسے آپ کو تنہا چھوڑتا۔ کیسے دستبردار رہتا۔ میں نہیں کر سکتا تھا یہ، پہلے جو بھی کیا تھا ناراضگی میں کیا تھا۔ اس میں بھی میں نے خود کو تباہ کیا تھا مگر اب نہیں، اب میں جانتا ہوں ایک دن آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ میری بیٹی کے ساتھ کھیلیں گی۔ پھر میں آپ کی بہت اچھی جگہ شادی کر دوں گا۔ آپ کا مستقبل بہت برائیٹ ہوگا۔ آپ بہت خوش رہیں گی۔ بہت زیادہ خوش۔“

اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ بیڈ پر سے اٹھا۔ اپنے ٹراؤزر کی پاکٹ سے اس نے ایک انویلیپ نکال کر سائیڈ ڈرائر کھولی۔ اس دراز میں پہلے ہی بے تحاشہ سفید لفافے پڑے ہوئے تھے۔ ان ڈھیر سارے لفافوں پر اس نے وہ لفافہ بھی رکھ دیا۔

”آپ ٹھیک ہوں گی اور ان سب کو پڑھیں گی۔ اور میرا بہت مذاق بنائیں گی۔ مجھے پوری امید ہے۔ اپنے اللہ پر توکل ہے۔“

وہ آیات وغیرہ پڑھ کر اس پر پھونکنے کے بعد رپورٹس اٹھا کر وہاں سے جوش میں جا رہا تھا۔ وہ ہما اور بابا کو اس خوشخبری کے بارے میں بتانے کیلئے بہت ایکسائیٹڈ تھا۔ اس کے عقب میں دروازے کے اس پار، کمرے میں موجود ایک دراز میں ڈھیر سارے محبت کی چاشنی سے پر خطوط رکھے ہوئے تھے۔ اس دراز میں موجود لفافوں پر ایک ہی تحریر درج تھی جو کہ یہ تھی۔

”خط عشق شینزل قیس الہی کے نام۔“

..... ختم شد ❁